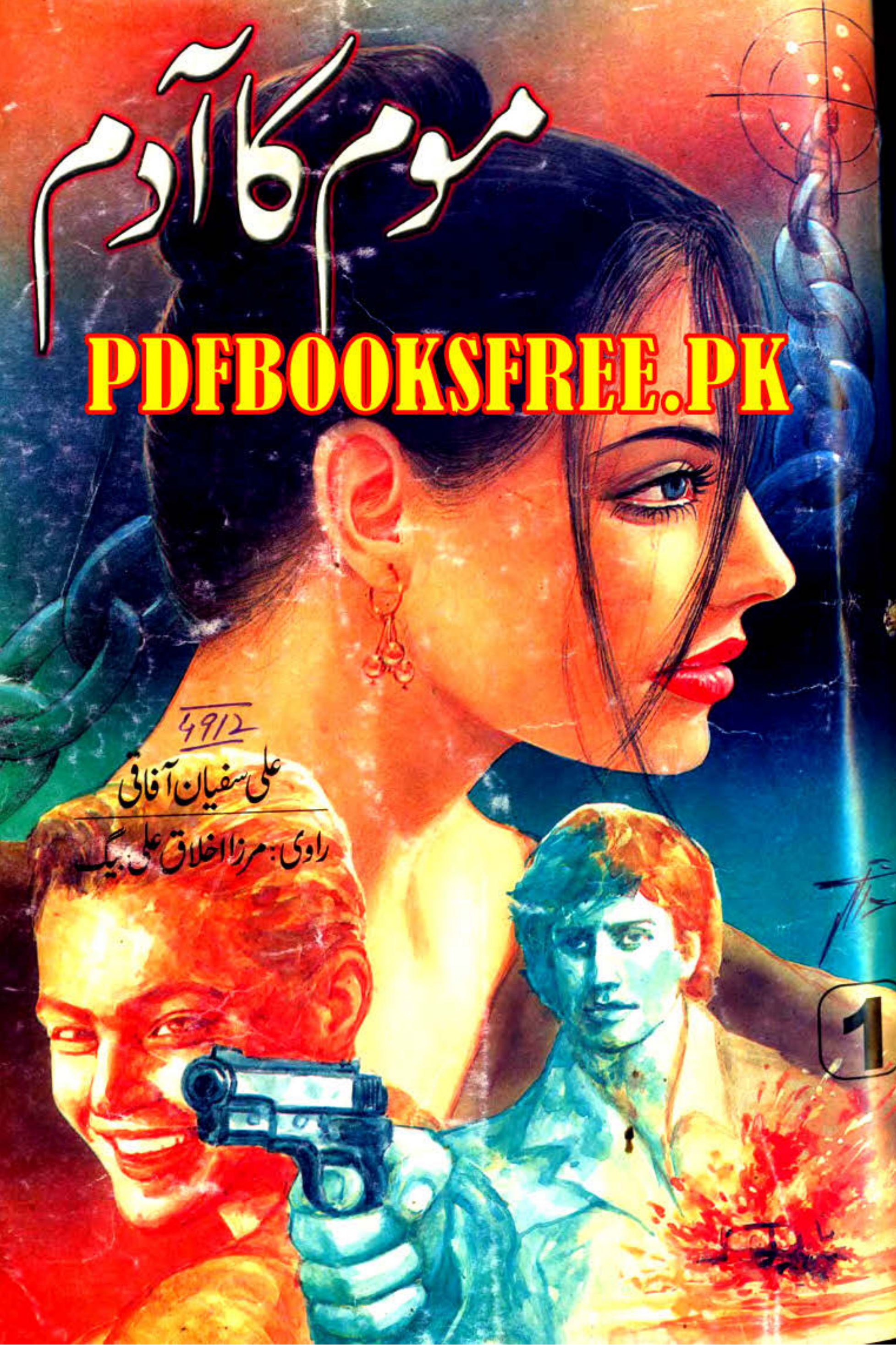
موم کا آدم
PDFBOOKSFREE.PK
4912
علی سفیان آفاقی
راوی: مرزا اخلاق علی بیگ
1

موم کا آدم

ایک سر بکف منچلے جیالے انسان کی کہانی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا ہنر جانتا تھا۔ وہ ایک خوش جمال حسینہ کے خیال کا اسیر تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے آگ اور خون کے دریا میں کودپڑنے کو بے تاب تھا۔

ایک نڈر جہاں گرد ابنِ آدم کی آشفتہ سری کی داستان

اُس رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک پُر فضا باغ ہے جس میں رنگا رنگ پھُول کِھلے ہیں۔ ہر طرف خوشبُو کی مہک ہے۔ پھُولوں کی نرم و نازک شبنم سے بھیگی ہوئی پتیوں پر رنگین تتلیاں پَر پھیلائے منڈلا رہی ہیں۔ درختوں پر پرندوں کی چہکار کا شور ہے۔ ہر طرف ایک رنگ و بُو کا عالم ہے۔ مَیں ایک پھُولوں سے لدے ہُوئے درخت کی چھاؤں میں سبز گھاس پر لیٹا ہُوا منظر کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہُوں۔ سرمستی آسُودگی اور خوشی کا ایک احساس میرے رگ و پے میں بسا ہُوا ہے۔ مَیں غنودگی کے عالم میں ہُوں۔ کچھ سو رہا ہُوں۔ کچھ جاگ رہا ہُوں۔ فکرِ فردا ہے نہ غمِ امروز، عجیب آسودگی اور اطمینان کا احساس طاری ہے۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر بند ہونے لگتی ہیں۔ شاید مَیں سو گیا ہوں۔ میرا ذہن خوابوں کی وادی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ یکایک گرج کی ایک آواز مجھے چونکا دیتی ہے۔ مَیں گھبرا کر بیدار ہو جاتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ہر طرف گھُپ اندھیرا چھا گیا ہے نہ چمن ہے نہ پھُول۔ نہ پرندوں کی چہکار نہ کلیوں کی مہکار۔ رنگ و بُو کا سماں غائب ہو چکا ہے۔ چاروں طرف تاریکیوں نے دامن پھیلا رکھا ہے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے ہیں۔ گرج چمک کی خوفناک آوازوں کے سوا اور کوئی صدا نہیں ہے۔ یکایک بجلی کوندتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گلستان کی جھلک نظر آتی ہے اور پھر ایک دِل دہلا دینے والی آواز کے ساتھ بجلی گرتی ہے۔ آگ اور بربادی کے سوا اور کوئی منظر سامنے موجود نہیں رہتا۔ درخت آتش بازی کی صورت جلنے لگتے ہیں۔ شعلے دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے باتیں کرتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ آناً فاناً ہر شَے جل جاتی ہے۔ راکھ ہو جاتی ہے۔ مگر شعلوں کی تپش میں کمی نہیں ہوتی۔ شعلوں کی لپٹیں اب میری طرف بڑھ رہی ہیں۔ مَیں جان بچانے کے لیے اٹھ کر بھاگنا چاہتا ہوں۔ مگر ہاتھ پیر بے جان ہو چکے ہیں۔ ذہن میں ارادہ ضرور ہے لیکن جسم میں طاقت نہیں۔ مَیں سوچ سکتا ہوں مگر عمل کرنے کی قوت سے یکسر محروم ہو چکا ہوں۔ آگ کے شعلے مجھے جلانے کے لیے تیزی سے لپکتے ہُوئے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مَیں خوفزدہ ہو کر امداد کیلئے پُکارنا چاہتا ہُوں۔ مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ میرا مُنہ کھُلتا ہُوا محسوس ہوتا ہے مگر کوئی آواز نہیں ہے۔ خوف دہشت اور آگ کی تپش کی

www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے میں پسینے میں ڈوب چکا ہوں۔ شعلوں کی گرمی میرے جسم کو جھلسانے لگی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ کچھ دیر بعد میں اس آگ میں زندہ جل مروں گا اور کسی کو میرے بارے میں علم بھی نہ ہوگا۔ میرا جسم راکھ بن چکا ہوگا اور اس راکھ کو ہوا اُڑا کر نہ جانے کہاں لے جائے گی۔ پھر روزی کا کیا ہوگا؟!

روزی ـــــ!! مجھے چاہنے والی، مجھ پر جان نچھاور کرنے والی بیوی۔ جو میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ جس کی خوشیوں آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز صرف میری ذات ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد ہی میری پرستش کرنا ہے۔ میں اس کا شوہر بھی ہوں اور محبوب بھی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمہ وقت پروانہ وار مجھ پر نثار ہونے کے لیے تیار رہی ہے، وہ تمام زندگی تو کیا، چند لمحے بھی میرے بغیر گزارنے کا تصور نہیں کر سکتی۔ وہ میرے بغیر کیوں کر جئے گی؟ کیسے اس عظیم صدمے کو برداشت کرے گی؟ خدایا۔ کیا روزی کی خاطر بھی تُو اپنے ایک گناہ گار، خطاکار بندے کو نہیں بچا سکتا؟ تُو قادرِ مطلق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے لیے تو نے آگ کے شعلوں کو گل گلزار بنا دیا تھا۔ مانا کہ میں ایک حقیر اور گنا ہوں میں غلطاں انسان ہوں، کہاں ابراہیمؑ اور کہاں مجھ ایسا خاکی و خاطی گناہ گار بندہ، لیکن تیری رحمت اور قوت تو وہی ہے۔ تُو چاہے تو مجھے روزی کی خاطر اس آفت سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ پھر میں نے چشمِ تصور میں روزی کو دیکھا۔ اس کا حسین و شاداب چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی زلفیں پریشان تھیں اس کا لباس میلا اور مسلا ہوا تھا۔ وہ جو اپنی نفاست اور خوش لباسی کے لیے مشہور ہے، مایوسی اور گندگی کا ڈھیر بنی ہوئی فرش پر پڑی تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ مٹی اس کے بالوں کو اور اس کے لباس کو گندہ کر رہی ہے۔ اس کے چمکدار ریشمی بال گرد و غبار میں اَٹے ہوئے ہیں مگر وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور بے پروا ہے۔ وہ سوگواری کا مرقع بنی ہوئی ہے۔ کیا وہ اس صدمے سے جاں بر بھی ہو سکے گی؟ میرے بعد کون ہے جو روزی کی خوشیوں کا خیال رکھے گا۔ اس کی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا؟ ایسا کون ہے؟! کون؟!

اور پھر اُسی لمحے میرے یادداشت کے سکرین پر شوکت کی تصویر اُبھری۔ شوکت، جو میرا بہترین دوست، مخلص، ہمدرد اور جاں فروش ہے۔ کاش دُنیا میں سبھی لوگوں کو شوکت جیسے دوست میسر آ سکیں۔ شوکت جیسے دوستوں کے ہوتے ہوئے کسی اور مددگار اور محافظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میری کون سی مشکل ہے جو شوکت نے آسان نہیں کی؟ کون سا مسئلہ ہے جو شوکت نے حل نہیں کیا۔ میں اُس کی وفاداری اور دیانت داری کی قسم کھا سکتا ہوں۔ فی زمانہ بے وفائی اور مکر و فریب کے اندھیروں میں وہ ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیا میں شوکت جیسے دوست سے بھی محروم ہو جاؤں گا؟ میرے بعد شوکت کا کیا حال ہوگا؛ وہ کیسے ایک بہترین دوست اور قابلِ اعتماد بزنس پارٹنر کی جُدائی کا صدمہ برداشت کرے گا؟ کیا وہ اس غم سے مر نہیں جائے گا؛ وہ جو ایک ہنس مکھ، لطیفہ باز اور ہر حال میں مست رہنے والا انسان ہے جو زندگی کی رگوں سے خوشیوں رعنائیوں اور راحتوں کی ایک ایک بُوند تک نچوڑ کر نوشِ جان کر لینا چاہتا ہے۔ میرے بغیر اُس کی زندگی بے معنی ہو کر نہیں رہ جائے گی؟ شوکت کا صحت مند، خوبصورت، تر و تازہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل میں زندہ رہنے کی خواہش مچلنے لگی۔ شوکت جیسے دوستوں کی خاطر مرنے کا بھی مزہ ہے اور زندہ رہنے کا بھی۔ یہ خیالات چشم زدن میں میرے ذہن میں لہرا گئے۔ مگر میرے پاس سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ آگ کے شعلوں نے، جن کی لپٹیں آسمان تک جا رہی تھیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اپنی موت مجھے آنکھوں کے سامنے صاف نظر آ رہی تھی۔ شعلے موت کا رقص کرتے ہوئے مجھے اپنے گھیرے میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ سب کچھ غائب ہو چکا تھا، لیکن روزی کا پریشان چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر میرے کان اُس کی آواز سننے سے قاصر تھے۔ وہ تشویش بھری نظروں سے دیوانہ وار مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔ مگر میں مدہوشی کی کیفیت میں تھا اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک طمانچہ میرے رخسار پر لگا۔ اب میں اپنے ہوش و حواس میں آ چکا تھا۔ میں روزی کا آنسو بھرا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا اور اس کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ وہ بار بار میرا نام پکار رہی

تھی۔ "یوسف۔ یوسف۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ یوسف۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" ساتھ ہی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اُس کے آنسو میرے چہرے پر گرے تو میری باقی حسوں نے بھی کام شروع کر دیا۔ میں کہنیوں کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"روزی!" میں نے اُسے کمزور آواز میں پکارا۔ "میں ٹھیک ہوں فکر نہ کرو۔"

میری آواز سُن کر وہ ساکت رہ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تکتی رہی اور پھر یک لخت مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روئی تو یوں روئی کہ اُسے چُپ کرانا مشکل ہو گیا۔ نہ اس کے آنسو تھمنے کا نام لیتے تھے نہ اُس کی آواز ـــــ مجھے تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں نے اُسے پیار سے تھپکا۔ محبت سے اُسے دلاسہ دیا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو پونچھے۔ بار بار اُسے یقین دلایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ صحت مند ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔

"تو پھر وہ سب کیا تھا؟" اُس نے سسکیوں کے درمیان سوال کیا۔ "پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے۔ آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"میں نے پھر ایک خواب دیکھا ہے۔ ڈراؤنا خواب۔"

"کیا دیکھا تھا خواب میں جو یوں ڈر گئے؟ آپ تو بہت جی دار اور مضبوط آدمی ہیں۔ میں نے آپ کو کبھی کسی سے ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ پھر خواب میں کیا دیکھ لیتے ہیں جو ڈر کر کانپنے لگتے ہیں۔ اور گھنٹوں بے چین رہتے ہیں۔"

"ارے خواب تو بس خواب ہی ہوتا ہے۔ اس میں بہادری کا کیا سوال ہے؟"

"پھر بھی۔ کیا دیکھتے ہیں خواب میں؟ یہ خواب ہے یا کوئی بیماری۔ آخر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟"

میں اس وقت بلاوجہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے موضوعِ سخن بدلنے کی خاطر کہا۔ "افوہ بھئی خواب بھی بتا دوں گا۔ میں نے کوئی بات چھپائی ہے کبھی تم سے؟" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر تم اپنی حالت تو درست کرو۔ ذرا آئینہ دیکھو۔ چہرہ بالکل سفید ہو رہا ہے۔ کاغذ کی طرح۔ آنکھوں میں وحشت ہے۔ منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔"

"کیسے سنبھالوں؟" وہ روندھی آواز میں بولی۔ "آپ کی عجیب حالت تھی۔ میں تو آپ پر ہلکے سے غم کا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی مگر آپ جب یہ خواب دیکھتے ہیں تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتے۔ آخر کب تک آپ ایسے خواب دیکھ کر میری زندگی ویران کرتے رہیں گے؟" اس کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔

روزی کے ساتھ میری شادی کو محض سات ماہ گزرے تھے۔ لیکن اس نے اپنے پیار، خدمت اور خلوص کی وجہ سے میرے دل میں جگہ بنا لی تھی۔ جب ہماری شادی ہوئی تو مجھے ڈر تھا کہ شاید میں روزی کو ذہنی اور روحانی طور پر قبول نہ کر سکوں۔ شادی کے پہلے ہی دن میں نے اُسے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اگر میں اپنے وجود کو مکمل طور پر اسے نہ سونپ سکوں تو وہ اُسے میری مجبوری سمجھ کر نظر انداز کر دے، لیکن جہاں تک شریکِ حیات کے طور پر اسے آسائش اور لوازمات فراہم کرنے کا تعلق ہے اِس میں کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔ روزی کو میری مجبوری کا علم تھا وہ جانتی تھی کہ میرا ذہن اور میری روح خود میرے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ ان پر کسی اور کا تسلط ہے۔ یہ بھی روزی کی عظمت اور پیار کی لگن ہی کا ثبوت تھا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی میری شریکِ زندگی بننے پر آمادہ ہو گئی کہ میرے ذہن و دل پر کوئی اور قابض ہے۔

اس نے سادگی سے صرف اتنا کہا: "یوسف۔ چکور کو محض چاندنی سے مطلب ہوتا ہے۔ وہ چاند کی روشنی میں نہا کر ہی خوش ہو جاتا ہے۔ چاند اس کو ملتا ہے یا نہیں اور وہ کبھی چاند تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں؟ اس سے چکور کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا: "مگر روزی۔ میں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھتا رہوں گا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

وہ اُداسی سے مسکرائی: "آپ کا ضمیر تو میں ہوں۔ اور میری زبان سے آپ کبھی کلماتِ محبت کے سوا اور کچھ نہیں سُنیں گے۔"

میں نے کنکھیوں سے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف دیکھا اور بے ساختہ روزی کی نظریں بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں اِس تصویر تک پہنچ گئیں۔

وہ جذباتی انداز میں کہنے لگی "یقین کیجئے۔ میں آپ کے دل سے اِس تصویر کو مٹانے کی کوشش کبھی نہیں کروں گی یقین کیجئے مجھے اس لڑکی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ دُکھ ہے کہ آپ کی منزل آپ کو نہ مل سکی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ محبوبیت، محبت اور وفا کی اس سے اچھی تعبیر میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا۔ کیا یہ میری خوش نصیبی نہیں ہے کہ مجھے روزی جیسی بیوی ملی ہے۔

"اچھا اب آپ سو جائیے۔ میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں۔"

اُس کے نرم و ملائم ہاتھوں کا لمس میری پیشانی پر محسوس ہُوا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی عاشی کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ عاشی! جسے میں نے اپنی منزل سمجھ لیا تھا اور وہ خود بھی مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتی تھی جس نے مجھے جینے کا ایک نیا حوصلہ اور ارادہ بخشا تھا۔ جس نے میری ویران زندگی میں خوشیاں اور رنگینیاں بکھیر دی تھیں۔ جو بہار کا پہلا جھونکا بن کر میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ وہ اِس وقت کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی؟ کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی؟ یا نقش بر آب کی طرح اُس نے مجھے یکسر فراموش کر دیا ہو گا؟ کیا وہ بے وفا تھی؟ اس خیال کے آتے ہی میں بے چینی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ روزی حیران نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مگر میں دیوانہ وار ٹہل رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ عاشی بے وفا نہیں ہو سکتی۔ وہ تو خالص مشرقی عورت تھی۔ وفا، اخلاص اور ایثار کا نادر نمونہ۔ اُس کے دل میں تو محبت کا ایک آبشار بہہ رہا تھا۔ کبھی نہ ختم ہونے والا آبشار۔ جس نے مجھے بھی اپنے چھینٹیں اُڑاتے، سرکش پانی میں بھگا دیا تھا۔ شرابور کر دیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بے وفا ہو؟ تو پھر وہ اچانک، اطلاع کے بغیر کہاں غائب ہو گئی؟" اس نے خط تک نہیں لکھا۔ کبھی اپنی خیریت سے مطلع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا؟ کیا وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی؟ میں مضطرب ہو کر کھڑکی میں جا کھڑا ہُوا۔ "نہیں۔ وہ زندہ سلامت ہے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ اِسی دُنیا میں موجود ہے ——" میرے دل نے ایک بار پھر مجھے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"وہ مجھے پھر سے کیوں نہیں ملی؟ مجھے اپنے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اتنی بے تعلق اور بے پروا کیوں ہو گئی؟ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مجبوریوں کا شکار ہو گئی ہو۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں کتنی بے بس اور مجبور ہوتی ہیں؟ ہر قدم پر کتنے سمجھوتے کرتی ہیں۔ کتنی مجبوریوں کا زہر پیتی ہیں اور جیتی ہیں" میرے ذہن نے دلیل دی مگر عاشی تو اُن لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی مالک تھی۔ اسے کوئی مجبوری، کوئی جَبر میرے پاس آنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ میری پہلی اور آخری آرزو تھی۔ اور شاید میں بھی اس کی......'

"چائے؟" میں نے چونک کر دیکھا تو کھڑکی میں میرے برابر روزی بھاپ اُٹھتی ہوئی چائے کی گرم گرم پیالی لیے کھڑی تھی میں نہ جانے کب سے کھڑکی کے پاس اپنی سوچوں میں گم کھڑا تھا اور نہ جانے کس وقت وہ کمرے سے رخصت ہو گئی تھی۔ دُور دُور تک کا منظر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ واقعی مجھے گرم چائے کی ایک پیالی کی ضرورت تھی۔ روزی میری خواہشات اور ضروریات کو کتنی جلدی جان لیا کرتی ہے!؟ وہ پوچھے بغیر میرے ہر سوال کا جواب جانتی ہے۔ میں نے مشکرانہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"میں دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا اور اُداسی سے خراماں خراماں کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن وہ میری ذہنی اُفتاد سے واقف تھی۔ وہ میرے غم کی اصلیت سے واقف نہ تھی، لیکن میری دیوانگی سے آگاہ تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ جب میں اچانک بولتے بولتے خاموش ہو جاتا

ہوں یا ہنستے ہنستے یکایک اُداس ہو جاتا ہُوں تو اس کا مطلب کیا ہے؟ دراصل میں ذہنی طور پر کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔ اپنے خیالوں کی ایک الگ دُنیا آباد کر لیتا ہوں۔ اس لمحے میرے لیے ساری دُنیا بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں صرف ایک ہستی کے خیال میں کھو جاتا ہُوں۔ تذبذب اور دیوانگی کا یہ عالم مجھ پر گھنٹوں اور کبھی کبھی دِنوں طاری رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے کسی کی تسلی، کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں صرف خاموشی چاہتا ہوں۔ تنہا رہنا چاہتا ہُوں۔ اپنے آپ میں گم رہنا چاہتا ہُوں اور روزی بڑے خلوص اور یگانگت سے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتی ہے کسی شکوہ اور شکایت کے بغیر۔ ایسی بے لوث، بے غرض اور دُکھ درد بانٹنے والی بیوی بھلا اور کون ہو سکتی ہے؟ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے شوہر کے ذہن و دل پر کسی دوسری عورت کے قبضے سے ناراض اور شاکی بھی نہیں ہے۔ اس کے معصوم اور پاکیزہ دل میں سوتیا ڈاہ جیسے نفرت بھرے جذبے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں نے سوچا عورت ذات اپنے شوہر کی زندگی تو کیا اس کے چند لمحے بھی کسی دوسری عورت کو مستعار دینے کی روادار نہیں ہوتی۔ پھر یہ کیسی عورت ہے جو اپنے شوہر کے باسی اور بچے کھچے جذبات پر اکتفا کرتی ہے اور مُنہ سے اُف تک نہیں کرتی۔ جو شوہر کے پیار کی کھرچن ہی سے خوش اور مطمئن ہے۔ کاش میں بھی اپنے آپ کو روزی کے قابل بنا سکتا۔ وہ عظمت کی جس بلندی پر کھڑی ہے سمجھ بُوجھ کی سیڑھی لگا کر کم از کم وہاں تک پہنچنے کی کوشش تو کرتا۔ مگر دل پر کسے اختیار ہوا ہے جو مجھے ہو گا!؟

کمرے کا دروازہ کسی آواز کے بغیر بند ہو چکا تھا اور اب میں کمرے میں بالکل تنہا تھا۔ کوئی ذی نفس میرے ساتھ نہیں تھا لیکن یادوں کا ہجوم میرے آس پاس تھا۔ اپنی مایوسیوں، اپنے پچھتاووں کے ساتھ میں کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو میں عزیز بھی رکھتا تھا مگر ان سے خائف بھی تھا۔ ان سے دامن بچانے کی کوشش بھی کرتا رہتا تھا۔ تلخ یادیں غموں اور دُکھوں کے سوا اور کیا دے سکتی ہیں؟

میں نے چند مہینے پہلے سگریٹ نوشی چھوڑ دی تھی مگر نگاہ اٹھا کے دیکھا تو سائیڈ ٹیبل پر مجھے اپنی پسندیدہ سگریٹ کا نیا پیکٹ رکھا ہُوا نظر آ گیا۔ نزدیک ہی سگریٹ لائٹر بھی موجود تھا۔ یہ بھی روزی کے حُسن کارکردگی کی ایک ادا تھی۔ وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھی کہ تنہائی کا زہر سگریٹ کے بغیر میرے حلق سے نہیں اُتر سکتا۔ میں گھنٹوں سگریٹ پھونکتا اور دیوانوں کی مانند کمرے میں گھومتا رہتا ہُوں۔ وہ صبح آئے گی تو میں تھک کر سو چکا ہوں گا۔ وہ کمرے کی کھڑکیاں کھول کر کثیف دھوئیں کا غبار باہر نکالے گی۔ کمرے کو صاف کرے گی۔ فرش پر سے ماچس کی تیلیاں اور سگریٹ کے ٹکڑے سمیٹے گی۔ گلدانوں میں تازہ پھولوں کے گلدستے سجائے گی تاکہ جب میں سو کر اُٹھوں تو کمرہ خوشبو سے مہک رہا ہو۔ اس خوشبو میں پھولوں کے ساتھ ساتھ روزی کی مخصوص خوشبو بھی شامل ہُوا کرتی ہے۔ شکریہ روزی! میں تمہارا ممنون ہوں کہ تم ایک دیوانے کا اس قدر خیال رکھتی ہو، جو بے اعتنائی اور بے پروائی کے سوا تمہیں کچھ اور نہیں دے سکتا۔ روزی کی یہی خوبیاں تھیں جنھوں نے میرے دل کو موہ لیا تھا۔ میرے خیالات کو موم کر دیا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا سپاس گزار تھا۔ شاید وہ جانتی ہے کہ اظہارِ تشکر محبت کا پہلا زینہ ہے۔ روزی کتنی سُوجھ بُوجھ والی عورت ہے!!

میں نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ دُور پہاڑوں پر کُہر چھائی ہوئی تھی۔ لہر سرد ہُواؤں نے آفت ڈھائی ہُوئی تھی۔ میں اپنے گرم کمرے میں یخ بستہ خنکی اور ہڈیوں تک اُتر جانے والی سرد ہواؤں کی قیامت خیزیوں سے محفوظ تھا۔ اس لیے دُور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھری ہُوئی دُھند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دُھند کے پردوں میں مجھے کچھ عکس، کچھ تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ آج پھر میرے ماضی کی یادیں بڑی شدت سے مجھے ستا رہی تھیں۔ مجھے بیتے ہُوئے دن بے اختیار یاد آ رہے تھے۔

مجھے معلوم نہیں کہ میرے والدین کب مجھے چھوڑ کر اس دُنیا سے رخصت ہُوئے۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے اپنی پھوپھی کا مہربان اور شفیق چہرہ دیکھا۔ اُن کی ذات کے سوا دُنیا میں کوئی اور میرا نہ تھا۔ پھوپھی حمیدہ میرے ابّو کی چھوٹی بہن تھیں وہ مجھے بتایا کرتی تھیں کہ میرے ابّو اور خود وہ بھی بچپن ہی میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر ابّو نے بڑے حوصلے

www.pdfbooksfree.pk

اور مضبوط ارادے سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بہن کو کبھی ماں باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ دادا جان بینک میں کچھ سرمایہ اور سر چھپانے کے لیے ایک گھر چھوڑ گئے تھے۔ ابو نے کسی بزرگ کی سرپرستی کے بغیر ہی اپنی ساری توجہ تعلیم پر رکھی۔ پھوپھی حمیدہ بتایا کرتی تھیں کہ وہ پچھلی رات تک پڑھا کرتے تھے۔ تب ہی تو ہر جماعت میں اُن کی پہلی پوزیشن آیا کرتی۔ وہ ایک ذہین، محنتی اور شوقین طالب علم تھے۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا اور پھر بی کام میں ممتاز پوزیشن حاصل کی۔ ابو پھوپھی حمیدہ کی تعلیم کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوئے۔ اُس دور میں جبکہ لڑکیوں کی تعلیم کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ اکثر گھرانے تو اس کے سخت مخالف تھے، ابو نے پھوپھی حمیدہ کو تعلیم کی طرف مائل کیا۔ پھوپھی کو پڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو وہ گڑیاں کھیلتی رہتیں۔ انھیں گڑیوں سے کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ گڑیوں کا شوق تو بیشتر لڑکیوں کو ہوتا ہے مگر پھوپھی حمیدہ کو تو جیسے دیوانگی تھی۔ بچپن ہی سے وہ گڑیوں کو توڑ پھوڑ کر پھینکنے کے بجائے انھیں سنوارتیں، سجاتیں اور اپنے ساتھ ہی بستر پر سلایا کرتی تھیں۔ انھیں جو گڑیا بھی مل گئی وہ ہمیشہ اُن کے پاس صحیح سلامت اور محفوظ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھال کر دیکھا تو ہمارا گھر اچھا خاصا گڑیا خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرہ تو خالص گڑیوں کے لیے مخصوص تھا اور "گڑیا گھر" کہلاتا تھا۔ مگر دوسرے کمروں میں بھی گڑیاں سجی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ابو نے پھوپھی حمیدہ کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کی بہت کوشش کی۔ سمجھایا بجھایا اور جب وہ مائل نہ ہوئیں تو دھمکی دی کہ نہ صرف اُن کے لیے مزید گڑیاں نہیں لائیں گے بلکہ اُن کی موجودہ گڑیاں بھی چھپا دیں گے اور اگر پھر بھی انھوں نے تعلیم حاصل نہ کی تو گڑیوں کو گھر سے باہر پھینک دیں گے۔ یہ آخری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ گڑیوں سے جدائی کا تصور ہی پھوپھی حمیدہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجبوراً انھوں نے پڑھنے کی طرف توجہ دی۔ مگر وہ بقول خود ان کے بہت پھسڈی طالبہ تھیں۔ انھوں نے کبھی تھرڈ ڈویژن سے زیادہ حاصل نہیں کیا۔ مگر ابو کے لیے یہی اطمینان بہت تھا کہ وہ تعلیم حاصل تو کر رہی ہیں۔ بڑی مشکل سے پھوپھی حمیدہ نے میٹرک کا امتحان دو تین سال کی کوشش کے بعد پاس کیا اور ابو نے بہت خوشیاں منائیں۔ انھیں درجن بھر مختلف اقسام گڑیاں تحفے کے طور پر دیں اور وعدہ کیا کہ دُنیا کی ہر ملک کی گڑیا وہ انھیں منگوا کر دیں گے۔ بشرطیکہ وہ بی۔ اے بھی پاس کرلیں۔ بی۔ اے پاس کرنا پھوپھی حمیدہ کے نزدیک پہاڑ کھودنے سے زیادہ مشکل کام تھا لیکن گڑیوں کا لالچ بھی کم نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ مگر ان کا زیادہ وقت یہ معلومات حاصل کرنے میں گزر جاتا کہ دُنیا کے کون سے مُلکوں میں کس قسم کی گڑیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ ان گڑیوں کی فہرست تیار کرنے میں لگی رہتیں اور وقتاً فوقتاً ابو کو بھی یہ معلومات فراہم کردیا کرتیں۔

ابو کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ اپنی شادی کرنے سے پہلے پھوپھی حمیدہ کے ہاتھ پیلے کریں مگر ایک تو اس میں یہ امر مانع تھا کہ پھوپھی حمیدہ کی تعلیم پوری نہیں ہوئی تھی اور ابو چاہتے تھے کہ وہ شادی سے پہلے کم از کم بی۔ اے ضرور کرلیں۔ دوسرے وہ یہ چاہتے تھے کہ پھوپھی حمیدہ پر سے گھریلو ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ ہٹ جائے۔ گھر میں ایک ماما ملازم تھی مگر پھر بھی گرہستی کا سارا بار پھوپھی حمیدہ پر تھا۔ چنانچہ ابو نے پھوپھی حمیدہ سے مشورہ کیا۔ اور ان کی اجازت اور فرمائش سے خود اپنے لیے شادی کے منصوبے بنانے لگے۔

ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے معاملات خاندان کے بزرگ طے کرتے ہیں اور رشتہ تلاش کرنے کے فرائض بھی خاندان کی عورتیں سرانجام دیتی ہیں۔ مگر ابو کو یہ سہولت حاصل نہ تھی۔ ان کا تمام تر خاندان محض دو افراد پر مشتمل تھا اور پھر پھوپھی حمیدہ کی عمر اور تجربہ ایسا نہ تھا کہ وہ ابو کے لیے رشتے تلاش کرتیں۔ پھر یہ باتیں تو میل جول سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ اور پھوپھی حمیدہ کو تو گھریلو کاموں، پڑھائی اور گڑیوں کی دیکھ بھال ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ بھلا اپنے لیے بھابی کیسے اور کہاں سے تلاش کرتیں۔ مگر یہ مشکل بھی خود بخود حل ہوگئی۔ ہوا یہ کہ ابو جس دفتر میں منیجر تھے وہاں ٹائپسٹ کے طور پر ایک نئی لڑکی کا تقرر ہوا۔ لڑکی بہت شرمیلی اور سیدھی سادھی تھی۔ ہر وقت سہمی سہمی رہا کرتی۔ مردوں کے ساتھ میل جول اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مردانہ ماحول میں کام کرنے کی گھبراہٹ اُس میں اتنی طاری رہتی کہ وہ اپنے کام میں غلطیاں کرنے لگی۔ ابو نے ایک بار اُسے بُلا کر سمجھایا

اور دوسری بار بھی وہی غلطیاں ہوئیں تو بُلا کر ڈانٹا تو وہ رونے لگی۔ ابو بے چارے گھبرا گئے اور لگے معذرت کرنے۔ وہ جتنی معذرت کرتے ٹائپسٹ کے آنسو اتنی ہی شدت سے نکلتے۔ خدا خدا کرکے اس کا رونا کم ہوا تو ابو نے اسے چائے پلائی۔ تسلی دی اور نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے کام میں دھیان لگانا چاہیئے۔ جب تک وہ توجہ نہیں دے گی غلطیاں ہوتی رہیں گی۔ لڑکی نے دوبارہ رونا شروع کردیا۔ بے چارے ابو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اُن سے کیا غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ اُدھر دفتر والوں نے کانا پھوسی شروع کردی۔ تنگ آکر ابو نے اتنی زور کی ڈانٹ پلائی کہ لڑکی کا رونا دھونا یک لخت بند ہوگیا۔ اب ابو بہت گھبرائے کہ اس کے بعد کیا کریں؟ پیار سے سمجھائیں گے تو وہ دوبارہ رونا شروع کردے گی۔ ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو سہم کر نہ جانے کیا کر بیٹھے؟ چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی اور ابو ٹہلتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا، "دیکھو سکینہ کل اپنے والد کو مجھ سے ملنے کے لیے بھیجنا۔"

"میرے والد نہیں ہیں۔"

"والدہ تو ہوں گی۔"

"جی نہیں۔"

"کوئی بھائی؟ یا بڑی بہن؟"

"وہ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر کوئی تو بزرگ ہوگا تمہارا؟" ابو نے پوچھا۔

"میرا کوئی نہیں ہے سر۔ ایک دُور کی رشتے دار نے مجھے پالا ہے۔ میرا نوکری کرنے کو بالکل دل نہیں چاہتا۔ گھر سے باہر نکلتی ہوں تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ مجھے نوکری کے لیے مجبور کرتی ہیں۔"

ابو سوچ میں پڑ گئے۔ "کیا رشتہ ہے تمہارا اُن سے؟"

"رشتہ بھی کوئی نہیں ہے۔ بس انھوں نے مجھے پالا ہے۔"

"مگر تمہارے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے لوگ؟"

"سر میں چھوٹی تھی تو گُم ہوگئی تھی۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ کہاں ہیں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میں دُنیا میں بالکل اکیلی ہوں سر۔" لڑکی کی آواز بھرا گئی اور اس نے پھر رونا شروع کردیا۔ اس لڑکی کے بارے میں ابو نے فوری طور پر بہت کچھ سوچا اور آخر ایک نتیجے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اس سے شادی کرلی۔ یہی لڑکی میری ماں تھی۔

مگر یہ شادی آسانی سے نہیں ہوئی۔ پھوپھی حمیدہ نے مجھے بتایا تھا کہ جب ابو شادی کی تجویز لے کر امی کو پالنے والی عورت کے پاس گئے تو وہ آگ بگولہ ہوگئی۔ بہت ناراض ہوئی۔ ابو کے ساتھ ساتھ امی کو بھی خوب سنائیں۔ "میں تو جانتی تھی تو ضرور کوئی چاند چڑھائے گی؟ تجھے اِسی لیے پڑھایا تھا۔ نوکری کرائی تھی کہ جاتے ہی عشق بازی شروع کردے۔"

امی نے تو حسب عادت رونا شروع کردیا مگر ابو نے زبردست احتجاج کیا۔

"دیکھئے محترمہ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ نے مجھ پر اور اس شریف لڑکی پر الزام لگایا ہے۔ آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے الفاظ واپس لینے کی۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ اور پھر دوبارہ اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔" پھر وہ موٹی بدمزاج عورت امی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آج کے بعد تیری نوکری ختم۔ توبہ توبہ کیسا خراب زمانہ آگیا ہے۔ کان کھول کر سُن لے اگر گھر سے قدم باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

ابو کو بہت بُرا لگا۔ تھے تو وہ بہت کم گو اور شرمیلے۔ مگر انھیں اُس وقت جوش آگیا۔ بولے "دیکھئے محترمہ۔ آپ اِس لڑکی کی کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ کو کوئی قانونی یا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے کہ اس بے چاری کو حبسِ بے جا میں رکھیں۔"

موٹی عورت نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ "خدا کی پناہ یہ اس کی اب کچھ نہیں رہی۔ ارے میں ہی تو اس کی سب کچھ ہوں۔ میری مرضی کے بغیر یہ انگلی بھی نہیں ہلا سکتی۔"

www.pdfbooksfree.pk

ابّو نے سائیت سے کہا "یہ لڑکی عاقل ہے! بالغ ہے۔ اپنا بُرا بھلا خود سمجھتی ہے۔ اس کی رضا مندی اور خواہش کے بغیر کوئی اسے پابند اور مجبور نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے اسے زبردستی ڈرا دھمکا کر اپنے پاس رکھا ہے اور اس کی خواہش کے خلاف اس سے ملازمت کرانا چاہتی ہیں۔"

"کیوں نہ کراؤں؟" وہ گرجیں "میں نے اس کی پرورش اور تعلیم پر پیسے خرچ کیے ہیں۔ وہ کہاں سے وصول کروں گی؟"

"کتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں آپ کے؟" ابّو نے تنک کر پوچھا۔

"ہزاروں۔"

"پانچ ہزار، دس ہزار۔ کتنے ہزار؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ بڑے ہمدرد بنتے ہو۔ ادا کر دو گے مجھے؟"

ابّو نے کہا "بالکل کر دوں گا۔"

"تو پھر دس ہزار روپے دے دو اور اس کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔ ٹھوکریں کھائے گی تو خود ہی سمجھ جائے گی۔"

ابّو نے امّی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نگاہوں میں التجا کہ مجھے اس ظالم عورت کے پاس چھوڑ کر نہ جاؤ ورنہ کل مجھے یہاں نہ پاؤ گے۔ ابّو نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہنے لگے۔

"میں سکینہ کو اسی وقت ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ رقم میں کل ادا کر دوں گا۔"

"واہ۔ مجھے بیوقوف سمجھا ہے، یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ خوب سمجھتی ہوں تم جیسے مردوں کی چالاکیاں۔ رقم وصول کیے بغیر یہ ہرگز یہاں سے نہیں جا سکتی۔"

ابّو کو بھی غصہ آ گیا۔ بولے "دیکھو بڑی بی۔ جو ضمانت تم مانگو میں دینے کو تیار ہوں مگر اب اس لڑکی کو ایک پل کے لیے بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ محلّے والوں کو بلاؤ تاکہ میں ان کے سامنے تم سے پکا فیصلہ کر لوں۔"

موٹی عورت کو شاید محلّے والوں کو بُلانا گوارا نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ محلّے والے اس کا سلوک اور برتاؤ دیکھتے رہے تھے اور ہو سکتا ہے اس کی حمایت کرنے کے بجائے وہ اس کے خلاف فیصلہ دیتے۔ بہرحال ابّو نے امّی سے کہا "سکینہ اُٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"میں نے کہہ دیا۔ یہ نہیں جا سکتی" بڑی بی نے غصّے سے کہا۔

"روک سکتی ہو تو روک لو۔ پولیس، کچہری جو چاہتی ہو کر لو۔ میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اب اسے میں ایک منٹ کے لیے بھی تمہارے پاس نہیں چھوڑوں گا۔ اور کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم نے روکنے کی کوشش کی اور پھر بھی یہ میرے ساتھ چلی گئی تو پھر تمہیں ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گی۔"

موٹی عورت نے ایک لمحہ سوچا اور پھر امّی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی اُسے ایک مصمم ارادہ نظر آیا ہو گا۔ دوسری طرف ابّو کسی سمجھوتے پر آمادہ نہ تھے۔ اسکو خیریت اسی میں نظر آئی کہ ابّو سے وعدے قسمیں لے کر امّی کو ان کے حوالے کر دے ——— کیونکہ امّی کی بدلی ہوئی آنکھیں وہ دیکھ چکی تھی۔ اس طرح ابّو، امّی کو لے کر اپنے گھر آ گئے۔

پھوپھی حمیدہ تو حیران رہ گئیں "ارے بھائی جان۔ کیا سچ مُچ یہ میری بھابی ہیں؟"

ابّو نے کہا "ہیں تو نہیں، مگر ہو جائیں گی کل تک یہ تمہاری مہمان ہیں حمیدہ۔ ان کے آرام کا خیال رکھنا۔"

پھوپھی حمیدہ ہونے والی بھابی کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنا دل نکال کر انہیں پیش کر دیں۔ اللہ نے بِن مانگے ان کے دل کی مُراد پوری کر دی تھی۔ گھر بیٹھے بٹھائے انہیں اتنی اچھی بھابی بھیج دی تھی۔ دوسرے دن ابّو نے دس ہزار روپے کا بندوبست کیا اور امّی کو پالنے والی عورت بلقیس کو لے جا کر دے دیئے۔ اس کو شاید رقم ملنے کی اُمید ہی نہ تھی۔ اتنے ڈھیر سارے روپے یکجا دیکھے تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے ابّو کی بہت خاطر مدارت کی۔ پھر اُن کے دریافت کرنے پر بتایا کہ پانچ سال کی عمر میں یہ اُسے ایک میلے میں ملی تھی۔ اُس نے اُس کے ماں باپ کا پتہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی، مگر لڑکی کا کوئی وارث نہ آیا۔ بذاتِ خود اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ شوہر مر چکا تھا۔ تھوڑی بہت جائیداد تھی جس پر گزارہ ہو رہا تھا اُس نے بچّی کو پال لیا۔ جب تک سکینہ چھوٹی تھی اس کی محبّت بے لوث رہی مگر جب سکینہ سمجھ دار ہوئی تو بلقیس کو لالچ پیدا ہو گیا، اسے یہ ڈر بھی پیدا ہو گیا کہ کہیں اس لے اصل وارثوں کو سکینہ کے بارے میں خبر نہ ہو جائے اور بلقیس کی ساری ریاضت اکارت چلی جائے۔ پھر وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ سکینہ کو تعلیم دلائے تاکہ وہ ملازمت کرے اور بلقیس کی بقیہ عمر آرام اور بے فکری سے گزر جائے۔ چنانچہ وہ سکینہ کو لے کر اپنے گاؤں سے رخصت ہوئی اور ایک شہر میں آباد ہو گئی۔ سکینہ کو وہ خود کالج پہنچانے اور لینے کے لیے جاتی تھی۔ اب اسے کسی لڑکے تو کیا پڑوسن سے ملنے کی اجازت تک نہ تھی۔ بلقیس کے رویّے میں یہ اچانک تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ شاید اس کی بڑھتی ہوئی عمر کسی سہارے کی عدم موجودگی اور خود اُسکی بے مائیگی کے خوف نے اُسے خود غرض اور سنگدل بنا دیا تھا۔ امّی نے ایف اے کا امتحان دیا تو اس نے انہیں نوکری پر لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ طبعاً شرمیلی اور کم گو تھیں۔ اس پر علیحدہ اور تنہا رہنے کی وجہ سے اِن کی جھجک اور شرمیلے پن میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ نوکری کرنے کے خیال ہی سے لرز جاتی تھی۔ دُنیا کا انہیں کوئی عملی تجربہ نہ تھا مگر انہوں نے رسالوں اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض خود غرض اور سنگدل مرد لڑکیوں کی مجبوریوں اور ضرورت مندی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود بلقیس نے بھی انہیں مردوں کی طرف سے برگشتہ اور بدگمان کر دیا تھا۔ جب اس نے انہیں نوکری کے لیے مجبور کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر بلقیس کے سامنے ایک نہ چلی اور انہیں بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے خدا کو انہیں ابّو سے ملانا منظور تھا۔ اس لیے پہلی ہی نوکری انہوں نے ابّو کے دفتر میں کی اور اس طرح وہ دونوں زندگی بھر کے لیے ایک ہو گئے۔

ابّو کی شادی کیا ہوئی گھر میں بہار آ گئی۔ تین نیک اور معصوم انسانوں پر مشتمل یہ گھر جنّت اور سکون کا نمونہ تھا۔ ہر وقت قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ خوشیوں اور مسرّتوں کا ایک سیلاب تھا جو اِس چھوٹے سے گھر میں گھُس آیا تھا۔ امّی نے گھر کا چارج سنبھالتے ہی پھوپھی حمیدہ کو گھریلو کاموں سے فارغ کر دیا اور اُن کی تعلیم پر توجہ دینے لگیں۔ وہ ابّو سے یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ حمیدہ کو اتنا زیادہ پڑھانے کی ضرورت بھی کیا ہے اب اُس کی مانگ سجا دو۔ اپنے گھر جائے گی اور گھر والے کی مرضی ہو گی تو پڑھائے گا ورنہ کافی پڑھ چکی۔ مگر ابّو کی ضد تھی کہ جب تک پھوپھی حمیدہ کم از کم بی۔ اے نہیں کر لیں گی ان کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ امّی سے کہا کرتے "سکینہ زمانہ بہت خراب ہے۔ عورت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ بُرا وقت آن پڑے تو خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے۔ دُنیا کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور نہ ہو جائے اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی محتاج ہو کر اُن کے اشاروں پر رقص کرے۔ اور مجبوراً زندگی بسر کرے۔"

شادی کے ایک سال بعد میری پیدائش ہوئی۔ ابّو تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئے۔ جب نرس نے انہیں میری پیدائش کی اطلاع دی تو وہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گئے۔ یاان کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہ بار بار پھوپھی حمیدہ سے کہتے "حمیدہ اللہ نے ہماری سُن لی ہے۔ کتنا مہربان ہے وہ ہم پر۔ بول۔ اب ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی ہے؟"

پھر جب اُنہوں نے پہلی بار مجھے دیکھا تو پہلے تو دُور سے دیکھتے ہی رہ گئے۔

امّی مُسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھوپھی نے کہا "بھائی جان۔ پیار نہیں کریں گے مُنّے کو؟"

انہوں نے چونک کر پھوپھی حمیدہ کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے "حمیدہ۔ یہ اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ بہت نازک بھی لگتا ہے۔ مجھے تو اِسے ہاتھ لگاتے ہُوئے بھی ڈر لگتا ہے، کہیں اس کی ہڈی میں موچ نہ آ جائے۔"

امّی اور پھوپھی حمیدہ کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو گیا۔

پھوپھی نے کہا "بھائی جان۔ اتنا نازک نہیں ہے آپ کا بیٹا۔ ایک بہادر کا بیٹا ہے۔ آپ ہی کا خون ہے۔ آپ ہی جیسی مضبوط

www.pdfbooksfree.pk

ہڈیاں ہیں اس کی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اِسے پیار کرکے تو دیکھیں۔"

ابّو نے پہلے پھوپھی حمیدہ کی اور پھر امّی کی طرف دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھے۔ پہلے انہوں نے لرزتے سمیت مجھے بہت نرمی سے اٹھایا۔ پھر میرے کان میں اذان دی۔ اس کے بعد بہت دیر تک خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ پھر وہ امّی سے مخاطب ہوئے اور بولے: "سکینہ ہم اپنے بیٹے کو بہت بڑا آدمی بنائیں گے۔"

پھوپھی نے پوچھا: "کیا اِسے جج بنائیں گے؟"

ابّو کہنے لگے: "نہیں۔ میرا بیٹا بہادر ہے۔ یہ فوج میں جائے گا۔ وطن کے لیے ایسے کارنامے سرانجام دے گا کہ دُنیا دیکھے گی۔"

یہ سب باتیں پھوپھی حمیدہ نے ہمیں بتائی تھیں۔ مَیں نے کبھی ابّو امّی کی شکل نہیں دیکھی نہ ان کی آواز سُنی۔ مگر یُوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں میرے سامنے چل پھر رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، جیسے میرے خیالوں میں جان پڑ گئی ہے اور ان کے تصور نے جیتے جاگتے انسانوں کا روپ دھار لیا ہے۔

جب مَیں نے ہوش سنبھالا اس وقت سے پھوپھی حمیدہ سوتے وقت مجھے لوری یا شہزادی اور بادشاہ کی کہانی کی جگہ ابّو اور امّی کی باتیں سنایا کرتی تھیں۔ وہ خود بھی یہ واقعات بیان کرتے ہوئے اِن میں اتنی ڈوب جایا کرتی تھیں کہ لگتا تھا وہ خود بھی اپنی آنکھوں کے سامنے بیان کیے جانے والے مناظر کو متحرک دیکھ رہی ہیں۔ خوشی کی باتیں سنائیں تو بے اختیار ہنسنے لگتیں۔ مَیں بھی خوب ہنستا۔ اگر کوئی غم ناک واقعہ بیان کرتیں تو ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ انہیں روتے ہوئے دیکھ کر مَیں بھی اُداس ہو جاتا اور اُن ہی کے آنچل سے اُن کے آنسو پونچھنے لگتا۔ کبھی کبھی وہ باقاعدہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتیں۔ مَیں اُن کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو اپنے ننھے مُنّے ہاتھوں سے صاف کرتا جاتا اور انہیں پیار کرکے تسلّی بھی دیتا جاتا: "پھوپھی، روتی کیوں ہیں۔ اب رونے سے کیا فائدہ ابّو اور امّی تو اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ وہ وہاں جنت میں بہت خوش ہوں گے۔ آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر وہ کتنے اُداس ہوں گے۔ کیا آپ انہیں جنت میں اُداس کرنا چاہتی ہیں؟"

پھوپھی مجھے بے اختیار گلے سے لپٹا لیتیں اور میرا ماتھا چُوم کر کہتیں: "ہاں بیٹے۔ تیرے ابّو اور امّی جنتی تھے۔ اللہ نے اپنے کرم سے انہیں جنت میں جگہ دی ہوگی۔ خدا ہمیشہ انہیں وہیں رکھے۔"

مَیں اُن سے پُوچھتا: "مگر پھوپھی۔ اللہ میاں نے ابّو اور امّی کو اتنی جلدی اپنے پاس کیوں بُلا لیا؟ اوروں کے ماں باپ تو بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں۔ سامنے والے عارف کو دیکھئے۔ اس کے ابّا کتنے بوڑھے ہیں۔ امّاں جی ہر وقت کھانستی رہتی ہیں۔ مُنہ پوپلا ہو گیا ہے مگر انہیں تو اللہ میاں نے ابھی تک اپنے پاس نہیں بُلایا۔ ان کے بیٹے اور بیٹیاں کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ بڑی بہن کی تو شادی بھی ہو گئی۔ اگر ابّو اور امّی بھی میری شادی تک زندہ رہتے تو اللہ میاں کا کیا نقصان تھا؟"

پھوپھی مجھے چُوم کر کہتیں: "بیٹے۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ وہی جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ زندگی اور موت بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ بہت سے بچّے تو پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں اور بہت سے لوگ بوڑھے ہو کر بھی نہیں مرتے۔ یہ سب اللہ میاں کی مرضی سے ہوتا ہے۔"

مَیں پوچھتا۔ "مگر پھوپھی اللہ میاں نے تو ابّو اور امّی کو نہیں مارا۔ آپ نے خود ہی تو بتایا ہے کہ ایک ٹرک والے نے انہیں کُچل کر مار دیا تھا۔"

"وہ مجھے سمجھاتیں: "پگلے بیٹے۔ اللہ کے حکم کے بغیر تو ٹرک والا بھی اُنہیں نہیں مار سکتا تھا۔ کتنے بہت سے لوگ ٹرک اور بس سے ٹکرانے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ بس اللہ میاں کی مرضی تھی۔ اُن کی جان لے لی۔"

"اب میں سمجھ گیا پھوپھی۔ موت کے فرشتے کو اللہ میاں نے ٹرک ڈرائیور بنا کر بھیجا تھا!" مَیں کہتا۔

پھوپھی حمیدہ بے اختیار ہنس پڑتیں: "کتنا سمجھ دار ہے میرا بیٹا۔"

مَیں ساڑھے چار سال کا ہُوا تو پھوپھی حمیدہ نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ مَیں پڑھائی سے دِل چُراتا تو وہ مجھے لالچ دیتیں: "بیٹے تھوڑی دیر پڑھو گے تو پھر مَیں تمہیں ابّو اور امّی کی بہت مزیدار بات سناؤں گی۔"

"سچ پھوپھی۔ بالکل نئی؟"

"ہاں۔ بالکل نئی۔"

اور مَیں ابّو اور امّی کا نیا قصہ سُننے کے شوق میں جھٹ پٹ گنتی یاد کر لیتا۔

ابّو اور امّی کے بے شمار واقعات ایسے تھے جو مَیں سینکڑوں بار سُن چکا تھا اور مجھے اَز بر یاد ہو گئے تھے۔ مَیں فرمائش کرتا: "پھوپھی وہ والی کہانی سنائیں جب امّی چوہا دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔"

پھوپھی خود بھی مسکرانے لگتیں: "بھئی تمہاری امّی تھیں تو بہت اچھی مگر بہت ڈرپوک تھیں۔ برسات میں چھوٹا سا پروانہ بھی کمرے میں آ جاتا تو ڈر کے مارے کمرے سے باہر بھاگ جاتیں۔ نرم دل اتنی زیادہ تھیں کہ بات بات پر اُن کے آنسو نکل آتے تھے۔"

مجھے امّی کی بُزدلی پر بہت شرم آیا کرتی۔ مَیں کہتا: "مگر پھوپھی، ابّو تو بہت بہادر تھے نا کسی سے نہیں ڈرتے تھے؟"

"کسی سے بھی نہیں۔ خدا کے سوا۔" اور پھر پھوپھی حمیدہ مجھے ابّو کی بہادری اور شجاعت کی داستانیں سنانے لگتیں جو مَیں نے بار ہا سُنی تھیں مگر جنہیں سُن کر کبھی میرا دل نہیں بھرتا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ ابّو واقعی کسی چیز سے نہیں ڈرتے تھے۔ نہ کسی افسر سے، نہ طاقت ور سے، نہ چور سے، نہ ڈاکو سے۔ سانپ کو وہ دُم سے پکڑ کر اٹھاتے اور جھٹکا دے کر مار دیا کرتے۔ جنگلی جانوروں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہوں نے سُنایا کہ ایک بار ابّو کسی گھنے جنگل کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گرمی زیادہ تھی اس لیے رات کو برآمدے میں پلنگ بچھوا کر لیٹ گئے۔ چوکیدار نے کہا بھی کہ صاحب باہر سونا خطرناک ہے۔ کبھی کبھی جنگلی جانور اِدھر آ جاتے ہیں مگر ابّو نے ایک بھی نہیں سُنی۔ کلمہ پڑھا اور لیٹ کر بے خبر سو گئے۔ صبح سویرے چوکیدار انہیں جگانے کے لیے پہنچا تو دیکھا کہ اُن کی چارپائی کے نیچے شیر سو رہا ہے۔ چوکیدار کی تو روح فنا ہو گئی۔ ڈر کے مارے گھگھی بندھ گئی۔ ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر زمین پر گری اور ٹوٹ گئی۔ پیالی کے ٹوٹنے کی آواز سے ابّو کی بھی آنکھ کھُل گئی اور شیر کی بھی۔ ابّو کی نظر پہلے تو چوکیدار پر پڑی اور پھر اُن کی توجہ چارپائی کے نیچے لیٹے ہوئے شیر کی طرف گئی۔ شیر نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ ابّو پلنگ پر بیٹھ گئے اور شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ہتھیار کوئی پاس نہ تھا۔ شیر بڑے آرام سے چارپائی کے نیچے سے نکلا ایک ہی جمائی لی اور خاموشی سے جنگل کی طرف چلا گیا۔ ابّو خاموش اور مطمئن بیٹھے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر بستر سے اٹھ کر چوکیدار کے پاس گئے۔ ابھی اس سے مخاطب بھی نہیں ہوئے تھے کہ چوکیدار نے ایک دلدوز چیخ ماری اور دھڑام سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔

ابّو کی شجاعت اور جواں مردی کی اور بھی بہت سی کہانیاں پھوپھی حمیدہ نے مجھے سنائی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ابّو بہت تنومند اور طاقت ور آدمی تھے۔ ایک بار بس میں سفر کر رہے تھے کہ سنسان سڑک پر دو مسلح ڈاکوؤں نے راستہ روک لیا۔ اور مسافروں کو لُوٹنا شروع کر دیا۔ ابّو نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح چُپ چاپ اپنی گھڑی اور ساری نقدی نکال کر ڈاکوؤں کے حوالے کر دی۔ مگر جب ایک ڈاکو نے ایک مسافر عورت کے ساتھ بدتمیزی کی اور اس کے گلے کا ہار نوچنا چاہا تو ابّو سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے ڈاکو کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایسا گھونسہ رسید کیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ ابّو نے اس ڈاکو کو اُٹھا کر دوسرے ڈاکو پر پھینک دیا۔ دوسرے ڈاکو نے پستول سے فائر کیا مگر اتنی دیر میں دوسرے مسافروں نے جھپٹ کر اسے قابو میں کر لیا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ دونوں ڈاکو پکڑے گئے۔

جس عورت کو بچانے کے لیے ابّو نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا وہ اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتی تھی۔ جب اسے معلوم ہُوا کہ ابّو کی کوئی بہن نہیں ہے تو اس نے انہیں مُنہ بولا بھائی بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ ابّو نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا: "محترمہ۔ مُنہ سے کہنے اور حقیقت میں اس کو نبھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ویسے بھی اسلامی شریعت کی رُو سے میں آپ کے لیے ایک غیر محرم ہوں۔ محض زبان سے کہہ دینے سے تو مَیں آپ کا حقیقی بھائی نہیں بن سکتا۔ لیکن یقین کیجیے میرے دل میں آپ کے لیے ہمیشہ وہی احترام رہے گا جو ایک بہن کے لیے ہو سکتا ہے۔"

وہ عورت ابّو کے کردار کی بلندی سے اتنی متاثر ہوئی کہ ان سے گھر کا پتہ لے کر کچھ دنوں بعد اپنے بھائی کے ساتھ ابّو اور امّی

www.pdfbooksfree.pk

سے ملنے کے لیے گھر آئی۔ امی کو اس نے دوپٹہ بدل بہن بنالیا۔ وہ ایک مالدار زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ امی کے لیے زیورات کا ایک سیٹ بھی لے کر آئی تھی مگر ابّو اور امی دونوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ امی نے رخصت کے وقت اسے کانوں کے طلائی بندے بطور تحفہ دیے۔ اس نے انکار کیا تو امی نے کہا: "دیکھو، تم نے زبان سے میرے شوہر کو بھائی کہا ہے تو کیا بھائی کے گھر سے اس کی بہن خالی ہاتھ جائے گی"؟

ایسی ایسی اور نہ جانے کتنی کہانیاں تھیں جو حمیدہ پھوپھی مجھے سنایا کرتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں بھی بچپن ہی سے نڈر تھا۔ نہ اندھیرے سے ڈرتا تھا نہ جن اور بھوت سے۔ کیڑے مکوڑوں سے بھی مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو بھاگ دوڑ والے کھیل کود میں اگر چوٹ لگتی تو منہ سے اُف تک نہ کرتا۔ میری بے خوفی اور جسمانی مضبوطی کی وجہ سے مجھ سے بڑی عمر کے لڑکے بھی مجھ سے جھگڑا کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ جسمانی قوت کے مظاہروں سے مجھے قدرتی طور پر دلچسپی تھی۔ جان جوکھوں میں ڈالنے والے کھیل میرے پسندیدہ مشغلے تھے اور بڑا ہوا تو کھیلوں میں دلچسپی لینے لگا۔ باکسنگ کا تو بچپن ہی سے دیوانہ تھا۔ ہر کسی کے ساتھ باکسنگ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کے بعد فٹ بال اور ہاکی سے وابستگی ہو گئی۔ ایک بار سکول میں انسپکٹر تعلیمات معائنے کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنے قومی کھیلوں کو بھی اپنانا چاہیئے مثلاً کبڈی۔ بس پھر کیا تھا۔ میں کبڈی کے میدان میں کود پڑا۔ اس کھیل میں اتنی مہارت پیدا کی کہ سکول کی کبڈی ٹیم کے ساتھ دُور دُور جانے لگا۔ سکول والے مجھے کبڈی کا چیمپئن کہا کرتے تھے۔ ابھی میں سکول کا طالب علم ہی تھا کہ جوڈو کراٹے کا رواج شروع ہوا۔ دراصل شروع شروع میں اداکار بروس لی کی فلموں کی وجہ سے جوڈو کراٹے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مارشل آرٹ زمانۂ قدیم سے جاپان اور مشرقِ بعید کے دوسرے ملکوں میں موجود تھا مگر اسے دنیا بھر میں معروف اور مقبول بنانے میں اداکار بروس لی اور اس کی فلموں کا نمایاں حصہ ہے۔

ہمارے سکول میں ایک نئے فزیکل ٹریننگ کے ٹیچر مسٹر محمود آئے۔ وہ جوڈو کراٹے جانتے تھے۔ چھ سات سال جاپان اور ہانگ کانگ میں رہ چکے تھے اور انہوں نے یہ فن جاپانی استادوں سے سیکھا تھا۔ میں ایک دن اُن کے گھر پہنچ گیا اور درخواست کی کہ وہ مجھے سکول کے اوقات کے بعد بطورِ خاص جوڈو کراٹے سکھائیں۔ محمود صاحب نے میرا شوق دیکھا تو رضامند ہو گئے۔ سکول سے چھٹی ہونے کے بعد میں ان کے گھر چلا جاتا۔ اور وہ دن ڈھلے تک مجھے جوڈو کراٹے اور کنگ فو کی مشق کراتے۔ پھوپھی حمیدہ کو میرے دیر سے گھر آنے کا سبب معلوم ہوا تو ماسٹر محمود کے گھر پہنچ گئیں۔ "ماسٹر جی، یہ آپ لڑکے کو کیوں دیوانہ بنا رہے ہیں؟ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔ سارا سارا دن جوڈو کراٹے سیکھے گا تو پڑھے گا کس وقت"؟

ماسٹر محمود نے انہیں سمجھایا کہ بی بی یہ لڑکا اسی قسم کے مردانہ کھیلوں کے لیے پیدا ہوا ہے۔ آپ اس کی حوصلہ شکنی کریں گی تو اس کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔ میرا یقین نہیں تو کسی ڈاکٹر سے پوچھ لیجئے۔ کافی دیر کی بحث و تمحیص کے بعد پھوپھی نے بات مان لی۔ مگر یہ طے پایا کہ میں دو گھنٹے سے زیادہ دیر جوڈو کی مشق نہیں کروں گا۔ ماسٹر محمود نے واقعی کسی بہت اچھے استاد سے تربیت لی تھی جو انہوں نے مجھے منتقل کر دی۔ اُن سے حاصل کی ہوئی تربیت آگے چل کر عملی زندگی میں قدم قدم پر میرے کام آئی۔ آگے چل کر میں نے اپنی زندگی میں بہت سے بلیک بیلٹ اور ریڈ بیلٹ دیکھے اور اُن سے زور آزمائی کا موقع بھی ملا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماسٹر محمود کے جاپانی استاد نے انہیں جو گُر سکھائے تھے۔ وہ بہت سے بلیک بیلٹ بھی نہیں جانتے تھے۔

خدا خدا کر کے میں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھوپھی کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ دیر تک مجھے بتاتی رہیں کہ میرے ابّو کس طرح ہمیشہ جماعت میں اوّل رہا کرتے تھے۔ "شاباش بیٹے، خوب باپ کا نام روشن کرو گے"؟

میں نے اِن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ گود میں اٹھا کر دو تین چکر دیے تو لگیں شور مچانے: "ارے شریر کیا کرتا ہے؟ گر جاؤں گی"! اس طرح جب ان کا غصہ کچھ کم ہوا تو میں نے انہیں آرام سے پلنگ پر بٹھا دیا اور سمجھایا کہ دیکھو پھوپھی۔ ہر شخص ہر کام نہیں کر سکتا۔ مانا کہ ابّو کی بہت سی خوبیاں میرے اندر موجود نہیں ہیں مگر ہو سکتا ہے میرے اندر بھی کچھ ایسی خوبیاں ہوں جن سے

میرے ابّو محروم ہی رہے ہوں۔ اس کے باوجود میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ابّو کا نام روشن کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ چاہے اس کوشش میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

"خدا نہ کرے"۔ وہ گھبرا گئیں: "کیسی بری فال منہ سے نکال رہا ہے"۔

میں نے کہا: "پھوپھی۔ یاد ہے ابّو کیا کہا کرتے تھے؟ وہ چاہتے تھے میں فوجی بنوں۔ وطن کی خاطر دشمنوں سے لڑوں۔ سرحدوں کی حفاظت کروں"۔ پھوپھی پریشان ہو گئیں۔ منت سے کہنے لگیں۔

"میرے بیٹے ملک کی خدمت کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ تم فوج میں جانے کا خیال دل سے نکال دو"۔

کیا بتاؤں اِس موضوع پر کتنا جھگڑا ہوا؟ میں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ پھوپھی سے بات چیت بند کر دی۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رکھی: "میں فوج میں جاؤں گا۔ نہیں تو بھوکا مر جاؤں گا"۔ ظاہر ہے کہ پھوپھی اس لڑائی میں ہار گئیں۔ انہیں تو ہارنا ہی تھا میری کوئی ضد وہ ٹال ہی نہیں سکتی تھیں۔ فوج سے انہیں ڈر لگتا تھا مگر میری خوشی بھی انہیں بہت عزیز تھی۔ دراصل انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ فوج میں تو بہت جفاکشی اور سختی کی زندگی ہوتی ہے۔ میں بھلا کیسے یہ سختیاں جھیلوں گا؟ مزے کی بات یہ ہے کہ پھوپھی کو ایک لمحے کے لیے بھی خود ایک خیال نہیں آیا۔ انہوں نے ایک پل کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ میں فوج کی نوکری پہ جاؤں گا۔ تو وہ تنہا کیسے رہیں گی؟ ان کی ضرورتیں کون پوری کرے گا۔ بڑھاپے میں کون اِن کا سہارا بنے گا۔ بس یہی تو پھوپھی کی صفت تھی۔ وہ اپنے بارے میں تو کبھی سوچتی ہی نہ تھیں۔ انہیں بس میری ہی فکر رہتی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہو گا کہ پھوپھی حمیدہ نے ساری زندگی شادی کی اور نہ ہی کبھی اپنی شادی کرنے کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے تو اپنی زندگی، اپنی جوانی، اپنی تمام تر آرزوئیں اور امنگیں میرے لیے وقف کر دی تھیں۔ میرے سوا دنیا کی کسی اور چیز سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ چوبیس گھنٹے ان کے لبوں پر صرف ایک ہی دعا تھی: "خدایا۔ میرے بچے کو خوش اور آباد رکھنا۔ اسے اپنی امان اور حفاظت میں رکھنا"۔

یکایک کمرے کے باہر بہت دُور سے بجلی کوندی اور پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ میں چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ کھڑکی میں سے باہر کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ گرج چمک کے بعد اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً سردی میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہو گا۔ خیالات کے بھنور سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ نہ جانے کب ختم ہو گیا تھا اور روزی کسی وقت دوسرا پیکٹ بھی میز پر رکھ کر چلی گئی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں اتنا گم تھا کہ اس کی آمد و رفت کا مجھے علم نہ ہو سکا اور اُس نے بھی حسبِ عادت مجھے ڈسٹرب کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میرا کمرہ برقی ہیٹر کی حرارت کی وجہ سے خوشگوار حد تک گرم تھا لیکن ہر طرف سگریٹوں کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پہاڑوں کی دھند میرے کمرے میں بھی در آئی ہے۔ دھوئیں کی شدت سے خود میرا بھی دم گھٹنے لگا اور میں نے آگے بڑھ کر ایک عقبی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور ایک پٹ کھول دیا۔ سرد، یخ بستہ ہوا کا ایک تیز تھپیڑا میرے چہرے پر لگا۔ مجھے احساس نہ تھا کہ باہر اتنی زیادہ سردی ہے۔ ایک لمحہ میں کمرہ برف خانہ بن گیا۔ میں نے پریشان ہو کر کھڑکی بند کرنے کا ارادہ کیا اور اسی وقت میری نظر میرے بنگلے کے گیٹ کے نزدیک درختوں سے ڈھکی پگڈنڈی پر کھڑی ایک سفید رنگ کی کار پر پڑی۔

میرے بنگلے کے اردگرد دُور دُور تک کوئی اور مکان یا کوٹھی نہیں تھی تو پھر یہ کار کس کی ہے اور میرے گیٹ کے نزدیک کیوں کھڑی ہے؟ اتنے خراب اور تباہ کن موسم میں کسی مہمان کی آمد کا امکان بھی خارج از بحث تھا۔ اور اگر کوئی مہمان میرے گھر آیا بھی تھا تو روزی نے مجھے مطلع کیوں نہیں کیا؟ ہو سکتا ہے وہ میرے خیالوں کی محفل کو درہم برہم نہ کرنا چاہتی ہو!!! میں نے عقبی کھڑکی کا پٹ دوبارہ مضبوطی سے بند کیا تاکہ سرد ہوا سے تحفظ مل سکے اور پھر خاموشی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ گیلری سے گزر کر میں اُن چوبی سیڑھیوں تک پہنچ گیا جو نیچے ہال کمرے میں جاتی تھیں۔ ہال کمرہ تاریک تھا کوئی متنفس تو کیا روشنی کا ایک بلب بھی وہاں روشن نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر کوئی مہمان ہمارے گھر میں آیا بھی تھا تو وہ اب تک اپنے بیڈروم میں پہنچ کر آرام کر رہا ہو گا۔ میں نے اُس کمرے کا رُخ کیا جو مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن نہ صرف کمرہ تاریک تھا بلکہ مقفل بھی تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے ایک دو بار دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کمرے میں کسی مہمان کے قیام کے کوئی آثار نہ تھے۔ میری تشویش میں اضافہ ہوگیا۔ میں دوبارہ ہال کمرے کی سیڑھیوں پر پہنچا۔ ایک نامعلوم خوف کے احساس نے میرے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اور روزی کو پکارا۔

میں جانتا تھا کہ روزی اپنے کمرے میں جاگ رہی ہوگی۔ وہ میری پہلی آواز پر بھاگی ہوئی آجاتی تھی۔ مگر میری آواز کے جواب میں میں نے کوئی صدا نہیں سُنی۔ میں تیزی سے سیڑھیوں سے اُترا اور روزی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ روزی کا کمرہ میرے کمرے کے عین نیچے تھا۔ ہال کمرے میں پہنچ کر ایک مختصر سی گیلری سے گزرنے کے بعد روزی کے کمرے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گیلری بالکل تاریک تھی اور روزی کے کمرے میں بھی روشنی نہ تھی۔ میں ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھک کر وہیں رُک گیا۔ میری چھٹی حس گھر میں تیسرے ذی روح کی موجودگی سے باخبر کر رہی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ روزی کی زندگی خطرے میں تھی۔

میں تیزی سے گیلری سے گزرتا ہوا روزی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اپنے کمرے کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔ یکایک مجھے اپنی پُشت پر ایک آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے پلٹا مگر میرے پلٹ کر دیکھنے سے پہلے کوئی آہنی چیز میرے سَر پر لگی۔ میں ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بَل گرا۔ مجھے بھاگتے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے تجربے کی روشنی میں حملہ آور نے پستول کے دستے سے میرے سَر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اس وقت خاک چاٹ رہا ہوتا۔ مگر میری سخت جانی میرے کام آئی۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہال کمرے کے دروازے کی طرف لپکا۔ تاریکی کے باوجود مجھے ایک ہیولا دروازے کے باہر جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں بے تحاشہ اس کے تعاقب میں لپکا۔ ایک لمبی زقند کے بعد میں دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ دروازہ بہت زور دار دھماکے کے ساتھ بند ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید حملہ آور نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا ہو۔ لیکن اس کے پاس بھی مہلت نہ تھی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ عُجلت میں تھا۔ اسی لیے دروازہ لاک نہ کرنے کی حماقت اس سے سرزد ہوئی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ہی بھیگی ہوئی تیز ہوا کا تھپیڑا میرے چہرے پر لگا۔ میری آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ باہر موسلادھار بارش جاری تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ایک شخص کو گیٹ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل کر قریبی پگڈنڈی پر کھڑی ہوئی سفید کار کی طرف لپک رہا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے نائٹ گاؤن کی جیب میں گیا۔ جہاں عادتاً ہر وقت ایک بھرا ہوا پستول موجود ہوتا ہے۔ پستول پر میری انگلیوں کی گرفت مضبوط تھی۔ آگے جانے کا نہ وقت تھا نہ موقع۔ میں نے پستول ہاتھوں میں تول کر نشانہ لیا مگر اس سے پہلے کہ فائر کرتا مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کوئی وزنی شے میرے سَر پر گری اور اپنی تمام تر قوتِ ارادی کے باوجود میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس وقت بھی جو پہلا خیال میرے خوابیدہ ذہن میں آیا وہ روزی کا تھا! روزی کہاں ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟ اگر زندہ ہے تو کس حال میں ہے؟!! پھر اس کے بعد مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا تو میں نے روزی کا پریشان اور متفکر چہرہ اپنے اُوپر جُھکا ہُوا پایا۔ اس کی حسین نیلی آنکھوں میں بے چینی اور تشویش کی لہریں تھیں۔ سُرخ و سفید رنگت پیلی پڑی ہوتی تھی۔ اس کی بکھری ہوتی سنہری زلفیں اس کے چہرے پر ہالہ کیے ہوتے تھیں۔ اس کی زُلف کی چند لٹیں میرے چہرے پر بھی سایہ فگن تھیں۔ میں دیکھ سکتا تھا، آوازیں سُن سکتا تھا لیکن ابھی سوچنے سمجھنے کی طاقت سے محروم تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اِس سے پہلے میں کہاں تھا اور مجھ پر کیا بیتی تھی؟ لیکن رفتہ رفتہ میری حسیات نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں روزی کی زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو اور اس کے جسم کی مخصوص مہک سُونگھ رہا تھا۔ اِس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوتے دیکھا تو خوشی کی روشنی اِس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اِس کی آنکھیں جگمگانے لگیں اور اس کے نیم وا خشک لب جو میرے چہرے پر محض چند انچ کے فاصلے پر تھے مُسکرا اُٹھے۔ "خُدا کا شکر ہے آپ ہوش میں آگئے!" اس نے میرے ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام کر چُوم لیے اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر میرے ہاتھوں کو تر کرنے لگے۔ شاید اس کے آنسوؤں نے ہی میرے

ہوش وحواس واپس لانے کا فریضہ ادا کیا۔ میری یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی طاقت واپس آرہی تھی۔ معاً مجھے یاد آگیا کہ رات گئے میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ پُراسرار سفید کار۔ ایک ہیولا جو تاریکی میں میرے بنگلے سے نکل کر باہر جا رہا تھا۔ میں نے جب پستول سے فائر کرنا چاہا تھا تو میرے سر کے پچھلے حصے پر لگنے والی ضرب نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ اپنے ہاتھوں پر گئی پستول میرے ہاتھ میں نہ تھا۔ اس کی جگہ روزی کے ملائم ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو اپنی جکڑ میں لے رکھا تھا۔ وہ دیوانہ وار میرے ہاتھوں کو چُوم رہی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ میں یکایک مسکرانے لگا۔ روزی مجھے مسکراتے ہوتے دیکھ کر فکر مند ہو گئی۔ شاید وہ میری ذہنی کیفیت کے بارے میں متفکر تھی۔ لیکن درحقیقت اِس وقت میں خود اپنے ہی ایک خیال کو یاد کر کے مسکرایا تھا۔ میں روزی کی نیلی جھیل جیسی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی سفید رنگت دیکھ کر اکثر مسکرایا کرتا تھا۔ اتنی گہری نیلی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کا رنگ بھی نیلا یا آسمانی ہونا چاہیئے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

میں نے سر ہلانا چاہا۔ مگر میرا سر سیسے کی طرح وزنی اور ٹھوس ہو رہا تھا۔ درد کی ایک لہر سر اور گردن سے گزرتی ہوتی میرے سارے جسم میں پھیل گئی۔ میں آہستہ سے آہ بھر کر رہ گیا۔

"کیا ہوا آپ کو؟ کہیں تکلیف ہے؟" اُس نے پوچھا۔ تشویش اُس کے چہرے پر پھیلی ہوتی تھی۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو مجھے خود اپنی آواز بیگانی سی محسوس ہوتی۔ یہ ایک دبی ہوتی سرگوشی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اور کی آواز سُن رہا ہوں۔ "ٹھیک ہوں مگر....."

اب میں رفتہ رفتہ اپنے جسم میں توانائی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اِس وقت میں ڈرائنگ رُوم کے قالین پر دراز تھا۔ میرے شانے اور بالائی جسم روزی کے زانو پر تھا اور وہ خُدا جانے کب سے مجھ پر جُھکی ہوتی پریشانی اور تشویش کا تنِ تنہا مقابلہ کر رہی تھی۔ اُس کی بھیگی ہوتی نیلی آنکھوں پر سایہ فگن لمبی پلکوں کی نمی مجھے ہمیشہ کسی جھیل پر جُھکے ہوتے شبنم آلود پتوں کی یاد دلاتی ہے۔ اِس وقت بھی میں اس شاعرانہ تصور سے باز نہ رہ سکا۔ دراصل قدرت نے میری سرشت میں مہم جوئی اور معرکہ آرائی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ نرمی اور لطافت بھی شامل کر دی ہے۔ آتش و گُل کے اس امتزاج نے میری طبیعت میں ایک مسلسل بے سُکونی اور بے اطمینانی پیدا کر رکھی ہے۔ میں ایک سادہ صفت انسان ہوں۔ ایک لمحہ کا سُکون اور ٹھہراؤ بھی مجھے نصیب نہیں ہے اور نہ گوارا! شاید یہ کسی فقیر کی بددُعا کا اثر ہے۔ میرے دوست شوکت کا بھی یہی خیال ہے۔

میں ان خیالوں میں گُم تھا اور غالباً روزی یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اپنی قوتِ گویائی اور حافظہ کھو بیٹھا ہوں۔ اُس نے مجھے زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"یوسف۔ یوسف۔ خُدا کے لیے ہوش میں آؤ۔ تم میری آواز سُن رہے ہو نا؟ تم مجھے دیکھ سکتے ہو یا نہیں؟ جواب دو۔ بولتے کیوں نہیں

میں نے آہستہ سے جواب دیا "میں اب بہتر ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے جسم کو سمیٹا اور کہنیوں کے بل اُوپر کی جانب اُٹھنے کی کوشش کی۔

مجھے اب احساس ہوا کہ صرف میرا سر ہی روزی کے زانو پر نہ تھا بلکہ اس نے تمام میرے جسم کا بوجھ اپنے نازک اور ملائم جسم پر سہار رکھا تھا۔ میں اُوپر کی طرف اٹھا تو میرا سر اُس کے سر کے متوازی آگیا۔ اب میں معمول پر آچکا تھا۔ سر میں ہلکے سے بوجھ اور درد کے علاوہ اب مجھے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"رُکیے۔ میں آپ کے لیے گرم دُودھ لے کر آتی ہوں۔"

اُس نے نہایت نرمی سے میرے جسم کا بوجھ اپنے اُوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ یوں جیسے میں شیشے کا بنا ہوا آدمی ہوں اور ذرا سی بھی ٹھیس لگی تو ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔ یہ لڑکی خُدا جانے مجھے اتنا نرم و نازک کیوں سمجھتی ہے؟ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہتی ہوتی تیز رفتاری سے کچن کی طرف چلی گئی۔ میں اب اپنی کہنیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ روزی کا سہارا نہ رہا تو میں نے اپنے جسم کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ میں بالکل صحیح سلامت ہوں۔ میں نے اپنی قالین پر پھیلی ہوتی ٹانگوں کو سمیٹا۔ دوبارہ پھیلایا اور پھر سمیٹ لیا۔ کھسک کر میں نے قریبی صوفے

www.pdfbooksfree.pk

سے ٹیک لگائی اور پھر دونوں ہاتھ قالین پر ٹیک کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خفیف سا چکر آیا مگر پھر گرد و پیش کا نظارہ ساکت ہو گیا۔ خود میرا سر بھی اب معمول پر آ چکا تھا۔ درد میں کمی تھی لیکن ذہن میں کسی قسم کی سنسناہٹ اور خالی پن کا احساس بالکل نہ تھا۔ میں نے اپنے بازو ہوا میں گھماتے اور انہیں دو تین بار واٹروں کی صورت میں حرکت دی۔ میرے ذہن اور جسم نے مجھے مطلع کیا کہ میں بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں۔ میں نے قالین پر چند پھیرے لگائے اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف دن کی روشنی پھیل چکی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے اور باہر دور تک کا حسین منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک پر نظر پڑی تو چھ بج رہے تھے۔ گویا میں قریب قریب تین گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا۔ اس دوران میں کیا کچھ ہوا اور روزی پر کیا بیتی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ مگر ایک تنہا، ویران گھر میں روزی نے یہ چند گھنٹے کس ذہنی اذیت کے ساتھ گزارے ہوں گے اس کا میں بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اور خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ اسے میری طرف سے بھی تشویش اور پریشانی لاحق ہو گی۔ میں نے سوچا روزی غریب میری خاطر کیسے کیسے امتحانوں سے گزرتی ہے۔ مگر پھر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ ایک بار پھر میں احساسِ تشکر اور روزی کے بارِ احسان میں ڈوب گیا۔

باہر کسی کار کے رکنے کی آواز آئی اور پھر تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یکایک برقی گھنٹی کی آواز گونجی تو میں چونک پڑا۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟ دوست یا دشمن؟ مگر میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے شوکت کھڑا تھا۔ میرا جگری دوست، بھائیوں سے زیادہ عزیز اور خونی رشتے داروں سے زیادہ مخلص اور بے لوث۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ عام طور پر وہ ایک خوش پوش اور نفاست پسند شخص ہے لیکن اس وقت وہ سلیپنگ سوٹ اور گون پہنے ہوئے تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ فوری طور پر میرے بارے میں روزی کا فون سن کر جس حالت میں تھا اسی طرح چلا آیا ہے۔ "یوسف" وہ چلایا۔ اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا اور پھر بے تحاشا مجھ سے لپٹ گیا۔ "کیا ہو گیا تھا تمہیں؟ کون تھا جو یہاں آیا تھا؟" پھر اس نے مجھے اپنے جسم سے علیحدہ کیا اور ایک بار پھر بغور میرا معائنہ کیا۔ "کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ روزی نے فون پر بتایا تھا کہ تم بے ہوش ہو۔ وہ تو بہت زیادہ اپ سیٹ تھی۔"

میں اس کی بے تابی پر مسکرا دیا۔ اس کا والہانہ جذباتی پن مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔ میں نے کہا "مطلق ہو جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اتنے ڈھیر سارے سوال ایکدم کر دیتے ہیں کہ میں جواب بھی نہیں دے سکتا۔ اندر تو آ کر بیٹھو۔" یہ کہہ کر میں اس کی گردن میں بازو ڈال کر اسے کھینچ کر صوفے تک لے گیا۔ اسی وقت روزی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا مگ تھا اور چہرے پر سوال مگر شوکت کو دیکھ اس کی تشویش اطمینان میں بدل گئی۔

"ہیلو روزی۔ کیا حال ہے تمہارا۔ تم نے تو فون پر مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" شوکت اس سے مخاطب ہوا۔ روزی ہمارے نزدیک آ گئی۔ "پتہ بھی ہے تمہیں یہاں کیا ہو گیا؟ خدا کا شکر ہے کہ یوسف بالکل ٹھیک ہیں۔ ورنہ میں تو بالکل گھبرا ہی گئی تھی۔"

"بھئی گھبرانے کی بات بھی ہے۔" میں نے ماحول کی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے مزاحیہ لہجے میں کہا: "بالکل فلمی سچوایشن پیش آئی ہے ہمارے ساتھ۔" پھر میں نے مختصراً شوکت کو رات کا واقعہ بتایا۔ ساتھ ہی میں گرم دودھ کے گھونٹ بھی لیتا جا رہا تھا۔

"اب تم بتاؤ۔ تمہارا بیان کیا ہے؟" وہ روزی کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہی تھی۔ اچانک مجھے ایک آہٹ سنائی دی۔ میں سمجھی کہ یوسف کو کسی چیز کی ضرورت پیش آئی ہے۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آئی۔ مگر برآمدے میں پہنچی تو یکایک کسی نے میرے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت بہت کڑی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کی۔ ہاتھ پیر مارے۔ اس کے ہاتھ کو کاٹنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ کوئی غیر معمولی طاقت والا آدمی تھا۔ اس نے میری ناک پر ایک بدبودار رومال رکھ دیا۔ میرا ذہن سونے لگا اور چند ہی لمحے بعد مجھے کچھ احساس باقی نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو ان کی گیلری میں تاریکی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ میں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں نے اٹھ کر روشنی جلائی۔ ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی تو فرش پر یوسف کو پڑا ہوا دیکھا۔ یہ اس انداز سے گرے ہوئے تھے کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں لپک کر ان کے پاس گئی۔ ان کی سانس معمول کے مطابق تھی مگر یہ بے ہوش تھے۔ شکر ہے کہ جسم یا چہرے پر کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر اٹھانے

کی کوشش کی مگر یہ بے سدھ پڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اور دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ "فکر نہ کرو روزی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم سب زندہ سلامت ہیں۔"

چند لمحے بعد اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا تو بتایا کہ گھبرا کر اسے اس کے علاوہ کچھ اور نہ سوجھی کہ شوکت کو فون کر کے بلائے۔ شوکت کسی کام کے سلسلے میں ایک قریبی شہر میں گیا ہوا تھا۔ اس کا مجھے اور روزی دونوں کو علم تھا۔ روزی نے ایک بڑے ہوٹل کا نمبر ملایا اور خوش قسمتی سے شوکت وہاں مقیم تھا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شوکت کو فوراً گھر آنے کی تاکید کی اور فون بند کر کے میری طرف متوجہ ہوئی۔ میری سانسیں معمول کے مطابق تھیں۔ بظاہر میں بالکل ٹھیک تھا مگر ہوش سے قطعی بیگانہ۔ یہ چند گھنٹے روزی کے لیے مہینوں سے زیادہ بھاری تھے۔ وہ رو رہی تھی اور دعائیں کر رہی تھی۔ اس کے سوا اسے کچھ اور نہیں سوجھ رہا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اس کے دم میں دم آیا۔

یکلخت شوکت صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تمام حسیات کام کرنے لگیں۔ اس نے فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ پھر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اوپر میرا کمرہ بالکل اسی حالت میں تھا جس میں اسے میں نے گزشتہ رات چھوڑا تھا۔ سگریٹوں کے ٹوٹے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے سوا کمرے میں کوئی اور خاص بات نظر نہ آئی۔ ہم لوگ دوبارہ گیلری میں آئے۔ ہال کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی علامت، کوئی نشانی ایسی نظر نہ آئی جو کسی غیر شخص کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتی ہو۔ نیچے گیلری میں روزی کے کمرے کے باہر بھی کسی قسم کی کوئی علامت نہیں تھی۔ میں نے شوکت کو سفید رنگ کی کار کے بارے میں بتایا۔ ہم دونوں گھر سے باہر نکل کر درختوں کے جھنڈ کی طرف گئے جہاں رات گئے میں نے وہ پارک کھڑی ہوئی دیکھی تھی۔ پھر میں نے شوکت کو اس ہیولے کے بارے میں بتایا جسے میں نے کار کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شوکت اس شخص کا حلیہ اور قد و قامت معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "حلیہ تو ظاہر ہے کہ میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اتنے فاصلے سے قد و قامت اور جسامت کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کا قد تمہارے برابر ہو گا۔"

شوکت سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دیر تک مجھ سے سوالات کرتا رہا لیکن ہم دونوں کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ گھر کی کوئی قیمتی شے بھی گم نہیں ہوئی تھی۔ روزی کی ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں اس کے زیورات کا ڈبہ بالکل حفاظت سے تھا۔ کسی نے اسے چھوا تک نہ تھا۔ تو پھر وہ کون لوگ تھے اور یہاں کس لیے آئے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ ایک سے زائد اشخاص تھے۔ کیونکہ میں نے ایک شخص کو کار کی طرف لپک کر جاتے ہوئے دیکھا تھا اور جب میں نے اسے گولی کا نشانہ بنانا چاہا تو کسی شخص نے میرے سر پر بھرپور ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے جان سے مار دینا چاہتا ہو؟ لیکن اگر اس کا یہی ارادہ تھا تو پھر مجھے قتل کرنے کی راہ میں کون سی رکاوٹ حائل تھی۔ روزی کو وہ پہلے ہی بے ہوش کر چکے تھے۔ مجھے بھی انہوں نے بے دست و پا کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ہلاک کیوں نہیں کیا؟ نہ وہ روزی کو مارنا چاہتے تھے اور نہ ہی مجھ کو جان سے مارنے کے خواہاں تھے۔ تو پھر ان کا مقصد کیا تھا؟

کافی دیر تک ہم تینوں بیٹھے اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ اس دوران میں روزی ہمیں گرم گرم چائے اور کافی لا کر دیتی رہی۔ اس نے کھانے کی پیشکش بھی کی تھی۔ مگر بھوک ہم تینوں میں سے کسی کو بھی نہیں تھی۔ یہ ایک لاینحل مسئلہ تھا جو ہماری عقل و فہم سے بالاتر تھا۔ شوکت نے ابھی تک اپنی بیوی نسیم کو اپنے یہاں آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ میرے زور دینے پر اس نے نسیم کو فون کر کے بلا لیا اور لگ بھگ نصف گھنٹے بعد وہ بھی پہنچ گئی۔ نسیم ایک خوب رو لڑکی تھی۔ شوکت اور اس کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے۔ جب پہلی مرتبہ شوکت مجھے ملا تھا اس وقت بھی وہ شادی شدہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ نسیم اس کی کزن تھی۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ شوکت ہی کے گھر میں پلی تھی۔ ماں باپ کی وفات کے بعد شوکت کے باپ نے نسیم کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی اور یہی وجہ ہے کہ اپنے باپ کی وصیت اور خواہش کے مطابق شوکت نے نسیم سے شادی کر لی۔ اگر باپ کی وصیت اور خواہش نہ ہوتی تب بھی شوکت کو نسیم کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نسیم ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور خوش شکل لڑکی تھی۔ عمر میں وہ شوکت سے تین چار سال چھوٹی تھی لیکن دیکھنے میں کافی کم عمر لگتی تھی۔ اس کا قد دراز اور جسم انتہائی متناسب تھا۔ اس پر ایک کم عمر دوشیزہ کا گمان گزرتا تھا۔ اگرچہ وہ شوکت سے خاصی مانوس اور بے تکلف تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمیشہ ان دونوں کے مابین ایک فاصلہ اور دوری محسوس کی۔ وہ شوکت کو ہمیشہ آپ سے مخاطب کرتی تھی۔ اس کی ہر بات غور سے سنتی

www.pdfbooksfree.pk

اور اس کی تعمیل کرتی۔ عام طور پر میاں بیوی کے درمیان جس قسم کی گفتگو اور ہنسی مذاق ہوتا ہے میں نے کم از کم کسی دُوسرے کے سامنے اُن دونوں کو اس قسم کی گفتگو کرتے ہوتے کبھی نہیں سُنا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ تنہائی میں یہ فاصلے مٹا دیتے ہوں لیکن کسی تیسرے فرد کی موجودگی میں انہوں نے کبھی ایک خاص حد سے زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کو چار سال گزر جانے کے باوجود وہ اولاد سے محروم تھے۔ اگرچہ نسیم کو میں نے چھوٹے بچوں سے بہت زیادہ مانوس پایا۔ اسے بچوں سے خاص لگاؤ تھا۔ بچوں کے شور و غل کو وہ پسند بھی کرتی تھی مگر وہ خود اولاد سے محروم تھی۔ اس بارے میں اس کا نظریہ بہت فلسفیانہ تھا۔ وہ ہنس کر کہتی "بچوں کا کیا ہے؟ جب اللہ میاں چاہے گا دے دے گا۔"

نسیم اور روزی کو میں نے ذہنی طور پر ایک دُوسرے سے بہت نزدیک پایا۔ اکثر وہ بہت معنی خیز انداز میں ایک دُوسرے کو مخاطب کرتیں اور اُن کی نگاہوں کا باہمی تبادلہ بہت گہرا اور بامقصد ہوا کرتا تھا۔ میں نے بارہا انہیں ایک دُوسرے سے کانا پھُوسی کرتے ہوتے دیکھا مگر مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے کبھی کبھی یوں لگتا جیسے ان دونوں کے مابین کوئی گہرا راز ہے جسے وہ دُوسروں سے چھُپا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ روزی کے سامنے میں اس خیال کا اظہار کرتا تو وہ ہنس پڑتی اور کہتی۔ "آپ مرد بہت حاسد ہوتے ہیں۔ دو عورتوں کی باہمی دوستی کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ عورتوں کی باتوں کے موضوع بے شمار ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بار دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے تو ان کے تمام باہمی راز مشترک ہو جاتے ہیں۔" پھر وہ شرارت سے مسکراتی اور اپنے مخصوص انداز میں دانتوں میں ہونٹ دبا کر کہتی "ٹھیک تو ہے۔ نسیم کے اور میرے بیچ میں ایک بہت بڑا راز ہے جو میں نے آپ سے چھُپا کر رکھا ہے۔ جس دن وہ راز آپ کو معلوم ہو گیا آپ مجھے کسی اور نظر سے دیکھنے لگیں گے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ محض چھیڑ خانی ہے۔ ان دونوں کے مابین چند بے ضرر قسم کے احمقانہ رازوں کے سوا اور کیا راز ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ایک دُوسرے کی قریبی سہیلیاں تھیں اور عورتوں کی سرشت کے مطابق ان کی باتیں کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

شوکت کا خیال تھا کہ ہمیں اس واقعے کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے مگر میں اسے ایک غیر ضروری کارروائی سمجھتا تھا۔ پولیس اِس معاملے میں کیا مدد کر سکتی تھی؟ سوائے اس کے کہ اپنے سوالات اور تفتیش سے ہمارا ذہنی اور گھریلو سکون درہم برہم کر دے۔

"پھر بھی یہ بہت اہم اور خطرناک بات ہے۔" شوکت نے اصرار کیا "اس کا کوئی تو حل ہونا چاہیے۔ وہ لوگ بلا مقصد تو یہاں نہیں آئے ہوں گے نا!"

"مگر ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے چوری نہیں کی۔ کسی سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

"تو پھر انہوں نے روزی کو بے ہوش کیوں کیا؟" نسیم کا سوال خاصا وزنی تھا۔ "اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص ارادہ لے کر یہاں آتے تھے۔"

"مگر ان کے ارادے کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ کیا تھی؟ ہم دونوں تو بے ہوش ہو چکے تھے۔ وہ جو چاہے کر سکتے تھے۔"

اِس طرح یہ بحث دوبارہ زور شور سے شروع ہو جاتی مگر ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ روزی نے یہ اطلاع دے کر ایک اور تشویش پیدا کر دی کہ اُسے کبھی کبھی گمنام ٹیلی فون موصول ہوتے ہیں۔ فون کرنے والا لمبی سانسیں لینے کے علاوہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ اس کے انکشاف پر مجھے یاد آیا کہ میں نے چند بار گھر میں داخل ہو کر روزی کو ٹیلی فون سنتے ہوتے پایا تھا۔ مگر میرے دریافت کرنے پر وہ یہی کہتی تھی کہ رانگ نمبر مل گیا ہے۔ شاید وہ مجھے خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی ٹیلی فون پر گمنام کالیں ہمارے مُلک میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔

"معلوم ہوتا ہے روزی کا کوئی بوائے فرینڈ ہے جو اِس کو تنگ کرتا رہتا ہے۔" نسیم شرارت سے مسکرا کر بولی۔

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ روزی یوسف سے چھُپ چھُپ کر اپنے بوائے فرینڈ سے باتیں کرتی رہتی ہے اور یہ رانگ فون کال کا بہانہ کر دیتی ہے۔" شوکت نے بات بڑھائی۔

"لو پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے کہا "ظاہر ہے کہ رات کو بھی میں نے جسے دیکھا وہ روزی کا بوائے فرینڈ ہی ہو گا اور مُلاقات کے لیے آیا ہو گا۔"

روزی بھلا کیوں خاموش رہنے والی تھی۔ کہنے لگی "مگر آپ یہ بھُول گئے کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی اُس کے ساتھ تھا جس نے آپ

www.pdfbooksfree.pk

پر حملہ کیا تھا۔"

اس طرح ہم چاروں قیاس آرائیوں کے محل بناتے اور مسمار کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی سُود مند بات معلوم نہ ہو سکے تو ذہنوں کو سکون دینے کے لیے مسئلے کو مذاق ہی میں ٹالا جاتا ہے۔ ہم لوگ گہرے غور و خوض کے باوجود اس بات کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم چاروں نے ساتھ ہی کھایا اور اس کے بعد تاش کھیلتے رہے جو ہمارے معمول میں داخل تھا۔ عموماً چھٹی کے دن ہم چاروں اکٹھے ہو کر اسی طرح دن گزارہ کرتے تھے۔ رات کا سنگین واقعہ ایک بھولا ہوا خواب لگنے لگا۔ ہم ہنسی مذاق کرتے رہے اور شام کی چائے پینے کے بعد شوکت اور نسیم رخصت ہو گئے۔ شوکت تو جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ حفاظت کے طور پر رات میرے ساتھ ہی رہے مگر میں نے اس خیال کی مخالفت کی۔ رات کو جو کچھ بھی پیش آیا ظاہر ہے کہ بظاہر اس کے اعادے کا کوئی امکان نہیں تھا اور پھر اگلے دن صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے مجھے ایک ضروری کاروباری میٹنگ کے سلسلے میں روانہ ہونا تھا۔ جہاں کہیں سیلاتی کے ایک بہت منافع بخش ایگریمنٹ پر دستخط کرنے تھے۔ اس سے پہلے یہ طے پایا تھا کہ شوکت جس جگہ گیا ہوا تھا وہیں سے بذریعہ کار روانہ ہو کر مجھے مل جائے گا۔ لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ کوشش کے باوجود ہم شوکت کے لیے ہوائی جہاز میں نشست حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ تو یہ تصفیہ ہوا کہ شوکت آج رات ہی بذریعہ کار روانہ ہو کر دُوسرے دن صبح ہوٹل میں یا اِس کمپنی کے دفتر میں مجھ سے ملاقات کرے گا جہاں ہمیں معاہدے پر دستخط کرنے تھے۔ اگر وہ رات کو میرے ساتھ قیام کرتا تو وہ کسی طرح بھی میرے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہم دونوں بزنس پارٹنر تھے اس لیے کسی بھی معاہدے پر ہم دونوں کے دستخط ہونے لازمی تھے۔

"یار چھوڑو گولی مارو معاہدے کو۔" شوکت اپنے مخصوص لاپرواہی کے انداز میں بولا۔

"جان ہے تو جہان ہے۔ یار سلامت رہے۔ معاہدے ہزاروں ہو جائیں گے۔"

میں نے اِس کے جذبے کو سراہا اور پھر اسے یقین دلایا کہ واقعی مجھے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اِس نے مجھے گلے لگا کر بھینچا پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں روزی کو اپنے قریب کر کے اس کا رُخسار تھپتھپایا۔ روزی کے ساتھ شوکت کا رویہ بالکل برادرانہ تھا۔ وہ دونوں ایک دُوسرے سے نہ صرف بے تکلف تھے بلکہ ان کے درمیان رسمی فاصلہ بھی نہ تھا۔ ان دونوں کے باہمی میل ملاپ اور پیار کو دیکھ کر میں بہت تقویت حاصل کرتا تھا۔ نسیم کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ روزی کو شوکت کی شکل میں ایک بھائیوں سے بھی زیادہ قریبی اور مخلص ہمدرد مِلا ہوا ہے جو کسی بھی نازک موقعے پر اس کے لیے ڈھال بن سکتا ہے۔

شوکت اور نسیم کے رخصت ہونے کے بعد جب ہم دونوں ڈرائنگ روم میں گئے تو روزی کو گزشتہ رات کی یادوں نے آگھیرا۔ وہ میرے نزدیک آ بیٹھی۔

اُس کے حسین چہرے پر تفکرات کی لکیریں تھیں اور اُس کی نیلی آنکھیں سوچ میں ڈُوب کر اور زیادہ نیلی نظر آنے لگی تھیں۔ یہ روزی کی آنکھوں کا مخصوص انداز تھا۔ وہ جب بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبتی اُس کی آنکھوں کی رنگت اور زیادہ گہری ہو جایا کرتی تھی۔ اُس کی آنکھوں کو میں نے جھیل سے تشبیہ دی ہے تو اس کا یہ بھی ایک سبب تھا۔ میں نے روزی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں سمیٹ لیا۔ وہ سہمی ہوئی فاختہ کی طرح میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور میں اس کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سُن بھی سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا۔ اس لمحے وہ مجھے اتنی بے بس، مجبور اور بے سہارا نظر آئی کہ مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ میں دیر تک اسے تسلی دیتا رہا۔ اسے یقین دلاتا رہا کہ آیندہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ حالانکہ اپنے دل کی گہرائیوں میں مجھے خود بھی اس کا یقین نہ تھا۔ باہر سردی نے پھر رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں نے پس منظر موسیقی کی مانند ماحول پر سحر طاری کر دیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ عجیب سی پُراسرار قسم کی رومانوی فضا نے ہر شئے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایسے میں روزی کا خوشبو میں ڈوبا ہوا جسم مجھے وارفتہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں شادی کے بعد پہلی بار اپنے دل میں روزی کے لیے ایک لطیف جذبہ کروٹیں لیتا ہوا پا رہا تھا۔ آج تک اس کمزور اور نرم دل لڑکی کے ساتھ میں نے انصاف نہیں کیا تھا۔ جبکہ وہ میرے لیے سراپا خلوص اور ایثار تھی۔ میں نے روزی کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سُپردگی اور پیار کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ صبح ہونے میں دیر تھی اور میرے پاس روزی کے لیے کافی وقت تھا۔

علی الصبح سات بجے میں سفر کے لیے تیار تھا۔ روزی نے اصرار کر کے مجھے ہلکا سا ناشتہ کرا دیا تھا۔ رات کو ہماری نیندیں پوری نہ

ہو سکی تھیں اس کے باوجود وہ چاق و چوبند اور بالکل تر و تازہ تھی۔ میرے کوٹ کے کالر میں ایک خوش رنگ پھُول اور بالائی جیب میں خوشبودار رومال لگانے کے بعد اس نے محبت پاس نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر جیسے مطمئن ہو کر میرے بازو میں بازو ڈال کر گھر سے باہر نکل آئی۔ رات کو برف باری زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ موسم انتہائی دلفریب تھا۔ مکان کو لاک کرنے کے بعد ہم دونوں کار میں سوار ہوتے تو یوں لگا جیسے گزشتہ روز ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ روزی کا برتاؤ تو شروع سے ہی وارفتہ تھا لیکن آج پہلی مرتبہ میں بھی اپنے دل میں روزی کے لیے وہ جذبہ بیدار ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ ایئرپورٹ پر روزی نے مجھے ڈراپ کیا تو ہوائی جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ واپسی میں نسیم کو لازمی طور پر اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔ شام کو چار بجے کی فلائیٹ سے میری نشست بُک تھی اور روزی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نصف گھنٹے بیشتر ہی میری پذیرائی کے لیے کار سمیت ائیرپورٹ پر موجود تھی۔ ہوائی جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں روزی سے رخصت ہو کر تیزی سے ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھا مگر بار بار مڑ کر روزی کو دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں شادی کے بعد غالباً پہلی مرتبہ مجھے روزی پر پیار آ رہا تھا۔ اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔ لاؤنج کے مین دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا۔ روزی ابھی تک وہیں کھڑی ہوئی الوداع کہنے کے لیے بازو ہلا رہی تھی۔ گہرے عنابی رنگ کے لباس میں وہ حُسن و رعنائی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا سفید سکارف تیز ہوا سے لہرا رہا تھا اور اس کی زلفیں ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے بِکھر کر اس کے چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھیں۔ اس لمحے میں نے دل میں ایک فیصلہ کیا۔ میں آئندہ روزی کے ساتھ بے اعتنائی نہیں برتوں گا۔ اس کی وفاؤں کا اُسے قرار واقعی صلہ دوں گا۔ اس کی محبت، ایثار اور بے لوثی کی قدر کروں گا۔ یُونہی چلتا ہوا میں لاؤنج میں پہنچ کر مسافروں کی اُس قطار میں شامل ہو گیا جو طیارے میں سوار ہونے کے لیے کمر بستہ تھی۔

یہ فضائی سفر محض سوا گھنٹے کا تھا۔ باہر موسم کی حشر سامانی کے باوجود فلائٹ بہت ہموار تھی۔ کافی کی ایک پیالی میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اچانک میرے اندر اس عظیم تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ میں یک بیک روزی کی طرف مائل کس طرح ہو گیا ہوں؟ کیا اِس حادثے نے مجھے اس کے اتنا نزدیک کر دیا ہے؟ پھر مجھے شوکت کا خیال آیا۔ وہ اس وقت اپنی کار میں منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہو گا۔ ہم دونوں کو امپیریل ہوٹل میں یکجا ہونا تھا۔ معاہدے کے بارے میں ضروری کاغذات اور دوسری دستاویزات شوکت کی تحویل میں تھیں۔ اسی لئے میں اتنا ہلکا پھلکا ہو کر سفر کر رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک مختصر بریف کیس نہیں تھا۔ "اور کافی لیں گے؟" میں نے ایئرہوسٹس کی نرم آواز پر چونک کر دیکھا۔ میرے سَر ہلانے پر اس نے پیالی میں مزید کافی ڈال دی۔ دودھ اور چینی سے میں نے انکار کر دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ بھاپ اُڑاتی ہوئی سیاہ کافی میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں ایک تجارتی فضائی سفر کر رہا تھا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے ایک اپنا اور فضائی سفر یاد آ گیا۔

یہ سفر سراسر مختلف نوعیت کا تھا۔ یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے جب فوج میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد میں اپنے شوقِ مُہم پسندی اور سخت کوشی کی وجہ سے کمانڈو کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ یہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ پھوپھی حمیدہ نے میرے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے فوج میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ فوجی تربیت کا عرصہ پَر لگا کر گذر گیا میں نے ہر تربیتی کورس میں امتیازی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ جب مجھے کمانڈو یونٹ میں شامل ہونے کا موقعہ ملا تو میں نے اسے نعمتِ غیر مترقبہ خیال کیا تھا۔ کمانڈو فوج کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کا دوسرا نام جاں نثاری اور سرفروشی ہوتا ہے کمانڈو کو ہر قسم کے مشکل سے مشکل کام کی تربیت دی جاتی ہے۔ بہت سے سخت جان لوگ اس تربیت کے دوران ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور کمانڈو بننے کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں مگر مجھے کوئی مشکل درپیش نہیں ہوئی۔ میرے ساتھیوں نے میرا نام DARE DEVIL (بے خوف شیطان) رکھا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ میں خوف نامی کسی شے واقف نہ تھا۔ کمانڈو کی تربیت ختم کرنے کے چند ماہ بعد ہی مجھے اس ہنر کو استعمال کرنے کا نادر موقعہ بھی مل گیا۔ ایک ہمسایہ ملک نے کسی اعلان کیے بغیر ملک پر یلغار کر دی تھی اور ساری قوم متحد او یک جان ہو کر دشمن کے مقابلے میں صف آرا تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں ایک کمانڈو تھا، اس لئے میرے فرائض سب سے زیادہ کٹھن تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

ہائی کمان نے مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو دشمن کے علاقے میں اترنے کا حکم دیا تھا۔ ہمارے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ ایک دشوار گذار جنگل سے گذرنے کے بعد دشمن کی ایک اہم اسلحہ فیکٹری کے محل وقوع کا مکمل جائزہ لیں اور اپنے حکام کو اس کے بارے رپورٹ پہنچائیں۔ اسی علاقے میں واقع ایک فوجی ہوائی اڈا تباہ کرنے کا فرض بھی ہمیں سونپا گیا تھا۔ ایک ٹرانسپورٹ ہوائی جہاز ہم چاروں کو لے کر دشمن کی سرحدوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ ہمیں پیراشوٹ کے ذریعہ جنگل میں اترنا تھا۔ اس وقت ہم چاروں کافی کے آخری کپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جنگی مہمات سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ میں جنگ کے دوران کافی اور چائے میں دودھ اور چینی استعمال نہیں کروں گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی مرحلے پر مجھے کافی پانی بھی میسر نہ ہو سکے بھوکے پیاسے رہنے کی ہمیں پوری تربیت دی گئی تھی۔ اور مجبوری کی صورت میں محض جڑی بوٹیاں کھا کر بھی ہم زندہ رہ سکتے تھے۔

منیجر نے ہمیں اشارے سے بتایا کہ چند منٹ بعد آپ پیراشوٹ کے ذریعہ کودنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ سب سے پہلے مبارک کی باری تھی اس نے ہم سب کو خدا حافظ کہا اور طیارے سے باہر کود گیا اس کے بعد اسلم اور ظہیر نے چھلانگ لگائی۔ پھر میجر کے اشارے پر میں نے زیر لب کلمۂ شہادت پڑھا اور طیارے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ طیارہ زمین سے زیادہ بلندی پر نہ تھا۔ پھر بھی میرے اور زمین کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں چند لمحے تیر کی طرح تیزی سے زمین کی طرف گرتا چلا گیا۔ اس کے بعد چھاتہ کھل گیا اور میری رفتار میں یک لخت کمی واقع ہو گئی۔ اب میں خود کو فضا میں تیرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ زمین لمحہ بہ لمحہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے مجھے آہستہ آہستہ اڑا کر صراط مستقیم سے دور لے گئے تھے۔ ایک سنسنی سی میرے جسم میں پھیل گئی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ میں کھلے میدان سے ہٹ کر اب گھنے درختوں کے اوپر آ گیا تھا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں درختوں کی شاخوں میں الجھ کر نہ رہ جاؤں۔ میرے دوسرے ساتھی مجھے نظر نہیں آ رہے تھے اور مجھے ان کے انجام کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ فی الوقت سب سے بڑا مسئلہ خود کو درختوں کی شاخوں سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ میں نے جھولا جھولنے کے انداز میں چھاتے کو ہلکورے کھانے شروع کر دیے۔ تھوڑے فاصلے پر مجھے چھوٹے چھوٹے کھیت نظر آ رہے تھے۔ جو چاروں طرف سے درختوں سے گھرے ہوئے تھے۔ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ اور اب میں درختوں کی قطاروں سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ جب میرے پیروں نے زمین کو چھوا تو شکر ہے کہ میں کھیت کے آخری سرے پر تھا۔ اپنا توازن قائم کر کے میں نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور چھاتے کو کھینچنا چاہا لیکن وہ کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کی طرح کسی جگہ اٹکا ہوا تھا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو چھاتہ مجھے ایک درخت کی شاخوں میں الجھا ہوا نظر آیا۔ کئی جھٹکے دینے کے باوجود میں چھاتے کو شاخوں سے آزاد کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک چھاتہ بردار کے لئے سب سے اہم امر یہ ہے کہ وہ فی الفور ہی چھاتے کو سمیٹ کر کسی محفوظ مقام پر ٹھکانے لگا دے تاکہ وہ کسی دشمن کی نظر میں نہ آ سکے۔ مگر میرا چھاتہ کوشش کے باوجود درختوں سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرے لئے خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی وقت بھی کوئی کسان یا راہ گیر مجھے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنے بھاری فل بوٹ اتارے اور کود کر برق رفتاری سے درخت پر چڑھ گیا۔ جوتوں کے فیتے کھول کر میں نے انہیں اپنے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ ایک تھیلا پہلے ہی میرے گلے میں موجود تھا جس میں اشیائے خورد و نوش کا ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے دیگر ضروری سامان تھا۔ اونچے درخت کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے چھاتے کو درخت کی شاخوں سے آزاد کرانے کا عمل شروع کر دیا۔

یکایک فضا کے سناٹے کو ایک فائر کی آواز نے درہم برہم کر دیا۔ میں جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ فائر کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔ اور تمام حسیات کو اس آواز کی طرف مرکوز کر دیا۔ چند لمحے اور گذر گئے مگر دوسرے فائر کی آواز سنائی نہیں دی۔ فائر کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ میرا کوئی ساتھی؟ یا دشمن کا کوئی فوجی؟ دونوں صورتیں تشویشناک اور پریشان کن تھیں اگرچہ یہ خالص میدان جنگ کا علاقہ نہ تھا پھر بھی ملحقہ تھا اور دفاعی اعتبار سے اہم تھا۔ مجھے درختوں کے تول

پر قدموں کی آواز سنائی دی اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ قدموں کی آواز لحظہ بہ لحظہ نزدیک آ رہی تھی میں نے کمر سے بندھے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جب میری انگلیوں نے آہنی پستول کو محسوس کیا تو مجھے اپنے اندر ایک اعتماد اور توانائی محسوس ہونے لگی۔ قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ نزدیک آ رہی تھی یہاں تک کہ میں آنے والے کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک فوجی تھا۔ اس کے سر پر فولادی خود تھا جس میں پتے اڑسے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی ڈیوٹی پر کوئی فوجی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں مشین گن تھام رکھی تھی اور قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا جیسے ہر لمحے کسی دشمن کے نمودار ہونے کا منتظر ہو۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا اس کی حرکات اس بات کا اظہار کر رہی تھیں کہ اسے اپنے علاقے میں کسی غیر کی موجودگی کا یقین ہو چکا ہے۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا اور درخت کے نیچے آ کر عین اس جگہ کھڑا ہو گیا جہاں چند منٹ پہلے میں موجود تھا۔ وہ اپنی سونگھنے اور دیکھنے کی تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کر کے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اگر میں اپنے جوتے جلدبازی میں زمین پر چھوڑ آتا تو فوری طور پر وہ انہیں دیکھ لیتا۔ میں نے پستول کو اپنی انگلیوں میں تولا اور اس کا ہدف لے کر بلا تاخیر فائر کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا مگر پرابلم یہ تھی کہ کیا میں اس پر گولی چلا کر دوسروں کو متوجہ نہیں کر لوں گا؟ بہت ممکن ہے کہ اس کے دوسرے ساتھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں میں اسے ہلاک تو کر سکتا تھا مگر سارے جنگل میں اس کا اعلان ہو جاتا۔ اس طرح میں نہ صرف خود اپنے لئے بلکہ اپنے تینوں ساتھیوں کے لئے بھی خطرہ مول لے سکتا تھا۔

اس کی زندگی اور موت کے درمیان محض یہی ایک خیال حائل تھا۔ ہمیں تربیت کے دوران یہی بتایا گیا تھا اور نفسیاتی طور پر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی کو تلاش کرتے ہوئے کوئی شخص بہت کم اوپر دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ میری نگاہیں اس فوجی پر جم کر رہ گئی تھیں جو مجھ سے بارہ تیرہ گز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یکایک میں نے اس کے جسم میں تناؤ کے آثار دیکھے شاید اس نے بھی خطرے کو اپنے سے بہت زیادہ نزدیک محسوس کر لیا تھا۔ اس نے تیزی سے ایک گول دائرے میں چکر لگایا اور یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف بلند ہو گئیں۔ درخت کی شاخوں کے درمیان الجھے ہوئے رنگین چھاتے کو دیکھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر اس سے پہلے ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ اس نے مشین گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میرے پاس فوری فیصلہ کرنے کیلئے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت تھا۔ میں نے یک لخت اس پر چھلانگ لگا دی یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہو گیا۔ ابھی مشین گن کی نالی ابھی پوری طرح اوپر اٹھی بھی نہ تھی کہ میں اس پر جا پڑا۔ میرے داہنے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب سے مشین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر جا گرا۔ میرے پاس مہلت نہ تھی میں بھوکے شیر کی طرح جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا تھام لیا۔ وہ ایک مضبوط اور طاقتور فوجی تھا۔ مگر میں نے اسے سنبھلنے اور سوچنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ اس کے بازو اور ہاتھ تناور درخت کے تنے کی طرح مضبوط تھے مگر گردن پر میرے بھرپور دباؤ کی وجہ سے اس کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے کبھی اس کی انگلیاں میرے چہرے کو نوچتیں کبھی وہ میری آنکھوں میں انگلیاں گھمانے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ جوابی کارروائی کے طور پر میرا گلا دبانے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ میری گرفت آہنی زنبور سے بھی زیادہ سخت تھی۔ اور اسے ہلاک کرنے کا ارادہ اس سے کہیں زیادہ مضبوط۔ چند لمحے بعد اس کی جدوجہد ہلکی پڑ گئی اور پھر وہ بے جان ہو کر زمین پر گر گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کو چھوڑا اور کھڑا ہو کر مشین گن لینے لگا مگر خود میرے دل کی بلند آواز دھڑکنوں کے سوا کوئی اور آہٹ تک نہیں سنائی دی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا ایک بار پھر میں بندر کی طرح تیزی سے درخت پر چڑھ گیا اور چھاتے کو درخت کی شاخوں سے نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ چھاتے کو سمیٹ کر میں نے ایک بار پھر نیچے چھلانگ لگا دی۔ مردہ فوجی اور اس کی مشین گن میرے قدموں میں پڑی تھی اور چھاتہ میں نے سمیٹ کر اس کا گولہ بنا لیا تھا۔ مگر اب میرے سامنے محض چھاتے ہی کو چھپانے کا مسئلہ نہ تھا۔ مردہ فوجی کی لاش کو ٹھکانے لگانا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ میں نے چھاتہ کھول کر فوجی کی لاش کو مشین گن سمیت اس میں لپیٹا اور اسے گھسیٹتا ہوا گنجان درختوں کی طرف لے گیا۔ میں گھنے درختوں سے ڈھکے ہوئے محفوظ خطے کی تلاش میں تھا۔ جنگل خاصا گنجان تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تو نہ تھا مگر اس کے باوجود زمین ہموار

www.pdfbooksfree.pk

اور یکساں نہ تھی۔ جگہ جگہ گڑھے موجود تھے جو میری ضرورت کے عین مطابق تھے۔ ایک گہرے گڑھے میں چھاتے میں لپٹی لا[ش] لاش ڈالنے کے بعد اسے مٹی اور پتوں سے ڈھانپ دینا چنداں مشکل نہ تھا۔ قریباً نصف گھنٹے بعد جب میں درختوں کے جھنڈ [سے] برآمد ہوا تو چھاتے اور دشمن کی لاش دونوں سے نجات حاصل کر چکا تھا۔

کافی دور تک میں درختوں کی اوٹ میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہ تنہا فوجی کہاں سے آیا تھا اور اس کے اور ک[تنے] مددگار اور ساتھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ مجھے اپنے تینوں دوستوں کو بھی تلاش کرنا تھا اور ساتھ ہی یہ اطمینان بھی کرنا تھا کہ میری طرح وہ بھی کسی دشمن کی نگاہ میں نہ آ گئے ہوں۔ اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے اور میرے لئے جنگل میں ر[استہ] لینا آسان ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی خواہش تو نہیں تھی مگر میں ایک بڑے سے برگد کے درخت کے تنے سے ٹیک لگا[کر] لیٹ گیا۔ اور پانی کی چھاگل منہ سے لگا لی۔

یکایک ایک چیخ کی آواز سن کر میں چوکنا ہو گیا۔ چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی اور اس بار مجھے اندازہ لگانے میں کو[ئی] مشکل پیش نہیں آئی کہ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔ عام حالات میں ایک عورت کی چیخ سن کر مجھے فوراً اس کی امداد اور دستگ[یری] کے لئے پہنچ جانا چاہیے تھا مگر یہ وقت اور تھا۔ میں نے آواز کی طرف سے توجہ ہٹانی چاہی مگر ایک بار پھر وہی آواز سنا[ئی] دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی۔ مردانہ قہقہے مسلسل بلند ہو رہے تھے جن میں زنانہ آواز دب کر رہ گئی۔ میرے اندر کا انسان رفتہ رفتہ بیدار ہونے لگا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اسی جنگل میں میرے تین اور ساتھی بھی کسی جگہ موجود ہیں۔ جب تک میں ان آوازوں کا کھوج نہ لگا لوں ان تینوں کی مدد خود اپنی حفاظت کی طرف سے کس طرح مطمئن ہو سکتا ہوں؟ قہ[قہوں] کی آوازیں اب دور ہونے لگی تھیں۔ زنانہ آواز بھی غائب ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ آوازیں بالکل معدوم ہو گئیں اور ایک بار پھر سنا[ٹا] چھا گیا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو ان آوازوں اور انسانوں سے دور ہو جاؤں یا پھر ان کے نزدیک جا کر ان کی اص[لیت] جاننے کی کوشش کروں۔ پہلی صورت میں مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ تعداد میں کتنے ہیں اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہیں؟ کیا اپنے عقب میں ایک امکانی دشمن کو چھوڑ دینا عقلمندی کا تقاضا تھا؟ میں نے آوازوں کی سمت جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جنگل میں سے گزرتا ہوا میں اپنے اندازے کے مطابق اس طرف بڑھتا رہا۔ جدھر سے وہ آوازیں سنائی دی تھیں۔ اب اندھ[یرا] پھیلنے لگا تھا۔

رات کی تاریکی میرے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی مگر اس کے انتظار میں وقت ضائع کرنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ پروگرا[م] کے مطابق مجھے اور میرے ساتھیوں کو اب تک یکجا ہو جانا چاہیے تھا تاکہ ہم اپنی مہم کے دوسرے حصے کا آغاز کریں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرے قدم بے اختیار ایک سمت میں آگے بڑھ رہے تھے مگر میرا ذہن مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مجھے وہ لمحہ رہ رہ کر یاد آ رہا تھا جب ہم چاروں نے یکے بعد دیگرے ہوائی جہاز سے چھلانگیں لگائی تھیں وہ لمحہ میرے ذہن میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر ہم چاروں ایک دوسرے کو تلاش نہ کر سکے تو ہمارے مشن کا کیا انجام ہو گا؟ میری یہ ذہنی مشکل خود بخود آسان ہو گئی جب میں نے کچھ فاصلے پر ایک روشنی چمکتی ہوئی دیکھی۔ روشنی کی یہ کرن میرے لئے ایک اشارہ تھی میں نے اس روشنی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان ایک کھلا ہوا مختصر سا میدان تھا جس میں ایک چھوٹا سا خیمہ اور ایک چھولداری نصب تھی۔ چھولداری کے باہر ایک بانس سے لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی مجھے دور سے نظر آئی تھی مگر میری نگاہیں لالٹین کی روشنی پر نہیں بلکہ ان انسانوں پر جم گئی تھیں جو خیمے اور چھولداری کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ گنتی میں دو تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے وہ ٹکٹکی لگائے اپنے سامنے کھڑی ہوئی ایک عورت اور ایک مرد کو دیکھ رہے تھے چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی فوجی تھے۔ ان کی مشین گنیں بان کی چارپائی سے ٹکی ہوئی ان کے نزدیک ہی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں کہنیوں کے سہارے نیم د[راز]

[تھ]ے۔ چارپائی سے کچھ فاصلے پر ایک اور فوجی کھڑا ہوا تھا۔ اس لئے آس پاس مجھے کوئی گن نظر نہیں آئی۔ مگر اس وقت وہ [ش]یر دستاں کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس سے چند قدم دور ایک عورت سمٹی سمٹائی زمین پر بیٹھی تھی۔ اور خوف زدہ نظروں سے [اس] فوجی کو تک رہی تھی۔ اس کے سیاہ لمبے لمبے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک جوان اور صحت مند عورت تھی [ڈو]بتے ہوئے سورج اور لالٹین کی ملی جلی روشنی میں اس کا سادہ چہرہ ایک ایسے شخص کا چہرہ نظر آ رہا تھا جسے سزائے موت سنائی [جا چ]کی ہو۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا فوجی چند لمحے خاموش اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے پتلون کی عقبی جیب میں ہاتھ ڈال کر شراب [کی] نصف سے زائد خالی چھوٹی بوتل نکالی کسی اور طرف دیکھے بغیر وہ ایک ہی سانس میں پوری بوتل پی گیا اور خالی بوتل اس [ن]ے زور سے اچھالی جو مجھ سے چند گز کے فاصلے پر آ کر گر گئی۔ میں اس وقت ایک درخت کی اوٹ میں تھا مگر اس وقت [خا]لی بوتل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کا ہوش کسے تھا؟ چھ نگاہیں زمین پر بیٹھی ہوئی عورت پر مرکوز تھیں جو ہر قسم کے احساس [او]ر جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ خاموش سہمی ہوئی تھی۔ شاید وہ چیخ چیخ کر تھک گئی تھی۔ یا پھر اسے یقین ہو چکا تھا [ک]ہ ان میں سے کوئی شخص بھی اس کی فریاد سن کر نہیں پسیجے گا۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا فوجی آہستہ قدمی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لئے بھی عورت پر سے نظریں نہیں ہٹائی۔ دوسری طرف عورت بھی مسلسل اس کی نظروں سے نظریں ملائے بیٹھی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی سفلی عمل پڑھ رہی ہو یا اس سنگدل کو ہپناٹائز کرنے کی کوشش میں مصروف ہو یا محض جبلی طور پر اپنے شکاری کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر جان بچانے کی کوئی گھات سوچ رہی ہو۔ فوجی نے جب نزدیک پہنچ کر اسے بازو سے تھام کر کھڑا کیا تو وہ ایک معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ ایک بے جان اور بے حس و حرکت لاش کی طرح نظر آ رہی تھی۔ فوجی کے ہاتھ بڑھا کر اس کی میلی ساڑھی کا آنچل تھام لیا اور چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں فوجیوں کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ وہ کہنیوں کو اپنے جسموں کے بوجھ سے آزاد کر کے بیٹھ گئے اور اس تماشے کو دیکھنے کے لئے ہمہ تن نگاہ بن گئے جو عنقریب ان کے سامنے سٹیج کیا جانے والا تھا۔ عورت اپنی جگہ بدستور بے حس و حرکت کھڑی تھی لیکن فوجی اس کی ساڑھی کا پلو ہاتھ میں تھام کر آہستہ سے اس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا اور پیاز کے چھلکوں کی طرح ساڑھی کے پرت اترتے جا رہے تھے۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو مجھے زندگی بھر نہیں بھولے گا۔ حوا کی آبرو،   کا تقدس، ماتا کی عظمت، عورت کی عصمت خطرے میں تھی اور تین بھیڑیے ہر قسم کے انسانی جذبات سے عاری ہو کر اس ناقابل معافی سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ایک دم چھن گئی۔ نہ مجھے یہ ہوش رہا کہ میں کس مقصد سے ایک دشمن ملک میں آیا ہوں۔ نہ یہ احساس باقی رہا کہ میری ایک معمولی سی لغزش نہ صرف میری اور میرے تینوں ساتھیوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دے گی۔ بلکہ ہمارے مشن کو بھی صفر کر دے گی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گولیوں سے بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں موجود بھی ہے یا نہیں مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ ایک پل بعد ساڑھی کا آخری بل بھی کھل جائے گا اور یہ عورت جو کسی کی ماں بیٹی بیوی یا بہن ہے ان غلیظ نگاہوں کے سامنے نیم عریاں ہو جائے گی۔

میں نے چلا کر کہا۔ ” خبردار! رک جاؤ“۔ ان تینوں نے یوں چونک کر آواز کی طرف دیکھا جیسے کسی سحر سے نکلے ہوں۔ انھیں سوچنے کی کوئی مہلت دیے بغیر بھاگتا ہوا ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ نیم تاریکی میں فوجی وردی میں ملبوس ایک شخص کو پہلی نگاہ میں وہ شاید کوئی اپنا ہم قوم ہی سمجھے ہوں گے۔ میری اچانک موجودگی نے انھیں چونکا کر رکھ دیا مگر جب میں روشنی میں پہنچا تو انھوں نے میری وردی کا فرق بھی دیکھ لیا اور انھیں پتہ چل گیا کہ میں ایک ناآشنا اور غیر چہرہ ہوں۔ عورت کے سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے بے ساختہ اپنی مشین گن کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ ساڑھی کا پلو اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں فوجیوں نے بھی بیک وقت چارپائی سے ٹکی ہوئی مشین گنوں کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر میرے پستول سے نکلنے والی گولیاں ان سے زیادہ برق رفتار تھیں۔ گولی ایک کی کنپٹی پر لگی اور وہ الٹ کر چارپائی پر گر گیا۔ دوسری گولی اس کے ساتھی کی گردن کے پار ہو گئی۔ میں نے ان دونوں پر دوسری نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب میں شیر سے فوجی کی طرف

www.pdfbooksfree.pk

متوجہ تھا۔ اس کی مشین گن چھولداری کے عین سامنے زمین پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا ہاتھ اس کے دستے تک پہنچ چکا تھا کہ میرے پستول کی گولی نے اسے جا لیا۔ پہلی گولی اس کی پشت پر لگی۔ دوسری سر پر اور اس کے بعد مجھے تیسری گولی چلانے کی حاجت نہ تھی۔ چند لمحوں کے اندر تینوں کی بے حس و حرکت لاشیں میرے سامنے پڑی تھیں۔ عورت ابھی تک خاموش اور بے حرکت کھڑی تھی اور خالی خالی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ان تینوں بے جان جسموں کو دیکھا اور پھر اس کی نظر میری طرف اٹھی تو اتنی دیر میں اس کی تمام حسیں زندہ ہو چکی تھیں اس کے ہاتھوں نے غیر ارادی طور پر ساڑھی سے جسم کو ڈھا لیا اور اس کی بے نور نگاہوں میں زندگی کے آثار جاگ اُٹھے۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ ف وردی میرے جسم پر بھی تھی مگر شاید اس کے ذہن نے یہ پیغام وصول کر لیا تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں، محافظ ہوں۔ وہ پہلے تو خا کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر اچانک دوڑ کر میرے قدموں میں جھک گئی۔ دونوں ہاتھوں سے میرے پیر تھام لئے اور بلند آواز سے رو لگی۔ اور مجھے اس وقت احساس ہوا کہ ابھی تک میرے بوٹ میری گردن میں لٹکے ہوئے تھے اور میں ننگے پاؤں جنگل میں سفر کر رہا

اس کے گرم آنسو میرے ننگے پیروں کو تر کرنے لگے تو میں نے گھبرا کر اسے دونوں بازو تھام کر اٹھا لیا۔ الفاظ نے اُس کی زبان کا سا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی روایتی عبادت کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آنسو مسلسل اس کی آنکھ سے بہہ رہے تھے۔

"چپ ہو جاؤ۔" میں نے نرمی سے کہا "اور مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟"

میرے نرم اور ہمدردانہ الفاظ نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا۔ پہلے تو کچھ دیر میں نے اسے جذبات پر قابو پانے کا موقعہ دیا اس کے بعد اس کا ہاتھ تھام اس کو چھولداری کے اندر بچھی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور خود اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ آنسو تھمے تو اس نے رُکتے رُکتے مجھے اپنی داستان سنائی۔ اُس کا نام شیلا تھا۔ وہ قریبی گاؤں میں رہنے والی ایک دیہاتی عورت تھی اور شادی شدہ تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ قریباً ایک ہفتے قبل چار فوجیوں نے اِس مقام پر یہ کیمپ قائم کیا تھا ایک دو بار ایک جیپ پر کچھ فوجی افسر بھی ان کے پاس آئے تھے۔ گاؤں یہاں سے دو میل کے فاصلے پر تھا اور جب شیلا نے پہلی بار ایک فوجی دیکھا تو وہ دوپہر کا وقت تھا۔ مختصر گاؤں چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ دن کے وقت گھر کے مرد کھیتوں اور جنگلوں میں کام کے لئے چلے جاتے تھے۔ عورتیں گھریلو کاموں میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ شیلا کپڑے دھونے کے لئے ندی پر گئی تو اس نے پہلی بار اس فوجی کو ایک ٹیلے سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے ہم قوم مسلح فوجی کو دیکھ کر اسے مطلق خوف محسوس نہیں ہوا لیکن وہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حیوانیت سے آگاہ نہیں ہو سکی۔ فوجی اس کے نزدیک پہنچ کر گا اور گاؤں والوں کے بارے میں مختلف سوالات کرتا رہا۔ اس نے شیلا کو بتایا کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور ہم چار فوجیوں نے جنگل میں کیمپ لگایا ہے کچھ دن بعد اور فوجی بھی آئیں گے پھر اس نے شیلا کو اپنے کیمپ پر آنے کی دعوت دی۔ شاید اس کے لمبے سیاہ بالوں اور صحت مند جوان جسم دیکھ کر فوجی کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ مگر شیلا جو ایک سادہ لوح دیہاتی عورت اس سے بے خبر تھی اس کے بعد بھی اس نے کئی بار ان فوجیوں کو جنگل میں دیکھا۔ ایک دن تو اس کا گھر والا نین سکھ بھی اس ساتھ تھا۔ فوجیوں نے نین سکھ کو بھی کیمپ پر مدعو کیا اور اسے بتایا کہ وہ بہت اچھی قسم کی دارو بھی اسے پلائیں گے۔ ثبوت طور پر انھوں نے اپنی پتلون کی جیب سے شراب کی ایک چھوٹی بوتل نکال کر دکھائی۔ نین سکھ دارو کے لالچ میں آ گیا اور روز شام کو ان کے کیمپ پہنچ گیا۔ اگلے دن وہ واپس لوٹا تو شیلا نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا مگر وہ اپنے ساتھ شراب ایک بڑی بوتل بھی لے کر آیا تھا جو فوجیوں نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے نین سکھ نے کام پر جانے بجائے دارو پینی شروع کر دی اور دوپہر تک بالکل مدہوش ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اس روز شیلا کپڑے دھونے کے لئے پر گئی تو تین فوجی اس کی گھات میں بیٹھے تھے۔ وہ چیخی چلائی، فریاد کی، واسطے دیے مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا انہیں معلوم جنگل میں دُور دُور تک کوئی اس کی آواز نہیں سنے گا اور نین سکھ کو انھوں نے جو نشہ پینے کے لئے دیا تھا اس کا خمار دو

دن تک نہیں اتر سکتا تھا۔ یہی وہ آوازیں تھیں جو میں نے بھی سنی تھیں۔

اپنی کہانی سنانے کے بعد یکایک شیلا کو میرے بارے میں جاننے کا خیال آیا۔ میرے فوجی ہونے میں اسے کوئی شک نہیں تھا بلکہ اسے یہ گمان تھا کہ شاید میں ان فوجیوں کا چوتھا ساتھی ہوں۔ فوری طور پر مجھے بھی یہی کہانی مناسب لگی اور میں نے اعتراف کر لیا کہ میں ان ہی درندوں کا ساتھی ہوں مگر اب مشکل یہ تھی کہ میں شیلا کا منہ کس طرح بند رکھوں؟ ظاہر ہے کہ وہ گاؤں واپس جا کر خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

مجھے اچانک ایک خیال سُوجھا۔ میں نے کہا "دیکھو شیلا۔ میں نے جوش اور غصے میں آکر ان تینوں کو مار تو دیا ہے مگر تم جانتی ہو کہ قتل بہت بڑا جرم ہے خاص طور پر محاذِ جنگ پر لڑنے والے فوجی کے لئے اپنے ساتھی فوجی کو ہلاک کرنا سب سے بڑا جرم ہے فوج والے میرا کورٹ مارشل کریں گے اور مجھے گولی سے اڑا دیں گے" وہ یہ سن کر بے حد پریشان ہو گئی وہ ہر قیمت پر میری جان بچانا چاہتی تھی۔ خواہ اِس کے لئے اُسے خود اپنی جان ہی کیوں نہ داؤ پر لگانی پڑے

"دیکھو شیلا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں فوج سے بھاگ جاؤں اور کہیں بہت دُور جا کر ایک نئی زندگی شروع کر دوں۔ اگر فوج والوں کو میرا پتہ لگ گیا تو وہ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے"

"مگر تم بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟" وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

"یہ مُلک بہت بڑا ہے۔ میں کہیں دُور چلا جاؤں گا اور نام بدل کر رہنے لگوں گا"

"مگر تمہارے بیوی بچوں کا کیا ہو گا۔" وہ ایک حساس دل رکھنے والی گرہستی عورت تھی۔

"میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ماں باپ بھی نہیں ہیں۔"

یہ سُن کر اسے قدرے اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی وہ میری سلامتی کے بارے میں بہت تشویش ظاہر کرتی رہی۔ میرے لئے فوری طور پر مسئلہ ان فوجیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ میں نے قریبی جنگل میں ایک بڑا سا گڑھا تلاش کیا۔ شیلا لالٹین اُٹھا لائی اور گڑھے کو گہرا کرنے میں میری مدد کرتی رہی۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کا خاوند مدہوشی کے عالم میں گھر پر پڑا ہوا تھا اور گھر میں کوئی دوسرا اس کی غیر حاضری کے بارے میں دریافت کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے تینوں لاشوں کو ہتھیاروں سمیت گڑھے میں ڈال کر مٹی، ٹہنیوں اور پتوں سے چھپا دیا۔ لالٹین دوبارہ اسی جگہ لٹکا دی اور تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے کیمپ کے باسی ابھی اُٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ فوجیوں کا جنگ کے زمانے میں کیمپ سے غائب رہنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے مٹکے میں بھرے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے صاف کئے اور جوتے گلے سے اتار کر پیروں میں پہن لئے۔ شیلا کی ذہنی کیفیت اب بہتر تھی۔ وہ میرے گلے میں لٹکے ہوئے جوتوں کو دیکھ کر ہنستی رہی۔ شیلا کا مشورہ تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر کھانا کھاؤں اور پھر اپنی راہ لوں مگر میں نے اسے بتایا کہ ایک ایک منٹ میرے لئے قیمتی ہے۔ اس کا اسے بھی بخوبی اندازہ تھا۔ میں نے اسے گاؤں تک پہنچا کر آنے کی پیشکش کی تو وہ ہنسنے لگی۔ "مجھے جنگل میں کسی کا ڈر نہیں ہے جن کا ڈر تھا وہ اب نہیں رہے راستے بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں مجھے تو تمہاری چنتا ہے۔" میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایک سخت جان فوجی ہوں اور جنگل میں سفر کرنا میرے لئے بہت معمولی بات ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اس لئے میں نے شیلا سے رخصت چاہی وہ ایک دم ہی جذباتی ہو گئی۔ چند لمحے پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی مگر رخصت کے وقت اس کی آنکھیں چھم چھم بہنے لگیں۔ وہ روتی ہوئی مجھ سے لپٹ کر بولی "میرا کوئی ویر نہیں ہے تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں سب سے چھپا کر رکھوں گی۔ تمہاری خدمت کروں گی۔ تمہارے لئے بہت اچھا رشتہ تلاش کر دوں گی۔" پگلی بالآخر ایک عورت تھی۔ بے چاری یہ بھول گئی تھی کہ اگر میں واقعی اس کا ہم قوم فوجی ہوتا تب بھی وہ مجھے دنیا کی نظروں سے بچا کر نہیں رکھ سکتی تھی کہاں یہ کہ میں دشمن فوجی تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا مگر جذباتی باتوں کا وقت نہ تھا۔ اسے روتا ہوا چھوڑ کر میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا مگر اس سے پہلے میں نے اسے نین سکھ کے سر کی سوگند دی کہ وہ مجھ سے ملاقات کے بارے میں کسی کو نہیں

www.pdfbooksfree.pk

بتائے گی بھول جائے گی کہ میں کبھی اسے مِلا تھا۔ خود اس کی بھلائی کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ میرے اور فوجیوں کے بارے میں عمر بھر اپنی زبان بند رکھے۔

فوجیوں کی زندگی میں جذباتی باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن میں شاید اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ شیلا کو انسان نما درندوں سے بچا کر مجھے ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوئی تھی مگر اندھیرے جنگل میں ایک میل پیدل چلنے کے بعد شیلا اور ہلاک شدہ فوجیوں کا خیال میرے ذہن سے یکسر غائب ہو گیا۔ میرے پاس کمپاس قسم کا کوئی آلہ نہ تھا جس سے سمت کا اندازہ لگا تا۔ شیلا سے میں زیادہ تفصیلی سوالات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور پھر میں جس نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کی فکر میں تھا وہ شیلا مجھے فراہم بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میرا سفر خاصا پُر خطر تھا۔ ایک جگہ چیتے نے مجھ پر گھات لگائی۔ اگر مُردہ فوجی کی مشین گن میرے ہاتھ میں نہ ہوتی تو اس کا حملہ میرے لیے موت کا پیغام بن جاتا۔ مگر میں اندھیرے میں اس کی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ چکا تھا اور اس کے چھلانگ لگانے سے پہلے مشین گن کی گولیوں نے اُسے بھون کر رکھ دیا۔ ایک مقام پر میں نے قریباً تیس فٹ لمبے اژدہے کو دیکھا۔ اس نے میری طرف توجہ نہیں دی کیوں کہ وہ ایک زندہ ہرن کو نگلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں چاہتا تو کسی درخت کی شاخ پر رات گزار سکتا تھا۔ مگر میرے لیے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا ضروری تھا۔ یقیناً وہ بھی میری تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔

کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد مجھے کچھ فاصلے پر کھائیوں اور جنگل کے درمیان گھری ہوئی ایک عمارت نظر آئی۔ یہ ایک پُرانی وضع کی وسیع دو منزلہ بلڈنگ تھی جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے ستونوں والے برآمدے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی بلند و بالا تھے جن میں رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ عمارت کے بعض حصوں میں روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ ایک بار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز بھی آئی اور فضا میں گم ہو گئی۔ میں رُک کر سوچنے لگا۔ یہ کیا عمارت ہو سکتی ہے؟ آبادی سے دُور جنگلوں اور پہاڑیوں میں گھری ہوئی، کسی راجہ کا محل ہے؟ یا کسی بڑے تعلقدار کی حویلی؟ یکایک ساری فضا روشنیوں سے جگمگا اٹھی۔ ہر طرف آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی تیز دودھیا رنگ کی روشنی پھیل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے مگر روشنی میرے وجود میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پھر کوئی درخت پر سے زمین پر کودا۔ میں تیزی سے پلٹا۔ ایک برین گن کی خوفناک نالی میری دونوں آنکھوں کے سامنے تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں موت کے بھیانک غار کے دہانے کو دیکھ رہا ہوں۔ چند بھاری فوجی قدموں کی چاپ سُنائی دی اور میری نگاہوں کے سامنے والی تیز سرچ لائٹ بُجھ گئی۔ اب میں قدرے بہتر انداز میں دیکھ سکتا تھا۔ مگر جو کچھ میں نے دیکھا وہ نہ دیکھتا تو بہتر تھا۔ میرے پہلو میں ایک چھ فٹ لمبا فوجی برین گن سے نشانہ باندھے ہوا کھڑا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب ایک درجن کے قریب مسلح فوجی تھے جن کے چہروں پر موت کا پیغام میں صاف اور واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔ پھر میری نظریں ان فوجیوں کے سامنے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر گئیں۔ گونجدار آواز میں کسی نے ہدایت دی اور ایک مسلح فوجی نے آگے بڑھ کر اس ڈھیر کو ٹھوکر ماری۔ میرے تینوں ساتھیوں اسلم، مبارک اور ظہیر کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ میرے چاروں طرف دشمن کے خونخوار شکل فوجیوں کا نرغہ تھا جن کی گولیاں مجھ پر برس پڑنے کے لیے بے تاب تھیں۔

میں بے اختیار آگے بڑھا لیکن برین گن کی نالی میری پیشانی سے ٹکرائی اور میرے قدم خود بخود رُک گئے مگر میری نظریں بدستور اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر تھیں۔ یہ انتہائی تربیت یافتہ نوجوان تھے جنہیں ایک بہت مشکل مُہم کے لیے منتخب کیا گیا تھا ان کا یوں موت کے گھاٹ اُتر جانا نہ صرف میرے لیے ایک چونکا دینے والا حوصلہ شکن نظارہ تھا بلکہ میں جس مشن پر بھیجا گیا تھا اس کی کامیابی کا انحصار بھی ان ہی کے عزم و حوصلے پر تھا، لیکن وہ اپنے وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دے کر بہت بڑے قرض سے آزاد ہو چکے تھے۔ ان پر کون سی ناگہانی آفت نازل ہوئی جو یہ اتنی آسانی سے لقمۂ اجل بن گئے؟ مگر یہ لوگ آسانی سے دشمن کے قبضے میں آ جانے والے ہرگز نہیں تھے پھر؟

تیز روشنی کی چکا چوند نے میری آنکھوں کو جھپکا دیا۔ بھاری فوجی بوٹوں کی آواز سُنائی دی اور ایک فوجی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ اس نے لوہے کا ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر سب سے نمایاں چیز اُس کی گھنی اور نوک دار مونچھیں تھیں۔

"یہ تمہارے ساتھی ہیں؟" ایک گونجدار آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک پڑا۔ ایک لمحہ پہلے مایوسی، صدمے اور حیرت کا جو جذبہ مجھ پر طاری ہو چکا تھا وہ میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے اس قسم کے صدمات اور حادثات سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دی گئی تھی۔ ایک فوری جذباتی اور نفسیاتی صدمے نے مجھے جس لپیٹ میں لے لیا تھا اب میں اس سے مکمل طور پر آزاد تھا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔" میرا جواب فوری اور دو ٹوک تھا۔

فوجی کی نوکدار مونچھیں پھڑ پھڑائیں اور اُس کی خوفناک سیاہ آنکھوں میں غیض و غضب کی چمک نمودار ہوئی: "زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ تینوں مرنے سے پہلے ہمیں سب کچھ بتا چکے ہیں۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ تعاون کرو۔"

مجھے معلوم تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ جب وہ مجھ سے مخاطب تھا اس دوران میں میری نگاہیں اسلم، مبارک اور ظہیر کی لاشوں کا تفصیلی جائزہ لے چکی تھیں۔ میں نے اُن کے جسموں پر اَن گنت گولیوں کے نشان دیکھ لیے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مردانہ وار گولیاں چلاتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ دشمن کو اُن سے پوچھ گچھ کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ میں نے کہا: "جب یہ سب کچھ بتا ہی چکے ہیں تو پھر میرا کچھ کہنا لاحاصل ہے۔"

فوجی کا خونخوار چہرہ اور زیادہ بھیانک ہو گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اب میں اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اتنا نزدیک تھا کہ میں پھونک مار کر اس کی نوکدار مونچھوں کے بَل نکال سکتا تھا۔ ایک لمحہ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ پھر اس نے مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر بلند آواز میں کہا: "بلونت سنگھ"

ایک فوجی تیزی سے آگے بڑھا اور ہم دونوں کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا۔

"اسے مہمان خانے کی سیر کراؤ۔ آسانی سے ماننے والا نہیں لگتا۔"

بلونت سنگھ کے کرخت ہاتھوں نے مجھے بازو سے تھام لیا۔ فوجی افسر ابھی تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا اور میں بھی پلک جھپکے بغیر اسے تک رہا تھا۔

"چلو۔" بلونت سنگھ نے جھٹکے سے بازو پکڑ کر کھینچا اور میری نظریں بلونت سنگھ کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ایک قد آور، مضبوط شخص تھا جس کے چہرے پر رحم و مہربانی کے آثار بالکل نہیں تھے۔ برین گن کی نالی جو پیشانی سے ہٹ کر میری گردن پر چُبھ رہی تھی اب میری کمر میں پیوست ہو گئی۔ سامنے کھڑے ہوئے فوجیوں کی بندوقیں بھی مجھے اپنی زد میں لیے ہوئے تھیں۔ میں نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کے بے گور و کفن لاشوں پر ڈالی۔ میں اُن کے نزدیک جا کر اُنہیں آخری الوداعی بوسہ بھی نہیں دے سکتا تھا اور نہ اُن کی مغفرت کے لیے دُعا کرنے کا موقعہ تھا۔ میں نے خاموش نظروں سے انہیں خدا حافظ کہا اور بلونت سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ پیچھے پیچھے برین گن کی آہنی نالی تھی اور چھ فوجی مجھے اپنی بندوقوں کے سائے میں لیے ہوئے ساتھ چل رہے تھے۔

ہم قدیم دو منزلہ عمارت کی مخالف سمت جا رہے تھے۔ خشک پتے ہمارے پیروں تلے چُرمُرا رہے تھے: اُونچے اُونچے درختوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایک پگڈنڈی سے گزر کر ہم مختصر سے کھلے میدان میں پہنچے اور ایک خستہ سی ایک منزلہ پرانی عمارت کے سامنے جا کر رُک گئے۔ ایک خیمے کے سامنے کھڑے ہوئے پہریدار نے اشارہ کیا اور حویلی کا اُونچا چوبی دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک خاصا بڑا صحن تھا۔ یہ ایک پُرانی وضع کی عمارت تھی جس کے وسیع صحن میں چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں میں مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ ایک برآمدے سے گزر کر ہم ایک ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ سامنے ایک چھوٹی میز پر ٹانگیں پسارے ایک تنومند فوجی کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خشونت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

www.pdfbooksfree.pk

"بلونت سنگھ۔ یہ کوئی نیا شکار ہے؟" وہ غرآیا۔ اس کی آواز میں درندگی تھی۔

"میجر صاحب نے آپ کے حوالے کر دیا ہے۔" بلونت سنگھ ہنس کر بولا اور مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں سنبھلنے کے باوجود میز سے جا ٹکرایا۔ میز پر بیٹھا ہوا فوجی پھرتی سے اُٹھا اور اس نے ایک بھرپور تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا جس کی آواز سے ساری عمارت گونج اُٹھی ہوگی۔

"نظر نہیں آتا تمہیں۔" وہ گرجا۔ پھر مجھے گھور کر بولا: "کوئی بات نہیں۔ رام بھروسے تم جیسے مہمانوں کی سیوا کرنا خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں خاموش رہا۔ وہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر اچانک مسکرایا۔ "کوئی بات نہیں، جو ہمارے پاس مہمان رہتا ہے وہ اپنا نام پتہ اور سارے خاندان کا کچا چٹھا بتا کر جاتا ہے۔" پھر اس نے بلند آواز سے پکارا "صوبیدار۔" ایک فوجی بھاگا ہوا آگیا۔ "اسے بارہ نمبر کوٹھری میں بند کر دو۔" وہ میری طرف گھورتے ہوئے گرجا "چلو جوان۔" صوبیدار نے اپنی برین گن کی نالی میری کمر میں چبھو دی اور زور سے آگے کو دھکیلا۔

میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ برآمدوں کے آگے متعدد کمرے بنے ہوئے تھے اور ایک چوڑی سی گیلری ان کے درمیان سے گزر کر عمارت میں کسی اور طرف جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر صوبیدار للکارا "ہالٹ۔" میں رک گیا اور میں نے کنکھیوں سے ارد گرد کا جائزہ لیا مگر صوبیدار کو قابو میں کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ برآمدے اور گیلری کے سامنے متعدد مسلح فوجی چوکس تھے اور مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ صوبیدار کے اشارے پر ایک سپاہی نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور صوبیدار کی برین گن کے ایک پُرزور دھکے نے مجھے کوٹھری کے اندر دھکیل دیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا اور ظاہر ہے کہ اس پر قفل بھی لگا دیا گیا جس کی آواز میں صاف اور واضح طور پر سن سکتا تھا۔

میں نے اس کمرے نما کوٹھری کا جائزہ لیا۔ اونچی اونچی دیواریں تھیں اور سترہ اٹھارہ فٹ بلند چھت کے نیچے یہ ایک مختصر کمرہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے میں اندر آیا تھا۔ اس کے مقابل ایک روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ ایک اور روشندان بائیں دیوار میں تھا جو شاید برابر والے کمرے میں کھلتا تھا۔ اس میں شیشے کی جگہ لکڑی کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک چارپائی اور تپائی کے سوا کوئی اور فرنیچر موجود نہ تھا۔ چارپائی پر ایک گندا سا تکیہ اور کمبل پڑا ہوا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ کر حالات پر غور کرنے لگا۔ اپنے تینوں ساتھیوں کی موت کے بارے میں اب میرا ذہن بالکل واضح تھا۔ انہوں نے دشمنوں کی قید پر مردانہ وار موت کو ترجیح دی تھی۔ ان کی زندگی میں وہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکے تھے۔ انہوں نے مخالفین کے حصار میں گھر جانے کے بعد یقیناً فائرنگ کی ہوگی اور جواب میں درجنوں گولیاں ان کے جسموں میں پیوست ہو گئیں۔ جیسا کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا وہ موت کو گلے لگانے سے پہلے دس بارہ دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے مگر اب میرے مشن کا کیا ہوگا؟ میرے تین پُرعزم ساتھی میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور میں دشمن کی قید میں تھا۔ چاروں طرف کڑا پہرا تھا جس سے رہائی کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ تو کیا میرے مقدر میں بھی ایک بزدلانہ موت لکھی ہوئی ہے؟ میں نے سوچا۔

اچانک عمارت دردناک چیخوں سے گونج اُٹھی۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی مظلوم کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس کی آہیں چیخیں اور کراہیں ناقابل برداشت تھیں۔ چیخوں کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ چند منٹ تک یہ شور و غل جاری رہا اور اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ کمرے میں ایک مدھم بجلی کے بلب کی روشنی نے سوگوار اور اداس ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ اس پر مستزاد یہ چیخیں اور آوازیں۔ میرے ذہن اور اعصاب اپنے ساتھیوں کی بے وقت اور اچانک جدائی کی وجہ سے پہلے ہی مجروح اور متاثر تھے۔ پھر جن حالات سے میں گزر رہا تھا وہ بھی خاصے صبر آزما تھے۔ چیخوں کے بعد یکایک گہری خاموشی بھی خاصی اعصاب شکن تھی جس کی وجہ سے میرے ذہن میں انتشار اور بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ یکایک ایک بار پھر ایک طویل چیخ بلند

ہوئی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ اس مرتبہ تشدد کا مرکز میرے برابر والا کمرہ تھا۔ روشندان میں نصب لکڑی کے تختوں کے باوجود آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پھر پہلی مرتبہ ایک خوفناک آواز میرے کانوں نے سنی۔ آواز کی کرختگی اور لہجہ صاف کر رہا تھا کہ یہ شخص ہر قسم کے جذبۂ ترحم اور انسانیت سے محروم ہے۔ "ہم تمہیں ایک بار پھر بولتا ہے کہ سچ سچ بتا دو نہیں تو تمہارے جسم کی بوٹیاں الگ کر کے کتے بلی کو راتب کھلا دیں گے۔ تمہاری ایک بھی ہڈی باقی نہیں رہے گی مگر تمہارے جسم میں سے جان نہیں نکلے گی۔ بولو۔"

جواب میں ایک دھیمی اور دکھی آواز سرگوشی کے انداز میں آئی۔ "مجھ سے قسم لے لو۔ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم تھا میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ خدا کے واسطے مجھ پر ترس کھاؤ۔"

"تم پر ضرور ترس کھائیں گے۔ ابھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ چلو شروع ہو جاؤ۔ چھینکو مرچیں اور نمک اس کے زخموں پر۔"

اس کے ساتھ ہی چیخیں دوبارہ بلند ہونے لگیں۔ میں نے بے اختیار اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے مگر میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا اور میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے زور سے بھینچ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے کانوں کو دونوں ہتھیلیوں سے اتنی زور سے دبایا کہ میری کنپٹی کی رگیں چٹخنے لگیں لیکن اس کے باوجود میرے کان مظلوم کی آوازیں سن رہے تھے۔ خدا جانے کتنی دیر تک ظلم و ستم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا حالانکہ کمرے میں گرمی نہیں تھی۔ مجھے جو تربیت دی گئی تھی اس میں تشدد برداشت کرنے کا سبق ضرور شامل تھا لیکن دوسرے کو اذیت اور عذاب میں مبتلا دیکھنے کی تربیت مجھے نہیں ملی تھی اور یہ غیر انسانی کارروائی میری قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ جب برابر والے کمرے میں سے آوازیں بند ہوئیں تو ایک بار پھر سکوت اور سناٹا چھا گیا مگر یہ خاموشی ان آوازوں سے زیادہ اذیت ناک اور سوہانِ روح تھی۔ میں ہر لمحہ کسی درد بھری چیخ کو سننے کا منتظر تھا۔ انتظار کے یہ لمحات کتنے تکلیف دہ تھے ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ نہ جانے خاموشی کب تک طاری رہی اور ایک بار پھر چیخ و پکار اور آہ و بکا کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ یہ عمل ساری رات تھوڑے تھوڑے وقفے سے دہرایا جاتا رہا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی سونا تو کیا پُرسکون بھی نہ ہو سکا۔ اگر خود مجھے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تو شاید میں اتنے کرب اور عذاب کا شکار نہ ہوتا۔

صبح کی علامت کے طور پر چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پچھلا روشندان کسی باغ یا کھلے میدان میں کھلتا ہوگا کیونکہ چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ روشنی بھی اسی روشندان سے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ رات کی ہیبت ناک تاریکی نے جو پُرہول ماحول طاری کر دیا تھا چڑیوں کی معصوم آوازوں اور سورج کی مدھم کرنوں نے اسے آہستہ آہستہ کم کر دیا۔ اجالا بھی قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ کتنی تکلیفیں، کتنی ہی پریشانیاں محض سورج کی روشنی کی وجہ سے کم یا سرے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ بیماروں کی تکلیف رات میں بڑھ جاتی ہے مگر دن کی روشنی اس تکلیف کو خود بخود کم کر دیتی ہے۔ روشنی بذاتِ خود ایک ڈھارس ہے، ایک حوصلہ ہے۔ کتنے ہی آلام اجالا ہوتے ہی بے حقیقت محسوس ہونے لگتے ہیں۔ میرے اوپر بھی دن کی روشنی نے یہی اثر کیا۔ دن نکلنے کا احساس میرے لیے سکون کا پیغام بر ثابت ہوا۔ میں اب تک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ نیم دراز ہو گیا۔ تکیے کی گندگی اور کمبل کی بدبو میرے لیے بے معنی ہو گئی اور پھر نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ گذشتہ دن اور رات کی جسمانی، روحانی اور ذہنی تھکاوٹ نے چشم زدن میں مجھے گہری نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

میری آنکھ کھلی تو ایک فوجی مجھ کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ ایک لمحہ تو میں اس کا چہرہ تکتا رہا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر باہر مجھے ایک بندوق بردار محافظ کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے بیدار کرنے والے سپاہی نے تپائی کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "ناشتہ کھا لو۔" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے چلا گیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ میں نے ایک لمبی جمائی لی۔ آنکھیں ملیں۔ رات کے واقعات بالکل خواب و خیال معلوم ہو رہے تھے۔ ایک پیتل کے تھال میں دو روٹیاں اور اچار تھا۔ ساتھ ہی ایک گلاس میں چائے بھاپ اڑا رہی تھی۔ کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی اس لیے میں نے محض چائے پینے پر اکتفا کیا۔ چائے گرم تھی اور اس نے میرے ذہن اور اعصاب کو خاصی تقویت پہنچائی۔ سارے دن کسی نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی۔

www.pdfbooksfree.pk

جب رات بھیگ گئی تو پھر وہی فوجی ایک تھال میں کھانا لے کر آیا۔ ناشتے والا تھال وہ اُٹھا کر واپس لے گیا۔ کھانے میں بھی دو روٹیاں اور آم کا اچار تھا۔ چائے کی جگہ ایک گلاس میں پانی تھا۔ بھوک نے بُرا حال کر دیا تھا۔ اِس لیے میں دونوں روٹیاں چٹ کر گیا اور پھر اِس بات پر افسوس کرنے لگا کہ مَیں نے ناشتے والی دو روٹیاں بھی کیوں نہ کھالیں۔

یہ رات بھی پہلی رات کی طرح ہی کٹی۔ ظلم و تشدّد کا شکار ہونے والوں کی چیخوں نے مجھے سونے نہیں دیا۔ اِس رات برابر والے کمرے کے علاوہ کچھ اور سمتوں سے بھی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں کی آوازیں بھی سُنائی دیتی رہیں۔ یہ رات پچھلی رات کے مُقابلے میں کہیں زیادہ اذیت ناک تھی۔ صُبح کی روشنی پھیلی تو میرے لیے سکون کا پیغام بھی لے کر آئی۔ پھر وہ ناشتہ اور رات گئے کھانے میں دو روٹیاں اور اچار۔ کھانے کے بعد مَیں نے پانی کا گلاس ختم بھی نہیں کیا تھا کہ پھر چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ کبھی میں کانوں کو بند کرتا کبھی اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلتا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح کمرے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل جاؤں۔ عذاب کی یہ رات اتنی لمبی تھی کہ کسی طرح اِس کی صُبح ہونے میں نہیں آتی تھی مگر ہر چیز کبھی نہ کبھی اختتام کو پہنچتی ہے۔ یہی قدرت کا اصُول ہے۔

خدا خدا کر کے رات ختم ہوئی اور مَیں نے سُکھ کا سانس لیا۔ رات بھر کے تھکے ہوئے پراگندہ اعصاب نے آرام لینے کی ٹھانی اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر ابھی پوری طرح سونے بھی نہ پایا تھا کہ دروازہ کھُلا اور وہی فوجی اندر داخل ہوا۔ مَیں نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اِس کے ہاتھ میں ناشتے کی تھالی موجود نہ تھی۔

"اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اُس نے میری چارپائی کو ٹھوکر ماری۔ مَیں نے اِس کے حُکم کی تعمیل کی۔ "میجر صاحب نے یاد کیا ہے۔" یہ کہہ کر اِس نے اپنی گن کا رُخ میرے سینے کی طرف کر دیا۔

مجھ سے آنکھیں تک نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ ذہن اور جسم تھکن اور دُکھن کا شکار تھا۔ مُسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے ٹانگیں اکڑ رہی تھیں۔ ناکافی خوراک نے جسم میں کمزوری پیدا کر دی تھی مگر حُکم حاکم مرگِ مفاجات۔ مَیں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے سے باہر نکلا تو برآمدے میں دو اور پہریداروں نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ مَیں اِن تینوں کی معیت میں چل پڑا۔ برآمدے میں سورج کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مُسلسل نیم تاریکی میں رہنے کی وجہ سے یہ روشنی میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھی اور میرے لیے پوری طرح آنکھیں کھولنا دشوار تھا۔

برآمدوں اور گیلری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ خاصا وسیع اور کُشادہ کمرہ تھا اور دفتر کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ میجر رام بھروسے میز پر کاغذوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میرے محافظوں نے سیلوٹ مارا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا اور اُنہیں جانے کا اشارہ کیا۔ دو محافظ باہر چلے گئے مگر جو شخص مجھے کھانا اور ناشتہ فراہم کرتا تھا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد بندوق تھان کر کھڑا رہا۔ چند منٹ تک میجر کاغذوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر کُرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پُشت پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

مَیں خاموش رہا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ "عہدہ کیا ہے؟"

مَیں پھر خاموش رہا۔ وہ ٹہلتا ہوا میرے نزدیک آ گیا۔ "کِس مشن پر آئے تھے؟"

مَیں اِس بار پھر خاموش رہا۔ میری نگاہیں سامنے دیوار پر آویزاں ایک پینٹنگ پر جمی ہوئی تھیں۔ جو کسی دیوی اور دیوتا سے تعلق رکھتی تھی۔

"جانتے ہو ہم بند زبان کو کھُلوانا جانتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے آدمی ہیں جو گونگوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں؟"

وہ چند لمحے مجھے گھُورتا رہا پھر دوبارہ ٹہلنے لگا۔

"تم نوجوان ہو۔ تمہیں فیوچر بنانا ہے۔ تم نے ابھی زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ لائف ایک ہی بار آدمی کو ملتی ہے اِس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ زندگی کے مزے لینا ہر آدمی کا حق ہے۔ چاہے سویلین ہو یا

فوجی۔ زندگی صرف میدانِ جنگ میں لڑنے اور جان دینے کا نام نہیں ہے جوان میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کو زیادہ آرام اور عشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مرنا جانتا ہے وہ زندگی سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کا بھی حقدار ہے۔"

وہ میرے سامنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور نرم آواز میں بولتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے مگر میرے کانوں تک اِس کی آواز پہنچ رہی تھی اور میرا ذہن وہ پیغام وصول کر رہا تھا جو وہ مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا۔

پھر اچانک وہ رُک کر مجھے گھُورنے لگا۔ "تمہارے ساتھیوں نے ہمیں بہت سی باتیں بتا دی ہیں مگر وہ بیوقوف تھے۔ اگر کوآپریٹ کرتے تو ہم اُنہیں بہت مزے کراتے۔ اب وہ دوبارہ اِس دُنیا میں واپس نہیں آسکتے مگر تم ابھی اِس دُنیا میں ہو۔ اِس دُنیا کی ہر چیز تمہارے لیے ہے۔ تم اپنی زندگی کو اپنے لیے زیادہ مزیدار اور انجوائے ایبل بنا سکتے ہو۔ ہر چیز کا کوئی مطلب ہوتا ہے جوان۔ کوئی مینِنگ ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی کا بھی کوئی مطلب ہے۔ بولو، زندگی سے پیار کرتے ہو؟"

اِس کے لہجے کی نرمی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ جتنا ظالم اور کرخت نظر آتا تھا آج اِس کا رُوپ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ آسان لہجے میں کسی ماہرِ نفسیات کے انداز میں بول رہا تھا۔ اُس کا سلوک ایک مُشفق، ہمدرد اور مہربان جیسا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک اکھڑ فوجی افسر ہے۔

مَیں اِس کے باوجود خاموش رہا۔ مَیں جانتا تھا کہ خاموشی ہی میں نجات ہے۔ ایک بار مَیں بول پڑا تو سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ مجھے بھی اُسی گروپ کا ایک رُکن تصور کرتے ہیں جس سے تعلق رکھنے والے تین آدمیوں کو انہوں نے ہلاک کر دیا۔ اِس دوران میں انہوں نے علاقے کا کونہ کونہ چھان مارا ہو گا تاکہ میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی ڈھونڈ نکالیں۔ بہت سے بے گناہ بھی اُن کے ظلم کا نشانہ بنے ہوں گے مگر اِس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ وہ مجھے ایک اہم شکار سمجھتے ہیں۔ یہ محبت بھرے الفاظ اور مہربانی کا انداز ایک جال ہے۔ وہ مجھ سے سارے راز اُگلوانا چاہتے ہیں اور مَیں نے مصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ آخر دم تک زبان نہیں کھولوں گا۔ اِس کے نتیجے میں مجھ پر جو ستم ڈھائے جائیں گے مجھے اِن کا بخوبی اندازہ ہو چُکا تھا مگر میں ذہنی اور جسمانی طور پر اِس امتحان کے لیے بالکل تیار تھا۔

میرے چُپ رہنے سے وہ ناراض نہیں ہوا۔ مُسکرا کر بولا: "تُم نوجوان ہو۔ دِل میں اُمنگیں ہیں، جذبات ہیں، زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ ایک طرف زندگی کا بُلاوا ہے اور دوسری طرف موت کا۔ مَیں جانتا ہوں کہ ایک فوجی کے لیے فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے مگر یاد رکھو۔ میری بات مانو گے تو تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا۔ کون سی چیز ہے جو ہم تمہیں نہیں دے سکتے؟ تمہاری کم عُمری پر مجھے ترس آتا ہے۔ ابھی تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دِن ہیں۔ جنگ کی کٹھن زندگی تمہارے لیے نہیں ہے جوان مَیں تمہیں سوچنے کے لیے پُورا موقعہ دوں گا مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ چوبیس گھنٹے بعد تمہیں زندہ رہنے کا ایک اور چانس دیا جائے گا۔ مجھے وشواس ہے کہ تم اسے کھونا پسند نہیں کرو گے۔"

اِس نے میرا شانہ تھپکا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرانے لگا۔ "کیوں؟ ہے نا ٹھیک بات؟" مَیں نے اپنی نظریں ہٹا کر دوبارہ سامنے والی تصویر پر جما دیں۔

اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں محافظ اندر آ گئے۔ انہوں نے میجر کو سیلوٹ کیا اور اٹنشن کھڑے ہو گئے۔

اچانک میجر مجھ سے مخاطب ہوا: "تمہارا نام کیا ہے؟"

بے اختیار میرا نام میری زبان پر آتے آتے رہ گیا۔ مَیں نے عین وقت پر اُس کا یہ اچانک وار خالی کر دیا اور پھر خاموش کھڑا رہا۔

"خیر۔ ابھی تمہارا نام بارہ نمبر ہے۔" پھر وہ فوجیوں سے مخاطب ہوا۔ "بارہ نمبر کو کیپٹن کرشنل کے پاس لے جاؤ۔"

www.pdfbooksfree.pk

مَیں خاموشی سے اپنے محافظوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا۔ ایک فوجی ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ بوسیدہ عمارت کی بجائے اس بار ہمارا رُخ دو منزلہ حویلی کی طرف تھا۔ حویلی کا بڑا پھاٹک کھُلا ہوا تھا۔ ایک فوجی جیپ اِس میں سے باہر نکل کر دھول اُڑاتی ہوئی ایک طرف روانہ ہوگئی۔ ہم پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ وسیع اور کشادہ عمارت کے وسط میں ایک کافی بڑا باغ ہے۔ یہ کسی راجہ یا بڑے تعلقدار کی رہائش گاہ رہی ہوگی اور یہ باغ عمارت کا پائیں باغ ہوگا مگر باغ کی کس مپرسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اصل مکینوں کی غیر موجودگی میں اِس کی زیادہ دیکھ بھال نہیں کی جا رہی۔ ویسے بھی زمانہ جنگ میں پھولوں اور باغوں کی نگہداشت پر کون توجہ دیتا ہے۔ پائیں باغ کی پتھریلی پگڈنڈی سے گزر کر ہم ایک اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہ عمارت نسبتاً بہتر حالت میں تھی۔ دروازوں پر پالش چمک رہی تھی۔ سیاہ اور سفید پتھروں کا فرش بھی بہت اچھی حالت میں تھا۔ برآمدے میں کئی جگہ آئینے لگی ہوئی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں ٹوپیاں اور لباس لٹکانے کے لیے پیتل کی کھونٹیاں نصب ہوتی ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہ فیشن میں داخل تھا مگر اب یہ فرنیچر متروک ہو چکا ہے۔ فوجیوں نے اِس عمارت کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تو یہاں کی تمام چیزوں کو استعمال میں لے آئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وسیع اور شاندار عمارت نہ صرف ان کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا بلکہ اِس کا ایک حصّہ آفیسرز میس اور کلب کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اِس کا اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا مگر جب میں محافظوں کی معیت میں ایک سیاہ چوبی دروازے سے گزر کر ایک وسیع اور کشادہ ہال میں داخل ہوا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ ہال میں چوکور سیاہ اور سفید ماربل کا فرش تھا اور یہ ڈائننگ ہال کے طور پر بھی استعمال ہو رہا تھا۔ ایک طرف کاؤنٹر کے پیچھے مختلف برانڈز کی شرابوں کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے کی میز پر ہر قسم کے گلاس اور پیمانے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا بار مین سفید اپرن گلے میں ڈالے اِن پیمانوں کو کپڑے سے چمکانے میں مصروف تھا۔ ہال میں چار وسیع اور بلند دروازے تھے اور درمیان سے کشادہ اور خوبصورت سیڑھیاں اُوپر جا رہی تھیں۔ ہال میں دیواروں کے ساتھ صوفے اور بید کی کرسیاں اور اُن کے سامنے لکڑی کی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک اور وسیع گیلری میں پہنچے۔ گیلری میں قریباً نصف درجن دروازے تھے۔ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر محافظ نے دستک دی۔ دروازہ ایک فوجی نے کھولا۔

"میجر صاحب نے کپتان صاحب کے پاس بارہ نمبر کو بھیجا ہے۔"

دروازہ پورا کھُل گیا اور دروازہ کھولنے والے فوجی نے مجھے اپنی برین گن کی پناہ میں لے لیا۔ تینوں محافظ لوٹ گئے۔ ماربل کے فرش پر اُن کے فوجی بوٹوں کی کھٹ کھٹ دیر تک مجھے سُنائی دیتی رہی۔ میرے سامنے ایک کافی بڑا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑی سیاہ لکڑی کی میز رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں اِس بڑی میز اور چند کرسیوں کے علاوہ کوئی اور فرنیچر موجود نہیں تھا۔ میز کی عقب والی دیوار میں دو لمبی فرنچ طرز کی کھڑکیاں تھیں جن کے شیشوں میں سے باہر باغ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ اِن کھڑکیوں کے بالائی حصّے میں نیلے رنگ کے شیشے لگے ہوئے تھے۔ بڑی میز کے پیچھے بیٹھنے والی شخصیت کو دیکھ کر مَیں ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا کیونکہ یہ ایک قبول صورت عورت تھی جس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ شانوں پر لگے ہوئے فیتے ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کیپٹن ہے۔ اِس کے بال مردانہ انداز میں ترشے ہوئے تھے اور اِس کے گندمی چہرے پر بھلے لگ رہے تھے۔ اُس کے سامنے میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی فوجی ٹوپی بھی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

فوجی نے اُسے سلیوٹ مارا تو اُس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں۔ وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک کشیدہ قامت اور نہایت متناسب جسم کی پختہ عورت تھی۔ فوج میں کیپٹن کے عہدے تک پہنچنے کے باوجود اُس میں نسوانیت باقی تھی۔ وہ زیر لب مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی اور نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی۔

"ہوں۔ تو تم ہو نمبر بارہ؟"

www.pdfbooksfree.pk

میں خاموشی اُس کو دیکھتا رہا۔

"بیٹھو۔" اُس نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اردلی۔" وہ مسلح محافظ سے مخاطب ہوئی: "اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔" پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی: "کچھ کھاؤ گے چائے کے ساتھ؟" اُس کا انداز دوستانہ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے سے مدت سے شناسا ہیں اور آج کافی دن بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے جواب میں صرف اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا۔

"دیکھو۔ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کا سامان بھی لانا۔ ٹھیک ہے؟" اردلی سلیوٹ مار کر رخصت ہو گیا تو اُس نے ایک بار پھر مسکرا کر مجھے دیکھا: "کیا نام ہے تمہارا؟"

میں خاموش رہا۔ وہ پھر مسکرائی: "بتانا نہیں چاہتے تو نہ بتاؤ۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم اُن تینوں کے ساتھ پیراشوٹ سے ڈراپ ہوئے تھے؟" اُس کا لہجہ بے تکلفانہ تھا۔

"میں انہیں نہیں جانتا۔" خاموش رہنا اب میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

"کس لیے یہاں آئے ہو؟" وہ واپس جا کر دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "کوئی تو مشن ہو گا تمہارا؟" اُس نے اپنی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔

"دیکھیے کیپٹن......"

"میرا نام کیپٹن ٹی۔ آر۔ کرشنا ہے۔" وہ مسکرا کر بولی: "مس ٹی۔ آر۔ کرشنا۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے اخلاقاً کہا۔

"ویری گڈ۔ تمہیں منیرز بھی آتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ اُس کے دانت ہموار، سفید اور چمکدار تھے۔ وہ ایک اچھی خاصی خوش شکل عورت تھی۔ ایسی عورت کا بھلا فوج میں کیا کام ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا وہ تو دوسرے محاذوں پر بھی فتوحات کرنے پر قادر تھی۔

"دیکھو نمبر بارہ۔ ہمارے ملکوں کی فوجوں میں لڑائی ہو رہی ہے مگر میری تو تم سے کوئی لڑائی نہیں ہے نا! اس لیے مجھے اپنا دوست ہی سمجھو۔ ٹھیک ہے؟" اُس کا ٹھیک ہے کہنے کا مخصوص انداز تھا اور وہ گردن ایک طرف جھکا کر فقرے کے آخر میں یہ جملہ کہنے کی عادی تھی۔

میں نے کہا: "مگر ہم دونوں کا تعلق بھی تو فوج سے ہے۔ فوجیوں کی آپس میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ فوجوں کی لڑائی ہوتی ہے اس لیے جب تک جنگ جاری ہے ہم دونوں بھی میدانِ جنگ میں ہیں۔"

"تعلیم یافتہ معلوم ہوتے ہو۔" وہ ہنسنے لگی: "کیا کالج کے زمانے میں ڈی بیٹ میں حصہ لیا کرتے تھے؟"

میں نے سر ہلا دیا: "تب ہی تم نے جواب میں ایک تقریر جھاڑ دی۔ مگر یہ تو مانو گے کہ کم از کم یہ کمرہ میدانِ جنگ نہیں ہے۔ اس لیے سمجھو ہم دونوں کے بیچ سیز فائر ہے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا جو ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی۔ پھر عدم تعاون اور خاموش رہنے سے فائدہ؟!

اردلی چائے کی ٹرے لے کر اندر آ گیا اور میز پر رکھ کر بنانے لگا: "نہیں، تم رہنے دو۔ میں خود بنا لوں گی۔ تم جاؤ۔" اردلی کمرے سے باہر چلا گیا تو وہ اُٹھ کر چائے کی ٹرے کے پاس پہنچ گئی۔ "چائے بنانا ہر کسی کو نہیں آتا اور فوج کے اردلی سے تو یہ اُمید رکھنا ہی بیکار ہے۔" اُس نے بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دی: "لو کھاؤ۔ شکر کتنی پیو گے؟"

"دو چمچ۔" میں نے ایک بسکٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ چائے پیالیوں میں ڈالنے میں مصروف تھی۔ میں نے اُس کا بھرپور جائزہ لیا۔ فوجی وردی اُس کے کشیدہ قامت پر سج رہی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جو ہر لباس میں سج سکتی تھی۔ کم از کم فوجی ملازمت اُس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں نے دوسرا بسکٹ چباتے ہوئے سوچا۔

اُس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ دی۔ "سوچ رہے ہو میں فوج میں کیوں آ گئی؟" وہ مسکرائی اور میرے سامنے والی پلیٹ میں سے ایک بسکٹ اُٹھا لیا۔ "مجھے فوجی وردی بہت اچھی لگتی ہے۔ میرے پتا جی بھی فوج میں تھے۔"

"مگر کیا یہ نازک عورتوں کے لیے سخت زندگی نہیں ہے؟" میں بھی اب گفتگو کے موڈ میں تھا۔

"عورتیں اتنی نازک نہیں ہوتیں جتنا کہ مرد سمجھتے ہیں۔ دُنیا کا ہر کام کر سکتی ہیں۔ ہمارے دیس تو بیک ورڈ ہیں۔ دوسرے ملکوں میں دیکھو، عورتیں کیا نہیں کرتیں؟ مگر میں لڑنے والی فوج میں نہیں ہوں، میں تو ڈاکٹر ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔ میجر رام بھروسے نے مجھے ایک ڈاکٹر کے حوالے کیوں کر دیا تھا! وہ اپنی چائے کی پیالی لے کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر چائے پینے لگی۔ پھر ایک دم ہنس پڑی: "جب میں چھوٹی تھی تو پرچ میں ڈال کر چائے پیتی تھی، سُڑپ سُڑپ کر کے۔ سب لوگ مجھ پر خفا ہوتے تھے مگر پرچ میں چائے ڈال کر پینے میں بہت مزہ آتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میں نے اُس کی تائید کر دی۔ گرم چائے اور بسکٹوں نے میرے جسم میں حرارت اور توانائی پیدا کر دی تھی۔ مگر پچھلے دنوں کی تھکان اور نہ سونے کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو پیالی اُٹھا کر اُٹھ کھڑی ہوئی: "ارے۔ تمہیں تو بہت نیند آ رہی ہے۔ رات جاگتے رہے ہو کیا؟"

میں اُسے کیا بتاتا کہ جس ماحول میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں صرف مُردے ہی سو سکتے ہیں۔

"تم تھکے ہوئے بھی ہو۔" اُس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ اُردلی اندر آ کر اٹنشن ہو گیا۔ "دیکھو۔ انہیں گیسٹ ہاؤس میں لے جاؤ۔ اِن کے آرام کا خیال رکھنا۔ ٹھیک ہے؟" اُس نے ایک بار پھر گردن ایک طرف جھکا کر پوچھا۔ جواب میں اُردلی نے "یس سر" کا نعرہ مارا اور پھر مجھ سے کہا: "اُٹھیے سر۔" میں نے سوالیہ نظروں سے کیپٹن کرشنا کی طرف دیکھا: "جاؤ جاؤ آرام کر لو۔ پھر اس کے بعد باتیں کریں گے۔" میں چائے پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ دوسری پیالی پینے کی خواہش بھی تھی مگر وقت کا تقاضا کچھ اور تھا اس لیے چپ چاپ اُٹھ کر اردلی کے پیچھے ہو لیا۔

ایک دو برآمدوں سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے برآمدے میں پہنچے جو حویلی سے ملحق تو تھا مگر انیکسی کی حیثیت رکھتا تھا۔ صاف سُتھری جگہ تھی۔ برآمدے میں چند گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ اُردلی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا۔ ایک طرف بیڈ تھا۔ سائیڈ میں ایک سنگھار میز رکھی اور اس کے سامنے سٹول رکھا ہوا تھا۔ بید کی دو آرام کرسیاں بھی کمرے میں موجود تھیں۔ فرش پر رنگین دری بچھی ہوئی تھی۔ ابھی میرا جائزہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ اردلی نے دروازہ بند کر دیا اور پھر باہر سے قفل لگانے کی آواز آئی۔ گویا کیپٹن کرشنا کے تمام تر دوستانہ رویے کے باوجود میں ایک قیدی تھا۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر کرشنا کے بارے میں کچھ سوچنے کی کوشش کی مگر نیند کا ایک شدید جھونکا آیا اور میں بستر پر گر گیا۔

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ میں بہت گہری نیند سویا ہوا تھا۔ بمشکل آنکھیں کھلیں۔ اردلی نہ جانے کتنی دیر سے کھلے دروازے میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا اور اندر آنے کی اجازت طلب کرنے کے لیے بندوق سے دروازہ بجا رہا تھا۔ میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھا تو وہ اندر داخل ہوا۔ کھانے کی ٹرے اُس نے سنگھار میز پر رکھ دی: "سر منہ ہاتھ دھونا ہو تو باتھ روم اُدھر ہے۔" اُس نے انگلی سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی نیند کی وادی میں گم ہو گیا تھا اس لیے میں نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم کے دروازے کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔ یہ غسل خانہ بھی خاصا وسیع تھا۔ ایک طرف نہانے کا ٹب لگا ہوا تھا۔ فلش خاصے پرانے زمانے کا تھا مگر ٹھیک کام کر رہا تھا۔ غسل خانے میں صرف ایک روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کہنے کو یہ گیسٹ روم تھا مگر قفس کی تیلیاں بھی صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ میں واپس کمرے میں گیا تو اردلی رخصت ہو چکا تھا۔ ٹرے میں مختلف قسم کی سبزیاں، دالیں اور پاپڑ رکھے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تھے۔ روٹی کی جگہ پوریاں تھیں۔ سنگھار میز پر ایک تھرمس بھی رکھا ہوا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ اردلی یہ ابھی رکھ کر گیا تھا یا وہ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ کئی دن کے بعد میں نے پیٹ بھر کر لذیذ کھانا کھایا۔ ابھی دو چار ڈکاریں ہی لی تھیں کہ دروازہ پھر کھلا اس بار اردلی چائے کی پیالی لے کر آیا تھا۔ اُس نے برتن سمیٹنے ختم نہیں کیے تھے کہ میں نے چائے کی پیالی خالی کر دی اور دوبارہ لبستر پر لیٹ گیا۔

"اور کوئی چیز سر؟" اردلی نے جاتے جاتے مجھ سے پوچھا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ نیند اتنی گہری اور بے خبر تھی کہ کوئی خواب بھی نہ دیکھ سکا۔ جب نیند سے بیدار ہوا تو کمرے میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور کوئی ملائم چیز میری گردن اور کانوں کو چھو رہی تھی۔ میں بے اختیار چونک کر اُٹھ گیا۔ رات ہو چکی تھی اور کمرے میں دو بلب روشن تھے جن کی صاف روشنی میں مجھے نہ صرف کمرے کی تمام چیزیں بالکل واضح طور پر نظر آ رہی تھیں بلکہ میں اضافی چیز کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ اضافی چیز ایک طرح دار عورت تھی جو سُرخ پھولدار ساڑھی اور اسی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ بیدار ہوتے ہی مجھے جس خوشبو کا احساس ہوا تھا وہ اُس کے لباس سے بھی پھوٹ رہی تھی۔ میں چونک کر ایک دم اُٹھا تو اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا جو اس سے پہلے میری گردن اور کان پر گدگدی کر رہا تھا۔ مجھے اُٹھتے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور سیاہ سُرمگیں آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں سمٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔

وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ "میرا نام سُجاتا ہے۔ کیوں کیسا نام ہے؟" اُس نے پوچھا میں خاموش حیران نظروں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

"ایسے کیوں تک رہے ہو۔ پہلے کبھی عورت نہیں دیکھی؟" وہ لگاوٹ سے مسکرائی۔ میں پھر بھی خاموش رہا تو وہ میری طرف کھسک آئی اور ایک اچھے انگریزی سینٹ کی خوشبو نے میرے دماغ کو معطر کر دیا۔

"مجھے کرشنا نے تمہاری سیوا کے لیے بھیجا ہے۔ اپنے مہمانوں کی وہ بہت دیکھ بھال کرتی ہے۔" اُس نے اپنے شانوں پر بکھری ہوئی زُلفوں کو ایک جھٹکے سے گردن کے پیچھے پھینکتے ہوئے کہا۔ میں بیڈ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے؟" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

"کہاں جا سکتا ہوں۔ غسل خانے میں ہاتھ منہ دھونے جا رہا ہوں۔" میں نے چڑچڑے لہجے میں جواب دیا۔

میں غسل خانے سے واپس آیا تو وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی آئینے میں اپنا سراپا دیکھ رہی تھی۔ "کیوں کیسی لگتی ہوں؟" اُس نے میری طرف پلٹے بغیر پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ تیزی سے پلٹ کر میرے پاس آ گئی۔ "بولتے کیوں نہیں ناراض ہو گیا؟"

"ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ اُس خوبصورت عورت نے خواہ مخواہ مجھے غصّہ دلا دیا تھا۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا مگر پھر بھی مجھے اُس پر غصّہ آ رہا تھا۔

"کھانے سے پہلے کچھ پیو گے؟" وہ اٹھلائی اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل اُٹھا کر میری طرف بڑھی۔

"میں مسلمان ہوں۔ شراب نہیں پیتا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"بہت سے مسلمان پیتے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"بہت سے ہندو گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔" میرا غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک لمحہ وہ آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھتی رہی۔ پھر ہولے سے مسکرائی۔ "خفا کیوں ہوتے ہو؟ نہیں پیتے تو زبردستی نہیں کروں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے شراب کی بوتل کھولی اور میز پر رکھے ہوئے دو گلاسوں میں سے ایک گلاس میں تھوڑی شراب اُنڈیلی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی پھر ایک دم وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آر یو شیور۔ بالکل نہیں پیو گے؟"

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ خاموشی سے ایک آرام کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے چند گھونٹ میں گلاس خالی کر

...یا۔ خالی گلاس کو کچھ دیر انگلیوں میں گھما کر غور سے دیکھتی رہی پھر گلاس سنگھار میز پر رکھ کر میرے سامنے والی آرام کُرسی پر ...م دراز ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا وہ اِس سے پہلے بھی شراب پیتی رہی ہے ...نہ چند گھونٹ اتنی جلدی ایسی کیفیت پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر سرگوشی کے انداز میں ...لی: "شراب سے بالکل لگاؤ نہیں ہے؟ مگر اور چیزوں سے تو ہے نا؟" پھر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

وہ خاصی دلفریب اور صحت مند عورت تھی مگر مجھے اُس کا وجود بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ شاید اُس کی آوارہ مزاجی نے ...ُے متنفر کر دیا تھا یا پھر میرے لاشعور نے مجھے وارننگ دے دی تھی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے مجسم دعوت بنی بیٹھی تھی۔ ...ُے کوفت محسوس ہونے لگی۔ میں ایک دم کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر جانے کے لیے اور جگہ نہ تھی۔ میں بلا ارادہ کمرے میں ...ہلنے لگا۔ سُجاتا کچھ دیر اَدھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر سنگھار میز کے پاس جا کر اُس نے گلاس میں شراب ...نڈیلنی شروع کر دی۔ میں بیزاری سے دیکھتا رہا۔ پھر غسل خانے کی طرف بڑھا۔ فی الحال نجات کی صرف یہی جگہ تھی میرے لیے۔ ...روازے پر پہنچ کر میں پلٹا اور میں نے سُجاتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سنو۔ کیا تم مجھ پر ایک مہربانی کر سکتی ہو؟"

"مہربانی مت کہو۔ میں تمہاری داسی ہوں، حکم کرو۔"

"میرے کمرے سے چلی جاؤ۔"

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا اور غصّے اور حیرت کے تاثرات اُس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔

"مجھے اِن چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی اگر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ پلیز"

اُس کا جواب سُنے بغیر میں نے غسل خانے کے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ سامنے ٹب تھا۔ مجھے غسل کی ضرورت بھی تھی اور ...ں کچھ وقت بھی ضائع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کپڑے اُتار کر ٹب میں بیٹھ گیا۔ ٹب کا پائپ میں نے کھول لیا۔ پانی رفتہ رفتہ ٹب ...یں بھرنے لگا۔ میں نے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیم گرم پانی نے میرے جسم اور دماغ پر آسودگی اور سکون کی چادر سی اُڑھا دی۔ نہ جانے کتنی دیر میں آنکھیں بند کیے غسل سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ٹب لبالب بھر گیا اور پانی لبریز ہو کر اس کے کناروں سے باہر گرنے لگا تو میں چونکا۔ دِن بھر کی گہری نیند نے مجھے وہ آرام اور سکون نہیں بخشا تھا جو اِس غسل سے مجھے حاصل ہوا۔ نہایت آہستگی اور کاہلی سے میں نے ٹب سے باہر نکل کر ایک بڑے تولئے سے اپنے جسم کو رگڑ رگڑ کر خشک کیا اور پھر اپنی میلی وردی زیب تن کر لی۔ اب میں ایک چست و چالاک انسان تھا جس کا جسم اور ذہن دونوں تازہ دم ہو چکے تھے۔ غیر ارادی طور پر میری ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکلنے لگی۔ سارے رنج، سارے آلام، ساری تکلیفیں پل بھر میں غائب ہو چکی تھیں۔ فی الوقت میں ایک نارمل انسان تھا۔ اپنے گرد و پیش کے حالات سے بے پروا۔

غسل خانے کا دروازہ کھول کر میں کمرے میں داخل ہوا تو میری سیٹی کی آواز خود بخود بند ہو گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سُجاتا اب تک رُخصت ہو چکی ہو گی مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس کے برعکس سُجاتا جسے میں سنگھار میز کے سامنے کھڑی چھوڑ کر گیا تھا بستر پر دراز تھی۔ شراب کی بوتل نصف کے لگ بھگ خالی ہو چکی تھی اور گلاس فرش پر اس کے قدموں کے پاس پڑا تھا۔ اُس کے بال بکھر کر شانوں اور جسم پر پھیل گئے تھے اور ساڑھی اِس نسبت سے سمٹ گئی تھی۔ وہ اپنی کاجل لگی نیم وا مدہوش آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے بازو میری طرف پھیلے ہوئے تھے۔

میں دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا صرف میری طرف پھیلے ہوئے دونوں بازوؤں کو جھٹک کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا۔ بستر کے نزدیک پہنچ کر میں نے اُس کے بستر پر بکھرے ہوئے وجود کو دیکھا اور پھر اُس کے بازوؤں پر نگاہ کی اور پھر میری دبی ہوئی خواہش ایک دم بیدار ہو گئی۔ ایک تیز اور گرم لہر میرے جسم سے اُٹھی اور میرے دماغ تک دوڑ گئی۔ میں نے اُس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر جھٹکا دیا اور وہ ایک سسکی کے ساتھ کھنچی چلی آئی۔ میرا غصّہ اور میری نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے پر

www.pdfbooksfree.pk

ایک زور دار طمانچہ رسید کیا اور اتنی زور سے اُسے جھنجھوڑا کہ وہ سَر سے پیر تک لرز گئی۔ پھر مَیں اُسے گھسیٹ کر دروازے طرف لے گیا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند تھا۔ مَیں نے ایک ہاتھ سے حیران اور مدہوش سُجاتا کو تھا دوسرے ہاتھ سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ "دروازہ کھولو، کھولو دروازہ۔ کھولو۔" میری چیخیں سُن کر اَردلی لپک کر آ دروازہ کھلتے ہی مَیں نے نفرت سے سُجاتا کو ایک جھٹکا دیا اور وہ اَردلی کی بانہوں میں جا گری۔ وہ اِس اچانک حادثے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر قوی ہیکل فوجی نہ ہوتا تو اُس کے بوجھ سے گر جاتا۔ سُجاتا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ غصّے اور ا کی شدّت سے اُس کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اُس نے دانت پیس کر مجھے للکارا۔ "راکھش۔ وَردھی۔ مَیں تجھے جان مار دوں گی!" وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ اُس کے پنجے کسی چُڑیل کی طرح میرے چہرے کی طرف بڑھے۔ مگر مَیں نے اُس دونوں کلائیاں مضبوطی سے تھام کر اُسے ایک بار پھر جھنجھوڑ دیا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔ مَیں تم جیسی ذلیل عو کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔"

اُس نے کلائیاں چھڑانے کے لیے بہت زور لگایا۔ اِس وقت اُس کے نازک جسم میں ایک وحشیانہ قوّت پیدا ہو تھی مگر مَیں نے اُس کی کلائیاں نہیں چھوڑیں۔ اُس نے دانتوں سے کاٹنے کے لیے اپنا چہرہ آگے بڑھایا مگر مَیں نے جھٹکے اُس کا جسم پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ جب کوئی اور بس نہ چلا تو اُس نے میرے مُنہ پر تھوک دیا۔ مَیں نے اسے دھکا دیا وہ دوبارہ لڑکھڑاتی ہوئی اَردلی پر جا گری۔ اِس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھ پر جھپٹتی مَیں نے کمرے میں داخل ہو کر درواز کر لیا۔ اُس نے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ چلّا رہی تھی۔ "اوپن دی ڈور۔ یُو آر ایڈیٹ۔ آئی ہیٹ یُو۔ آئی یو۔ آئی وِل کِل یُو۔"

شاید اَردلی اُسے تسلّی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مِس صاب۔ مِس صاب۔ بس کرو مِس صاب" اِس کے بعد آواز ہوتی چلی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اَردلی اُسے زبردستی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہو گا۔ مَیں کُرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ ا ڈرامے کا اگلا سین کیا ہو گا؟ بہرحال جو بھی ہو مَیں اِس کے لیے پُوری طرح تیار تھا۔

کُچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ مَیں نے اندر سے بند کر رکھا تھا۔ "کون ہے؟" مَیں نے آواز میں دریافت کیا۔

"دروازہ کھولو صاب۔" یہ اَردلی کی آواز تھی۔ مَیں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے بندوق بردار اَردلی کھ تھا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اُس کے پیچھے چار اور مسلّح فوجی میری طرف اِس طرح بندوقیں تانے کھڑے تھے جیسے مجھے فائرنگ سے اُڑا دینے کا حُکم ہوا ہے اور وہ اِس حُکم کی تعمیل کے لیے آئے ہیں۔

"چلو۔" اَردلی کے لہجے کی دُرشتی اور آواز کی کرختگی میں واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے بندوق سے اِشارہ ک مَیں خاموشی سے اِن لوگوں کے ساتھ چل پڑا۔ ہم اُن ہی راستوں سے گُزرے جہاں سے ہو کر گیسٹ روم میں آئے تھے۔ کی دو منزلہ عمارت میں اِس وقت زندگی کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہو رہے تھے۔ مَیں موسیقی کی اور ہنسنے بولنے کی آواز سکتا تھا۔ پوری عمارت روشن تھی۔ ہمارا مختصر قافلہ ڈاکٹر کرشنا کے دفتر میں جا کر رُک گیا۔

کیپٹن کرشنا کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ مگر اُس کے بُشرے سے بے چینی اور غصّہ نمایاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی میری طرف لپکی: "کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ آر یو میڈ؟" وہ بلند آواز میں چلّائی۔ مَیں خاموش رہا۔ وہ کُچھ دیر مجھے خونخوار نظ سے گھُورتی رہی، مگر پھر رفتہ رفتہ اُس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ "تم لوگ جاؤ۔" اُس نے محافظوں سے کہا۔ اَرد جگہ کھڑا رہا۔ "تم بھی جاؤ۔" اَردلی نے سلیوٹ مارا اور رُخصت ہو گیا۔

وہ میری طرف بڑھی اور نرم آواز میں کہنے لگی: "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سُجاتا کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے تمہیں نہیں آئی؟ مَیں تو تمہیں جنٹلمین سمجھتی تھی۔"

مَیں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "لاج تو سُجاتا کو آنی چاہیے تھی کیپٹن۔ مَیں شریف آدمی ہوں۔ آوارہ رتوں کی کمینی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ جانتی ہیں اُس نے کیا حرکتیں کِیں میرے کمرے میں؟"

"اوہ۔ آئی ایم سوری۔" وہ مُسکرائی۔ "وہ ذرا آزاد خیال عورت ہے۔"

"مگر مَیں اتنا آزاد خیال نہیں ہوں۔ شراب پیتی ہوئی عورت کو دیکھ کر میرا لہو کھول اُٹھتا ہے۔ اور وہ..... وہ تو..... تو....." مَیں کوئی مناسب لفظ تلاش کرنے لگا۔

وہ ہنس پڑی۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ مَیں سمجھ گئی۔" پھر وہ اپنی کُرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ "دیکھو۔ تم جانتے ہو کہ آجکل ب وار ہو رہی ہے میرے اور تمہارے دیش کے بیچ اور تم ہمارے علاقے میں پکڑے گئے ہو۔"

"یہ کون نہیں جانتا۔" مَیں نے جواب دیا۔

"تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وار میں پکڑے جانے والے فوجیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ میجر بہت غصّے میں ہے نم سے پُوچھ گُچھ کرنا چاہتا ہے مگر تم نے ابھی تک اپنا نام تک نہیں بتایا۔"

مَیں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

یکایک فوجی بوٹوں کے تیز تیز چلنے اور بلند آواز میں کسی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ مَیں نے پلٹ کر دروازے طرف دیکھا۔ چند لمحے بعد میجر رام بھروسے دروازے میں نمودار ہوا۔ چند فوجی اُس کے ساتھ تھے۔ وہ سب باہر ٹھہر گئے۔ میجر نے کمرے ں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور مجھے گھُورنے لگا۔ پھر وہ کیپٹن کرشنا کی طرف متوجہ ہوا جو کُرسی سے اُٹھ کر اٹینشن کھڑی ہو ی تھی۔

وہ غصّے میں بول رہا تھا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ نان سنس۔ کیا رزلٹ نکلا ہے؟! زیرو فوجیوں پر سائیکالوجی آزمانے چلی د۔ مائی فُٹ۔ فوجی کی صرف ایک سائیکالوجی ہوتی ہے۔ بندوق۔"

پھر وہ میری طرف آیا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟ رینک کیا ہے؟"

مَیں خاموش رہا۔

"کس لیے آئے تھے یہاں۔ مشن کیا ہے تمہارا؟ اُن تین آدمیوں کے علاوہ اور کون کون تمہارے ساتھ تھا؟"

مَیں خاموش رہا۔ اچانک بجلی سی کوندی اور اُس کا زبردست تھپڑ میرے مُنہ پر لگا۔ طمانچے کی ضرب سے میرا مُنہ پھر گیا اور چہرہ سُنسنانے لگا۔

"بولو۔ جواب دو۔ کیا نام ہے تمہارا؟" وہ گرج کر بولا۔ مگر مَیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا اور یرے چہرے پر فولادی گھونسے کی طرح لگا مگر اِس بار مَیں تیار تھا۔ اِس لیے چوٹ اتنی زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ میرے خاموش ہنے پر وہ غصّے سے دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے مجھ پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی یہاں تک کہ اُس کی سانس پھُول ئی اور وہ تھک گیا۔ "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟" اُس نے میرا گلا پکڑ لیا۔ مگر مَیں نے بھی اپنے آپ سے نہ بولنے عہد کر لیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی آہنی گرفت میرے گلے پر تنگ ہوتی گئی یہاں تک کہ میرے لیے سانس لینا دوبھر ہو یا۔ لگتا تھا شاید دیوانگی کے جوش میں وہ میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار ڈالے گا مگر جب میرے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے ں تو اُس نے ایک جھٹکے سے میرا گلا چھوڑ دیا۔ مَیں بے جان سا ہو کر فرش پر گر گیا مگر میجر کا غصّہ کم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ی لمحے وہ میرے سَر پر کھڑا تھا۔ "بولو۔ جواب دو۔ کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟" اُس نے میری پُشت، پیٹ اور ٹانگوں پر ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں مگر مَیں نے ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ کُچھ دیر مَیں مضبوطی سے ہونٹ بھینچے رہا مگر میرے وش و حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ چند لمحے بعد مَیں بے ہوش ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو مَیں بدستور فرش پر پڑا ہوا تھا۔ مَیں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ میرا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ہاتھ پیر کو حرکت دینے سے ٹیس سی اُٹھتی تھی۔ مَیں نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور بے اختیار میرے مُنہ سے

www.pdfbooksfree.pk

کراہ نکل گئی۔ یہ کوئی اور کمرہ تھا۔ اس پرانے کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ یہاں تک کہ فرش پر دری تک نہیں تھی۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہا تھا مگر اتنا احساس ضرور ہوا کہ ابھی رات باقی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ پیروں کو پھیلانے کی کوشش کی اور بمشکل اپنی چیخوں کو ضبط کیا۔ کچھ دیر میں چھت سے لٹکے ہوئے گندے اور گرد آلود بلب کو دیکھتا رہا جسے مہینوں سے شاید کسی نے صاف کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ فرش پر بھی مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی جس نے میرے لباس کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ کچھ دیر تک میں بلب کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر میری آنکھیں دوبارہ بند ہوگئیں اور دماغ پر اندھیرا سا چھا گیا۔

دوبارہ ہوش آیا تو دن کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بلب بدستور روشن تھا مگر دن کی روشنی میں مدھم دیئے کی طرح لگ رہا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اس بار میرے جسم نے بھی دماغ کا ساتھ دیا۔ میں آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھا اور پھر کھڑا ہوگیا۔ کمرے میں ایک دروازے اور ایک روشن دان کے سوا اندر آنے یا باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چھت پر مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے کب سے اس کمرے کی صفائی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رات سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور اب مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ دروازے پر آہٹ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے وہی صوبیدار کھڑا تھا جو گرفتاری کے بعد پہلی بار مجھے حویلی میں لایا تھا۔

' اچھا۔ تو تم ابھی زندہ ہو؟' اس نے اپنی نوکدار مونچھوں کو مروڑا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ تین آدر فوجی اندر داخل ہوئے انہوں نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے چلے۔ تھکن اور چوٹوں کی تکلیف کی وجہ سے میرا بُرا حال تھا۔ قدم اُٹھانا بھی میرے لیے محال تھا مگر میں گھسٹتا ہوا اُن کے ساتھ چل رہا تھا۔ یہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے حویلی کے باہر لے گئے جہاں قریباً درجن بھر فوجی اسلحہ سے لیس کھڑے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کلمۂ شہادت پڑھا۔ شاید مجھے فائرنگ سکواڈ کے سامنے لے جایا جا رہا تھا۔ میری زندگی کا آخری لمحہ نزدیک آ چکا تھا۔ میں جان دینے کے لیے بالکل تیار تھا مگر فوجیوں کی تنی ہوئی بندوقوں کے سامنے سے گزر کر وہ لوگ مجھے ایک جیپ کے سامنے لے گئے اور اُٹھا کر مجھے جیپ میں پھینک دیا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ جو پہلے ہی دُکھ رہا تھا ایک بار پھر تکلیف دینے لگا مگر میں اُن کے سامنے اپنی زبان سے تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جیپ میں دو فوجی برین گنوں سے مسلح کھڑے تھے اور میں اُن کے قدموں میں لیٹا ہوا تھا۔ جیپ سٹارٹ ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے کسی اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہے۔

گرد آلود کچے راستوں سے گزرتی ہوئی جیپ چند میل کے فاصلے پر ایک کھنڈر نما عمارت کے آگے رُکی اور دونوں فوجیوں نے بازو پکڑ کر مجھے بے دردی سے اس طرح گھسیٹا تھا کہ میرے جسم کا ہر حصہ جیپ سے رگڑ کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ 'اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔' ایک آواز نے للکار کر کہا اور دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے ٹھوکر ماری۔ میں جانتا تھا کہ جب تک اُٹھ کر کھڑا نہیں ہو جاؤں گا ٹھوکریں کھاتا رہوں گا۔ اس لیے ہونٹوں کو دانتوں تلے داب کر میں نے اپنی چیخوں کو ضبط کیا اور کھڑا ہو گیا۔ کھنڈر نما عمارت کے ایک انتہائی بوسیدہ کمرے میں ایک ٹوٹی پھوٹی میز اور دو لکڑی کے تختے جڑی ہوئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ فوجیوں نے مجھے دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور کمرے سے رُخصت ہو گئے۔ تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرے اندر سر اُٹھا کر رکھنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی مگر پھر بھی میں نے گردن موڑ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ دروازے میں سُجاتا ایک فریم میں لگی ہوئی قد آدم تصویر کی طرح کھڑی ہوئی تھی مگر اس وقت وہ ایک بدلی ہوئی ہستی تھی۔ پھولدار ساڑھی کی جگہ اس کے جسم پر فوجی وردی تھی اور اس کی زلفیں سمٹ کر فوجی ٹوپی کے اندر غائب ہو چکی تھیں۔ اُس کی پیٹی میں ایک پستول لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ اُس کے عقب میں دو مسلح فوجی اپنی بندوقوں کا رُخ میری طرف کیے ہوئے کھڑے تھے۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور دوبارہ کھولیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید سُجاتا میری نظروں سے غائب ہو جائے گی

وہ بدستور موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ سُجاتا بنفسِ نفیس مجسّم نفرت اور انتقام بنی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ آہستگی سے ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی کو اپنی ٹانگوں پر مارتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور ان میں چھپی ہوئی حریصانہ نفرت بھری چمک میں صرف محسوس کر سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں وہی کیفیت تھی جو شکار کرنے سے پہلے کسی درندے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

میرے پاس آ کر اُس نے چھڑی کی نوک میرے سینے پر رکھ دی۔ 'لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے مہاشے۔' وہ ہنسی مگر اس ہنسی میں ایک نفرت بھری وارننگ شامل تھی۔ 'مجھے اس رُوپ میں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو؟' اُس نے غصّے سے بھنچی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ میں اُسے خاموش دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں بولا۔

'مگر میرا یہ رُوپ بہت بھیانک ہے۔ اس سے پہلے کہ چیل کوّے تمہاری بوٹیاں کھائیں سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دے دو۔' اُس نے اپنی چھڑی سے دھکا دیا اور میرا سر کُرسی کی پُشت سے جا ٹکرایا۔ 'کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟' اُس نے زہر بھری آواز میں پُوچھا۔ مگر میں بالکل خاموش رہا۔ اُس نے اپنی وردی کی قمیص کی اُوپر والی جیب کا بٹن کھولا اور ایک پتلی سی چمک دار چیز نکالی۔ چھڑی اُس نے فرش پر پھینک دی اور میں اُس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا تیز باریک اور دھار دار چاقو صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ میرے نزدیک آئی اور جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو اُس کی آواز بہت نرم اور مدھم تھی مگر میرے جسم کا رواں رواں خوف سے کانپ اُٹھا۔ 'کیا نام ہے تمہارا؟ تمہارا مشن کیا ہے؟'

میری خاموشی پر اُس کے ہاتھ میں حرکت ہوئی اور چاقو کی باریک نوک میری ران میں پیوستہ ہو گئی۔ میں بے اختیار تڑپ کر چیخ اُٹھا مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ چاقو کی نوک بدستور میری ران میں پیوست تھی اور میرا تمام جسم تکلیف اور خوف کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ 'مورکھ مت بنو۔ دو دن بعد تمہارے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہیں رہے گی۔ تم مرنے کی آس کرو گے۔ منت کرو گے مگر میں تمہیں مرنے بھی نہیں دوں گی۔ جب تک تم ایک ایک بات نہیں بتا دو گے میں تمہیں زندہ رکھوں گی۔ بولو۔ جواب دو۔ کیا نام ہے تمہارا؟ مشن کیا ہے تمہارا؟'

میں نے زور سے دانت بھینچ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے دباؤ ڈالا اور چاقو کی نوک میری ران کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ گرم گرم خون اُبلنے لگا۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا۔ قوتِ برداشت جواب دے گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں بدستور کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر میرا جسم رسیوں کے ساتھ کُرسی سے بندھا ہوا تھا۔ میری ران سے خون بہہ بہہ کر خود بخود بند ہو چکا تھا اور خشک ہو کر جم گیا تھا۔ میں نے اپنی زخمی ٹانگ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر جسم میں ایسی ٹیس اُٹھی کہ میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا اور دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے کہ باہر سے اس پر تالا لگا ہوا ہو گا اور مسلح فوجی پہرہ دے رہے ہوں گے۔ میں سوچنے لگا کہ یہ تشدد اور ظلم ستم آخر کب تک برداشت کر سکوں گا۔ مجھے جس عورت کے سپرد کیا گیا تھا وہ مجسّم ظلم تھی۔ اُس سے رحم یا کسی رعایت کی اُمید وابستہ کرنا حماقت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خدا نے ابھی تک مجھے اتنی ہمت اور طاقتِ برداشت دی تھی کہ میں نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ مگر میری برداشت اور صبر و ضبط کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔

دروازے پر آہٹ سنائی دی اور پھر تالا کھولنے کی آواز آئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ جی کڑا کر کے خدا کو یاد کرنے لگا۔ آزمائش کی گھڑی ایک بار پھر میرے سر پر کھڑی تھی۔ خدایا مجھے ہمت دے یا پھر آبرومندانہ موت ہی دے دے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ قدموں کی آہٹ میرے نزدیک آ گئی مگر یہ فوجی بوٹوں کی آہٹ نہ تھی۔ میرے کان اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنتے رہے۔ یہاں تک کہ دو پیر میرے سامنے آ گئے۔ ان پیروں میں فوجی بوٹوں کے بجائے چمڑے کے دیہاتی نوکدار جوتے تھے۔ پھر میری نظریں اور بلند ہوئیں تو مجھے دو پنڈلیاں اور پھر لہنگا نظر آیا۔ میں نے حیران ہو کر آنے والے کو دیکھا اور مارے حیرت کے میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

www.pdfbooksfree.pk

میری نگاہوں کے سامنے شیلا کھڑی تھی: "شیلا۔ تم؟!"

اُس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اُونچی آواز میں بولی "لو۔ تمہارے لیے بھوجن لائی ہوں۔" میں نے اَب تک اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھالی کو نہیں دیکھا تھا۔

"مگر میں کھاؤں گا کیسے؟" میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

اُس نے پھر اُونچی آواز میں کہا: "میں تمہارے ہاتھ کھول دیتی ہوں مگر کوئی شرارت مت کرنا۔ باہر سخت پہرہ ہے۔ بھاگ نہیں سکو گے۔"

اتنا کہکر اُس نے میری کلائیوں میں بندھی ہوئی رسّی کو کھول دیا اور کھانے کا تھال میری گود میں رکھ دیا۔ تکلیف کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی اور میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ اس نے رحم بھری نگاہوں سے میری زخمی خون آلود ران کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بلند آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔ اُس نے مضبوطی سے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دبا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ میں نے پریشانی سے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

"شیلا۔ حوصلہ کرو۔ رومت۔"

چند لمحے اُس پر وہی کیفیت طاری رہی مگر پھر رفتہ رفتہ اُس کے جسم کی لرزش میں کمی ہونے لگی لیکن آنسو بدستور اُس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ بمشکل اپنی سسکیوں کو روک کر اُس نے اپنی چُنری کے آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر کہنے لگی: "بھوجن کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں برتن لے جاؤں گی۔" اتنا کہا اور تیزی سے پلٹ کر دوڑتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔ میں حیران بیٹھا سوچ رہا تھا، یہ میرا وہم تھا یا حقیقت! شیلا اور یہاں؟ ایک فوجی بیرک میں؟ وہ بھلا کس طرح اِس انتہائی اہم علاقے میں آگئی؟

بھوک کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ کلائیوں کو کچھ دیر گھمایا تو خون کی روانی دوبارہ پیدا ہوئی اور میں اپنی اُنگلیاں کھولنے اور بند کرنے کے قابل ہو گیا۔ تھال پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا کر میں نے دیکھا چنے کی دو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے ہی کا ساگ تھا۔ میں کسی فاقہ زدہ انسان کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ ایک روٹی ختم ہو گئی تو میں نے دوسری روٹی اُٹھائی، مگر یہ پہلی روٹی سے زیادہ موٹی اور بھاری تھی۔ نوالہ توڑا تو مجھے اُس کے وزنی پن کا راز معلوم ہو گیا۔ چنے کی موٹی روٹی کے اندر شیلا ایک تیز دھار دار چھری رکھ کر لائی تھی۔ میں نے گھبرا کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر نہایت پھرتی سے چھری نکال لی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں چھپاؤں؟ میں جس کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا اُس کے سوا کوئی جگہ اُس کو چھپانے کی نہیں تھی۔ میں نے چھری کو اپنے نیچے کُرسی کی سیٹ پر رکھ لیا اور روٹی توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ خوشی اور گھبراہٹ کے مارے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چھری کتنا معمولی اور حقیر ہتھیار ہے۔ خصوصاً جنگ کے دنوں میں۔ بھاری بھرکم آٹومیٹک ہتھیاروں کے مقابلے میں اِس کی کیا حیثیت؟ لیکن اِس وقت یہ چھری بھی میرے لیے برین گن سے کم اہم نہ تھی۔ جذبات کی شدت سے چنے کی خشک روٹی میرے حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی تھی مگر میں نے جیسے تیسے اسے ختم کر دیا اور شیلا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد دروازہ دوبارہ کھلا اور شیلا چاروں طرف دیکھتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میرے سامنے دھری ہوئی خالی پلیٹوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ بلند آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "بھوجن ختم کر لیا؟ لو۔ پانی پی لو۔"

ہاتھ میں تھامی ہوئی پانی کی گڑوی اُس نے میری طرف بڑھائی جو میں غٹ غٹ کر کے چڑھا گیا۔ پھر اُس نے اُونچی آواز میں مجھے مخاطب کیا: "ہاتھ اُوپر کرو' میں انہیں باندھے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

میں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے۔ اُس نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھوں کو تھام کر بے اختیار اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور ایک بار پھر آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ میں گزشتہ دنوں کے مظالم سہہ کر بھی جی کڑا کر کے بیٹھا ہوا تھا مگر شیلا کے محبت بھرے آنسوؤں کو دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ واقعی محبت اور خلوص بھی کتنی بڑی طاقت ہے۔ پتھر سے پتھر دل انسان کو بھی پگھلا کر موم بنا دیتی ہے۔ کوئی تکلیف، کوئی پریشانی، کوئی آزمائش میری آنکھوں میں آنسو نہیں لا سکی تھی مگر شیلا کے آنسوؤں نے ضبط کے سارے بند توڑ کر رکھ دیئے۔ میں نے پیار سے اُس کے ہاتھوں کو دبایا اور دبی زبان میں کہا "شیلا۔ اپنے آپ پر قابو رکھو۔ ایسا نہ ہو کسی کو شبہ ہو جائے۔" مگر وہ اِسی طرح آنسو بہاتی رہی۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل کو قرار آیا تو اُس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پیار بھرے لہجے میں بولی "ویر۔ گھبرانا مت۔ تیری بہن تجھ پر جان وار دے گی۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تجھے انگلی بھی نہیں لگا سکتا۔" میں اُس کے پاگل پن پر دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ یہ کمزور اور بے بس عورت ایک پُوری فوج کے غیض و غضب سے مجھے

بھلا کیونکر بچا سکتی ہے؟!

پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کی: "میں پھر آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔" اتنا کہہ کر اُس نے اپنی آنکھوں کو خشک کیا۔ برتنوں کی تھالی اُٹھائی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ مجھے اُس کی آواز سُنائی دی۔ "تالا بند کر دو میں برتن لے کر جا رہی ہوں۔" دروازے میں تالا لگنے کی آواز سُنائی دی اور پھر وہی خاموشی۔

میں حیران بیٹھا سوچتا رہا۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ سُجاتا کہاں چلی گئی اور اَب کب واپس آکر اپنا ظلم و ستم آزمائے گی؟ شیلا کا اِس جگہ آنا کیسے ممکن ہوا؟ کیا وہ جانتی تھی کہ میں یہاں قید ہوں؟ اگر نہ جانتی تو روٹی کے اندر چھپا کر چھری کیوں لاتی؟ میری عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ شاید صدموں اور تکلیفوں نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا مگر وہ میری مدد کیسے کر سکے گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے بچانے کی کوشش میں وہ خود ہی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ عورت کا ایک رُوپ سُجاتا تھی اور دوسرا شیلا۔ کتنا زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں؟ مگر کہنے کو دونوں عورتیں ہیں۔ کافی دیر میں اِن خیالات میں کھویا رہا۔ پھر مجھے شیلا کے الفاظ یاد آئے۔ اُس نے کہا تھا: "میں پھر آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔" کافی وقت گزر چکا تھا اور میں ابھی تک سوچوں میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا، حالانکہ میرے ہاتھ آزاد تھے اور جسم پر بندھی ہوئی رسّیاں کاٹنے کے لیے شیلا مجھے چھری بھی دے گئی تھی۔ ایک دم میرے جسم میں توانائی اور حرکت پیدا ہو گئی۔ دو منٹ بعد میرے جسم کی رسّیاں کٹ چکی تھیں اور میں آزاد تھا۔ کُرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو جسم کی چوٹیں اور ران کا زخم پھر تکلیف دینے لگا مگر میرے اندر ایک نیا جذبہ، عزم اور ولولہ پیدا ہو چکا تھا۔ یہ تکلیفیں اور زخم میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ یہ میرے لیے آزاد ہونے کا غالباً پہلا اور آخری موقعہ تھا۔ ورنہ...... ورنہ کیا ہوگا؟! یہ خیال آتے ہی میرا تمام جسم کانپ اُٹھا۔ نہیں۔ میں بزدلوں کی موت نہیں مروں گا۔ مزید تشدد اور ظلم و ستم نہیں سہوں گا۔ میری منہ بولی بہن شیلا نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے یا آبرومندی سے مر جانے کا بہترین موقعہ فراہم کیا تھا۔ میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ارادے کی قوت نے میرے جسم میں بجلیاں بھر دیں۔ میں نے کمرے میں کھڑے ہو کر ہاتھ پیروں کو حرکت دی اور تھوڑی تھوڑی ورزش شروع کر دی۔ پہلے تو درد اور تکلیف نے بہت ستایا مگر آہستہ آہستہ درد میں کمی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ پیروں کو میں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حرکت دینے کے قابل ہو گیا۔ میں نے دبے قدموں سارے کمرے کا چکر لگایا۔ جُوڈو کراٹے کی چند مشقیں کیں اور جسم میں چُستی اور توانائی پیدا کرنے کے لیے کچھ اور بھی مشقیں آزمائیں۔ میرے ران کے زخم سے تھوڑا تھوڑا خون رسنے لگا تھا مگر خوش قسمتی یہ تھی کہ یہ بہت باریک زخم تھا اور جو خون اِس پر جم چکا تھا اِس کی وجہ سے زیادہ خون ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی قمیص کا دامن پھاڑ کر مضبوطی سے اپنی ران پر پٹی کے طور پر باندھ لیا۔ چند منٹ بعد میں اپنے آپ کو پُوری طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ میرے لیے ایک صدی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وقت تھا کہ گزرنے ہی میں نہیں آتا تھا۔ دِل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا آنے والے لمحات کا تصوّر میرے لیے سوہانِ رُوح ہوتا جا رہا تھا۔ وقت کی بند مٹھی میں میرے لیے کیا ہے؟ آزادی یا موت؟ ذلت یا عزت؟!

کافی وقت اِسی طرح کٹ گیا۔ یہاں تک کہ مجھے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ کسی نے تالا کھولا اور میرا تمام جسم تن گیا۔ ہو سکتا ہے آنے والی ہستی سُجاتا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے چھری کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دِل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں باہر سے آنے والا اِس کی آواز نہ سُن لے۔ خُدا خُدا کر کے دروازہ کھلا اور میں چھری کو ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں داخل ہونے والی ہستی میری منہ بولی بہن شیلا تھی۔ مجھے دروازے کے پاس آزاد اور چاق و چوبند دیکھا تو اُس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر اُس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے باہر نکال لیا اور کمرے کے دروازے میں دوبارہ تالا لگا دیا۔ باہر ہر طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ دروازے کے باہر ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی چند فٹ سے زیادہ آگے نہیں جا رہی تھی۔

"پہریدار کہاں ہے؟" میں نے رُک کر سرگوشی میں پوچھا۔

"اُس کی فکر نہ کرو۔ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ جلدی سے آؤ میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگی۔ سامنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ہم دونوں رُکے بغیر وہاں تک بھاگتے ہوئے چلے گئے۔

ذخیرے میں پہنچ کر شیلا رُک گئی۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے اُس کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر سستانے لگی۔

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ہی وہ رُک رُک کر مجھے اپنی کہانی بھی سُناتی رہی۔ ہُوا یہ کہ جس کھنڈر میں مجھے لایا گیا تھا یہ جگہ گاؤں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ دو منزلہ حویلی جو فوجی ہیڈکوارٹر کے طور پر بھی استعمال کی جا رہی تھی آج رات روشنیوں اور رنگ ترنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کسی محاذ پر فتح کی خوشی منانے کے لیے آج بڑے بڑے افسر فوجی میس میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان مہمانوں کی دلبستگی اور قیام کے لیے حویلی کے تمام کمروں کو قیدیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔ چند نیم جان قیدی تو ہلاک کر دیئے گئے اور کچھ لوگوں کو آس پاس کے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ دو قیدی بستی میں شیلا کی جھونپڑی میں رات گزارنے کے لیے لائے گئے تھے اور اُن کے دو محافظوں کی زبانی ہی شیلا کو تمام حالات معلوم ہوئے تھے۔ جب اُس نے سُنا کہ ایک فوجی نوجوان جنگل میں پکڑا گیا ہے اور آج وہ قریبی کھنڈر میں رات بھر کے لیے رکھا جائے گا تو اس کا دل بے چین ہو گیا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ یہ قیدی میرے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُس نے کھنڈر میں رہنے والے قیدی اور پہرہ دینے والوں کے لیے رات کا کھانا پکا کر لے جانے کی پیشکش کی جو قبول کر لی گئی۔ اُن سے باتوں باتوں میں اُس کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو کھنڈر میں رکھا جانے والا قیدی اُس کا مُنہ بولا بھائی ہی ہے۔ چنانچہ وہ خاص طور پر چُنے کی دو روٹیاں پکا کر لائی تاکہ اگر محافظ دیکھنا بھی چاہے تو اندر چُھپی ہوئی چُھری اُس کی نظروں سے محفوظ رہے۔

"مگر شیلا" مَیں نے کہا: "اگر قیدی میری جگہ اور ہوتا تو تم کیا کرتیں؟"

وہ مسکرائی۔ "مَیں ایک روٹی کم کر کے واپس لے جاتی اور کیا کرتی؟" واقعی بہت آسان حل تھا۔

"مگر میرا پہرے دار کہاں ہے؟"

"وہ کھنڈر کے پیچھے بیہوش پڑا ہے۔ جب مَیں کھانا لے کر آئی تھی تو اِس کے لیے بہت تیز دیسی دارُو کی بوتل بھی لے کر آئی تھی۔ دوبارہ آئی تو وہ نشے میں مست پڑا تھا۔ مَیں گھسیٹ کر اسے کھنڈر کے پیچھے ڈال آئی۔ یہ رہی اُس کی بندوق اور گولیاں۔"

اُس نے برین گن اور ایمونیشن مجھے دکھایا تو خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ "جیتی رہو شیلا۔ تمہارا جواب نہیں ہے۔" مَیں نے برین گن کو چُوم لیا۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا۔

"تمہارا گھر والا کہاں ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "جیت کی خوشی میں دونوں فوجی دارُو کی بوتلیں ساتھ لے کر آئے ہیں۔ حویلی میں بڑے افسر خوشی منا رہے ہیں اور جھونپڑی میں وہ دونوں میرے گھر والے کے ساتھ پی پی کر موج منا رہے ہیں۔"

"دونوں قیدی کیسے ہیں۔ زیادہ زخمی تو نہیں ہیں؟"

اُس نے بتایا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہیں۔ اگرچہ وہ بہت زیادہ گھائل ہیں۔

"اچھا شیلا۔ یہ بتاؤ۔ تمہارا گھر کدھر ہے؟"

شیلا نے اِشارے سے مجھے بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ جگہ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بھی نہیں ہے۔ میرے ذہن نے فوری طور پر ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ مَیں نے شیلا سے کہا: "اَب تم گھر جاؤ۔ مَیں اپنی راہ جاتا ہوں۔"

"پہلے بھی ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ اَب پھر کسی کے قابو آ جاؤ گے۔"

مَیں نے اُسے بتایا کہ مَیں دُشمن کے علاقے میں ہوں۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ یہاں کوئی بھی دوست یا ہمدرد نہیں ہے میرا۔ شیلا نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں مجھے دیکھا اور بولی: "ویر۔ کیا مَیں تجھے نظر نہیں آتی؟"

"اری پگلی۔ تُو ایک کمزور عورت ہے۔ تُو بھلا کیا کر سکتی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش رہی۔ پھر جیسے اِسے کچھ یاد آ گیا۔ "لاؤ۔ تمہارے گھاؤ پر مرہم لگا دوں۔" مرہم وہ اپنے آنچل میں باندھ کر لائی تھی۔ میری باندھی ہوئی پٹی کھول کر اُس نے میرے زخم پر مرہم لگایا۔ ساتھ ہی وہ روتی بھی جاتی تھی اور گھاؤ لگانے والے کو بد دُعائیں بھی دے رہی تھی۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ مَیں نے اُسے تسلّی دی اور کہا کہ وہ اپنے گھر جا کر میرا انتظار کرے۔ مَیں کچھ دیر میں واپس آؤں گا اور اُس سے مُلاقات کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ اُس نے مجھ سے وعدے لیے۔ یہاں تک کہ اپنے سَر کی سوگند بھی دی کہ مَیں اُس سے ملنے ضرور آؤں گا۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد وہ مجھ سے رُخصت ہوئی اور مَیں نے فوجی ہیڈکوارٹر کی راہ لی۔

رات تاریک تھی۔ آسمان پر چاند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تاروں کی چمک البتہ راہ بری کے لیے موجود تھی۔ شیلا نے مجھے تمام صورتِ حال بتا دی تھی اور اَب مَیں نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ فوجی ہیڈکوارٹر کی طرف رواں دواں تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فوجی ہیڈکوارٹر میں موجود فوجی افسر اور جوان شراب کے نشے میں مدہوش ہیں۔ بیشتر فوجی جوان بھی خوشی میں شریک ہونے کی غرض سے مدہوش ہوں گے۔ ایسے موقعوں پر فوجی ڈسپلن اور رکھ رکھاؤ بھی کمزور ہو جاتا ہے گویا مجھے کھل کھیلنے کی پُوری آزادی تھی۔ میرے ہاتھ میں فوجی پہریدار سے چھینی ہوئی برین گن تھی اور لباس کے اندر دھار دار خنجر بھی محفوظ تھا جو شیلا مجھے روٹی میں رکھ کر پہنچا گئی تھی۔ گویا ہر اعتبار سے صورتِ حال میرے حق میں سازگار تھی۔ کیونکہ زیادہ چوکی پہرے کا اندیشہ نہ تھا اِس لیے مَیں بے خوفی سے جنگل میں اور کچی پگڈنڈیوں پر اپنا سفر طے کرتا رہا۔ راستہ میں مجھے کوئی رُکاوٹ نہیں ملی سوائے ایک آوارہ کتّے کے جو مجھے دیکھ کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ مَیں نے اُسے خاموش کرانے کی بہت کوشش کی مگر اُس کی آواز اور جوش و خروش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اُسے ہلاک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ مگر مَیں جانتا تھا کہ اِس وقت اُس کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دے گا۔ اِس لیے اُس کی جان بخشی کر دی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر بھونکتا رہا اور مَیں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تاریکی میں مجھے ہیڈکوارٹر کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اگرچہ زیادہ مُحتاط ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی مَیں نے رُک کر اطراف کا جائزہ لیا اور آزمائش کے طور پر درختوں کے جھنڈوں میں کچھ پتھر پھینکے مگر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں سُنائی دی۔ درختوں کے تنوں کی آڑ لیتا ہوا مَیں ہیڈکوارٹر کی عمارت کی طرف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ عمارت کی روشنیاں بالکل صاف نظر آنے لگیں۔ عمارت کے اندر سے آنے والی موسیقی، شور و غُل اور قہقہوں کی آوازیں بھی مَیں سُن سکتا تھا۔ میری پُوری توجہ عمارت کی طرف تھی اور مَیں اُس طرف نظریں جمائے پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ یکایک ایک درخت کے پیچھے سے ایک سایہ اُبھرا اور ایک شخص میرے بالمقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدم اچانک رُک گئے اور یوں لگا جیسے میرے جسم کا رُواں رُواں تن گیا ہو۔ اِس سے پہلے کہ مَیں کچھ سوچ سکتا وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مدّھم روشنی میں مجھے صاف نظر آ گیا کہ وہ ایک فوجی سپاہی تھا۔ اُس کے ہاتھ میں برین گن تھی اور سر پر فولادی ہیلمٹ رکھا ہوا تھا۔ اُس کی برین گن کا رُخ میری طرف تھا۔

"ہالٹ" وہ چلّایا اور مَیں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اتنی مُہلت نہ تھی کہ مَیں اُس پر گولی چلاتا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ مَیں اُس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُس قد آور فوجی کی شکل میں موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ منزل کے عین سامنے پہنچ کر منزل مجھ سے دُور ہو گئی تھی۔ مَیں جھنجھلاہٹ میں اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی پر پچھتانے لگا۔

"کدھر سے آیا ہے؟ کون ہے؟ پہچان کراؤ۔" وہ کڑک کر بولا۔ مگر اُس کی آواز میں شامل نشے کی آمیزش میں صاف طور پر یہ محسوس کر سکتا تھا۔ پھر مَیں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی مَیں کوئی مناسب جواب سوچنے نہ پایا تھا کہ اُس کی گرجدار آواز پھر گونجی۔

"جواب دو۔ ورنہ ہم شُوٹ کر دے گا۔" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اُس نے چار پانچ ہوائی فائر کر دیئے۔ خُدا جانے اُس نے برین گن کی نالی کا رُخ جان بوجھ کر آسمان کی طرف کیا تھا یا نشے میں اُس سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے مَیں ساکت رہ گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ کچھ فاصلے پر واقع ہیڈکوارٹر کی طرف سے موسیقی اور شور و غُل کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اِس فائرنگ کی آواز دوسرے فوجیوں کے کانوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔ چند ہی منٹ بعد وہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ میرا مشن، میرا مقصد مجھے خاک میں ملتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مَیں نے اپنی برین گن کو تول کر ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر اُس نے پھر لگاتار تین چار ہوائی فائر کر دیئے۔ "ڈیم فول۔ یُو ڈیم فول" کہتا ہوا وہ میری طرف بڑھا مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک درخت سے ٹکرا کر گر گیا۔ مَیں نے برین گن سے اُس کی طرف نشانہ باندھا اور چشم زدن میں اُس کے سَر پر پہنچ گیا۔ میری اُنگلی لبلبی پر تھی اور مَیں اُس کی ذرا سی جُنبش پر فائر کھولنے کے لیے تیار تھا مگر اُس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ وہ خاموش اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ برین گن اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گر گئی تھی اور وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ ظاہر ہے کہ فتحیابی کا جشن منانے کی خوشی میں وہ ضرورت سے زیادہ شراب چڑھا گیا تھا اور اُس کا شراب میں مدہوش ہونا ہی میری زندگی بچانے کا سبب بن گیا تھا۔ اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر مَیں نے پھُرتی سے ایک درخت کے موٹے سے

www.pdfbooksfree.pk

تنے کی آڑلی اور دوسرے فوجیوں کی آمد کے انتظار میں ایک ایک پل گِننے لگا۔ محافظ سے حاصل کی ہوئی برین گن میری حفاظت کا واحد ذریعہ تھی۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ برین گن میں پورے راؤنڈ موجود ہیں۔ لیکن دُشمن کی پُوری فوج سے مَیں کہاں تک مقابلہ کر سکتا تھا؟ پھر بھی مَیں نے دِل میں ٹھان لی تھی کہ مرنے سے پہلے دس بارہ دُشمنوں کو ساتھ لے کر مروں گا۔ چند لمحے مکمل خاموشی رہی۔ ہلکی ہلکی موسیقی اور شوروغل کی آوازوں کے سوا جنگل میں کوئی اور آواز نہ تھی یا پھر میرے دِل کے دھڑکنے کی صدا تھی جو اِن سب آوازوں پر حاوی تھی ـــــ کافی دیر گزر گئی مگر مجھے کوئی آہٹ سُنائی نہیں دی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے کے باوجود مجھے کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ اَب اِس جگہ میرا کھڑا رہنا بے کار تھا بلکہ نقصان دِہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مَیں نے جُھک کر بے ہوش فوجی کا ہیلمٹ اُتارا اور اپنے سَر پر رکھ لیا۔ اَب مَیں سَرتاپا فوجی وردی میں ملبُوس دُشمن کا ایک سپاہی نظر آ رہا تھا اور کسی کی نظر پڑنے پر میرا پہچان لیا جانا مُشکل تھا۔

مَیں درختوں کی آڑ لیتا ہوا بڑھتا رہا یہاں تک کہ ہیڈکوارٹر کی دومنزلہ عمارت کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں درختوں کی قطاریں ختم ہو گئی تھیں اور کُھلا میدان سامنے تھا۔ آس پاس کوئی محافظ نہیں تھا۔ مَیں نے جرأت پا کر آگے قدم بڑھائے اور حویلی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے رُک جانا پڑا۔ اندر سے کچھ قدموں کی آوازیں میری طرف بڑھتی ہوئی سُنائی دیں۔ میرے لیے چُھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اور اُلٹے پیروں بھاگنا حماقت تھی۔ اِس لیے مَیں جی کڑا کر کے اپنی جگہ اٹین شَن ہو کر کھڑا ہو گیا مگر کسی خطرے سے عہدہ برا ہونے کے لیے برین گن پر میری گرفت مضبوط تھی۔ دوسرے ہی لمحے دو عورتیں اور دو مرد اندر سے نمودار ہوئے۔ یہ سب فوجی وردیوں میں ملبوس تھے مگر انتہائی غیر فوجی مُوڈ میں نظر آ رہے تھے۔ مَردوں نے اپنے بازو عورتوں کے شانوں کے گِرد حائل کئے ہوئے تھے اور وہ جُھومتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اعلیٰ افسر تھے۔ مَیں نے اپنی نگاہیں سامنے جما دیں اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک پہنچے ایک فوجی سلیوٹ مارا۔ وہ لوگ مجھے اہمیت دیئے بغیر سامنے سے گزر گئے مگر اتنی دیر میں بھی مَیں نے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ اُن میں ایک عورت سُجاتا تھی جو میرے خون کی پیاسی تھی۔ وہ میرے سامنے سے گزر گئی۔ لیکن اگر اُس نے غور سے مجھے دیکھا ہوتا تو وہ اپنے شکار کو سامنے پا کر نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ اُن لوگوں کے قدموں کی آوازیں مدھم ہوتی گئیں یہاں تک کہ معدوم ہو گئیں۔ وہ چھوٹی عمارت کی طرف جا کر غائب ہو گئے۔ مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور بے دھڑک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی تیز موسیقی کی آواز نے میرا خیر مقدم کیا۔ سامنے بڑے ہال میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور مغربی موسیقی کی دُھن پر لوگ رقص کر رہے تھے۔ اِن میں خواتین کی تعداد بہت کم تھی زیادہ تعداد مَردوں کی تھی جو فوجی وردیوں میں تھے۔ جبکہ خواتین نے ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ چند لوگ کُھلے فرش پر ڈانس کر رہے تھے۔ باقیماندہ چاروں طرف بکھری ہوئی کُرسیوں پر براجمان تھے یا دیواروں اور میزوں کے سہارے کھڑے خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ سب کے ہاتھوں میں گلاس تھے جو اِس بات کا ثبوت تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی ہوش میں نہیں ہے۔ یکایک میری نظریں کیپٹن ٹی آر کرشنا پر اٹک کر رہ گئیں۔ وہ ایک فوجی افسر کی باہوں میں باہیں ڈالے والہانہ انداز میں ڈانس کر رہی تھی۔ اُس کی نظریں میری طرف تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے ہم دونوں کی نظریں ملیں اور اسی وقت یک لخت موسیقی بند ہو گئی۔ سب نے تالیاں بجائیں اور اپنی نشستوں کی طرف جانے لگے۔ کچھ لوگ شراب کے کاؤنٹر کی طرف چل دیئے۔ اِس مُہلت سے فائدہ اُٹھا کر مَیں پچھلی برآمدے میں ہو لیا۔ کیا کرشنا نے اتنی دُور سے رقص کرتے ہوئے ایک سرسری نظر میں مجھے پہچان لیا ہے؟ شک و شبے نے مجھے گھیر لیا اور مَیں نے تیز قدمی سے ایک سائیڈ روم کا رُخ کیا۔ پردہ ہٹا کر مَیں اندر داخل ہوا مگر ٹھٹھک کر رُک گیا۔ بڑی دفتری میز پر جوڑا نیم دراز تھا۔ مرد فوجی وردی میں تھا جبکہ عورت نے سیاہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ میرے قدموں کی آواز سُن کر اُن دونوں نے میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ عورت نے کچھ شرما کر دوسری طرف منہ پھیر لیا مگر مرد نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مَیں نے پلٹ کر باہر نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی مگر میرے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے نوجوان افسر کی آواز سنائی دی۔ "کم آن یو سٹوپڈ فول" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم رُک گئے۔

پھر مجھے اُس کی خاتون ساتھی کی آواز سُنائی دی: "ڈونٹ بی فولش دیپ۔ جانے دو اِسے۔" نوجوان افسر ہنستے ہنستے کھانسنے لگا۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر مَیں تیزی سے باہر نکل گیا۔

برآمدے میں ایک اور مُصیبت میرے انتظار میں تھی۔ یہ تین فوجی جوان تھے جو ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے رقص کرنے کے انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں مگر اُن کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی مخمور

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ میرے سنبھلنے سے پہلے وہ میرے نزدیک پہنچ گئے۔ مَیں نے اُن کے پاس سے گزرنے کے لیے قدم بڑھائے مگر ایک مشین گن بردار ہاتھ نے میرا راستہ روک لیا۔ مَیں نے گھبرا کر دیکھا۔ وہ تینوں میری طرف متوجہ تھے۔

"کدھر جاتا ہے جوان؟" ایک فوجی نے مجھ سے سوال کیا۔

"گیٹ پر۔ اُدھر ہماری ڈیوٹی ہے۔" مجھے اِس کے سوا کوئی اور جواب نہیں سُوجھا۔

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ "آج کوئی ڈیوٹی نہیں ہے۔ سب کی چُھٹی ہے۔ دُشمن مار کھا کر بھاگ گیا ہے تم بھی موج کرو جوان۔" یہ کہکر اُس نے اپنے ساتھی کی گردن میں حمائل کیا ہوا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھایا اور شراب کی ایک چھوٹی سی بوتل نکال کر میری طرف بڑھائی۔ "لو۔ دو گھونٹ لگا لو۔" "تھینک یو" کہکر مَیں تیزی سے مخالف سمت میں بڑھا اور دُور تک اُن کے قہقہے میرا تعاقب کرتے رہے۔ مَیں برآمدے کے ایک موڑ سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرا دماغ سنسنانے لگا اور میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ قدرت نے میرے لیے یہ ایک نادر موقعہ فراہم کیا تھا۔ خدا جانے کس کی دعائیں میرے کام آ رہی تھیں۔ کہاں تو مَیں بے بسی سے دُشمنوں کی قید میں اذیت سہہ رہا تھا اور دردناک موت کا منتظر تھا اور کہاں یکایک حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ کامیابی اور کامرانی میرے سامنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ ایسے مثالی حالات روز روز مُیسّر نہیں آیا کرتے۔ مگر اِس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ خوشی سے میرے ہاتھ پیر پُھول گئے تھے اور دماغ بھی فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ دُشمن کا ہیڈ کوارٹر اور اس کی تمام نفری میرے رحم و کرم پر تھی مگر اِس اچانک صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کے لیے میرے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ مَیں اِن ہی خیالات میں گُم برآمدے سے گزر کر چھوٹی حویلی کی عمارت کی طرف گامزن رہا۔ اِس عمارت کے اندرونی گیٹ پر دو سپاہی کھڑے پہرہ دے رہے تھے اور مجھے اُن کی مستعدی دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ وہ نشے میں بھی نہیں تھے۔ مَیں بے خوفی اور اعتماد کے ساتھ اُن کی طرف بڑھتا رہا اور اُن کے سامنے سے گزر کر عمارت کے برآمدے میں پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے روکنے یا پُوچھ گچھ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میری وردی اور خود اعتمادی انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

سامنے لکڑی کی کشادہ سیڑھیاں تھیں جو باہر سے نظر نہیں آتی تھیں۔ مَیں کچھ سوچے سمجھے بغیر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا یہاں تک کہ دوسری منزل کی گیلری میں پہنچ گیا۔ اِس میں چار کمروں کے دروازے تھے۔ فرش لکڑی کا تھا۔ بائیں جانب ایک مقفّل دروازہ تھا جس کے سامنے ایک چاق و چوبند فوجی مشین گن تھامے چوکنا کھڑا تھا۔ اِس عمارت میں ہوشمند فوجیوں کی موجودگی اِس بات کا ثبوت تھی کہ یہ ایک انتہائی اہم جگہ تھی۔ مگر اِس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے؟ مَیں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ واحد پہرے دار کے علاوہ برآمدے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یکایک مَیں نے ایک فیصلہ کیا اور کسی اور سمت جانے کی بجائے محافظ کی طرف بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ۔" اِس نے آواز لگائی۔ "پاس وَرڈ کیا ہے؟"

مگر مَیں اتنی دیر میں تیز رفتاری سے اِس کے سَر پر پہنچ گیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتا، میرا برین گن والا ہاتھ بلند ہوا اور مَیں نے اُس کی گردن پر بھرپُور ضرب لگائی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک پیدا ہوئی مگر کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔ مَیں نے جھپٹ کر اِس کی ٹانگ پکڑی اور اِسے گھسیٹتا ہوا برآمدے کے نسبتاً تاریک گوشے کی طرف لے گیا۔ اِس اثنا میں میرے ہاتھ اُس کے لباس کی تلاشی لیتے رہے اور مَیں اُس کی جیب سے دو بڑی چابیاں نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ معلوم کرنے کا وقت نہ تھا کہ وہ مر چکا ہے یا محض بے ہوش ہوا ہے۔

برآمدے کے کنارے رکھے ہوئے بڑے گملوں کی آڑ میں اُس کو لِٹانے کے بعد مَیں پُھرتی سے مقفّل دروازے کی طرف لپکا اور پہرے داری کے انداز میں اُس کے سامنے ٹہلنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ گزر گئے مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر قفل میں چابی لگائی۔ پہلی کوشش ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ لوہے کا بھاری بھرکم قفل کُھلنے کے بعد بھی مَیں نے دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور دوبارہ دروازے کے سامنے پہرے داری کے انداز میں ٹہلنے لگا۔ کچھ فاصلے پر بڑی حویلی میں واقع ہیڈ کوارٹر سے موسیقی اور ہنسنے گانے کی ہلکی ہلکی آوازوں کے سوا اور کوئی صدا نہیں تھی۔ یہاں تک کہ عمارت کے چھوٹے عقبی گیٹ پر موجود دو سپاہیوں کے قدموں کی آواز بھی معدوم تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی جگہ بُت بنے کھڑے تھے۔ میرے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔ ہاتھ فرطِ مسرت سے کانپ رہے تھے۔ مزید وقت

ضائع کیے بغیر مَیں دَبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور بھاری لوہے کا قفل اُتار کر دونوں ہاتھوں سے دروازے کو کھولا اور حیرت و مسرت سے میری سانس رُک گئی۔ میرے سامنے علی بابا کے خزانے کا منظر تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا۔ جو گولہ بارود کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر پیٹی پر اِس میں موجود اسلحہ کی نوعیت درج تھی۔ اسلحہ اور گولہ بارود کا یہ ہلاکت خیز ذخیرہ ایک پُوری فوج کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا۔ کمرے میں بائیں دیوار پر ایک آہنی کھڑکی تھی۔ جو مقفّل تھی۔ دائیں جانب ایک پُرانی وضع کا روشندان تھا جسے لکڑی کے تختے نصب کر کے مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ مَیں نے برین گن کی آہنی نالی لکڑی کے تختوں کے درمیان پھنسا کر زور لگایا تو دو تختے اُکھڑ گئے۔ چند ہی لمحے بعد سارے تختے اُکھڑ چکے تھے اور کُھلے روشندان سے جھانک کر مَیں آسمان کو دیکھ سکتا تھا۔ مَیں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر میری نگاہیں ایک بہت بڑی چوبی پیٹی کے گرد لپٹی ہوئی نائیلون کی ڈوری پر جم کر رہ گئیں۔ جیب سے شیلا کا دیا ہوا چاقو نکال کر ڈوری کاٹنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا۔ مَیں نے ڈوری کھینچ کر نکالی تو معلوم ہوا کہ اِس کی لمبائی دس بارہ گز کے قریب ہے۔ اِس ڈوری کا ایک سِرا بارُود کی بڑی پیٹی سے باندھنے کے بعد مَیں نے اُس کا دوسرا سِرا روشندان میں سے باہر پھینک دیا۔ مَیں نے جوشِ اضطراب میں یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ روشندان کی دیوار کے نیچے کیا ہے اور آیا ڈوری زمین تک پہنچی بھی گی یا نہیں؟ میرے ذہن میں کوئی تفصیلی اور باقاعدہ منصوبہ نہیں تھا۔ نائیلون کی ڈوری کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوری طور پر جو بھی خیال آیا مَیں کر گزرا۔ کمرے کے اندر زیادہ دیر ٹہرنا مناسب نہ تھا اِس لیے مَیں نے تیزی سے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ قفل میں چابی گھمائی اور تالا بند کرنے کے بعد اطمینان کی لمبی سانس لے کر سَر اُٹھایا تو اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ برآمدے کے دوسرے کنارے پر کیپٹن کرشنا کھڑی مجھے گھُور رہی تھی۔ ہمارے درمیان میں زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ برآمدے میں روشنی بھی کافی تھی۔ امکان یہی تھا کہ وہ مجھے پہچان چکی ہے۔ خلافِ توقع مجھے دیکھ کر حیرت کے آثار اُس کے چہرے پر نمودار ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے فوجی ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا ذہن پُوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ فائر کرنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کیونکہ نیچے والے برآمدے میں موجود فوجیوں کو مَیں دیکھ چکا تھا۔ اِس کے علاوہ یہ بھی احساس تھا کہ ممکن ہے اِس عمارت میں کچھ اور ہوشمند فوجی بھی موجود ہوں۔ اِس سے پہلے کہ کرشنا کا ریوالور پُوری طرح اُوپر اُٹھتا، بجلی کی سُرعت سے میرا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ بجلی سی کوندی اور شیلا کا بخشا ہوا خنجر سنسناتا ہوا کرشنا کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نہ وہ میرے ہاتھ کی حرکت کو دیکھ سکی اور نہ دھار دار خنجر کو۔ اُس کے چہرے پر خوف اور حیرت کا تاثر نمودار ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ بے جان ہو کر فرش پر گر گئی۔ مرنے سے پہلے شاید وہ یہ بھی نہیں جان سکی کہ اِس کی موت کا سبب کیا ہے؟ اُس کے گرنے سے پیدا ہونے والی آواز کو روکنے کی غرض سے مَیں نے اپنے فوجی بوٹ زور سے فرش پر مارے اور تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھا۔ میرے بھاری جوتوں کی آواز میں اُس کے گرنے کی آواز گُم ہو کر رہ گئی۔ جب مَیں نے جُھک کر دیکھا تو اُس کی حیران مگر بے جان آنکھیں ابھی تک مجھے تک رہی تھیں۔ شاید ابھی تک اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا تھا۔ مَیں نے جُھک کر بغور اُس کا جائزہ لیا۔ خنجر اُس کی شہ رگ میں پیوست تھا۔ اُس کی فوری موت کا سبب بھی یہی بنا تھا۔ میرے پاس زیادہ مُہلت نہ تھی۔ اِس لیے خنجر نکال کر مَیں نے اُس کے لباس سے پُونچھا اور دوبارہ اپنی کمر میں اُڑس لیا۔ کرشنا جو ایک وقت میری جاں بخشی کے لیے مجھے لالچ دے رہی تھی آج بذاتِ خود میرے سامنے بے جان پڑی تھی اور مَیں ابھی تک زندہ تھا۔ کرشنا کی لاش کو اُٹھا کر فوجی پہرے دار کے برابر ڈالنے میں مجھے کوئی دِقّت نہیں ہوئی۔ فوجی کے لباس کی تلاشی لینے پر مجھے اُس کی جیبوں سے ایک چھوٹی ٹارچ، ایک سگریٹ کی ڈبیا اور ایک لائٹر دستیاب ہوا۔ مَیں نے یہ تمام اشیا اپنی جیبوں میں مُنتقل کر لیں۔ اَب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نیچے پہرہ دینے والے دو مستعد اور چوکس فوجیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کون سی ترکیب آزمائی جائے۔ کچھ دیر پہلے وہ مجھے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اپنے سامنے سے گزر کر اُوپر آتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور اُنہوں نے مجھ سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ معاً ایک خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ کیپٹن کرشنا مرنے کے بعد میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ مَیں نے کرشنا کے بے جان جسم کو اُٹھا کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ابھی تک اُس کے جسم میں اکڑاہٹ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جسم میں حرارت بھی موجود تھی۔ واحد پرابلم اُس کی گردن کا زخم تھا جس سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ اُس کی ساڑھی کا پلّو گردن کے گرد لپیٹنے کے بعد مَیں اُس کی گردن کا زخم چُھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے مَیں نے کیپٹن کرشنا کو تھاما، دوسرے ہاتھ میں برین گن سنبھالی، اور کرشنا کو اپنے ساتھ لے کر سیڑھیوں سے اُترنے لگا۔ چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد ہی مَیں سامنے

کھڑے ہوئے دونوں فوجیوں کو اور وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ کرشنا کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور میں اسے یوں تھام کر لے جا رہا تھا جیسے وہ نشے میں مدہوش ہو۔ فوجیوں کے لیے غالباً یہ منظر نیا اور انوکھا نہیں تھا۔ شاید اپنی فتوحات کی خوشی میں اس قسم کی رنگ رلیاں منانا یہاں کا معمول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فوجیوں نے ایک سرسری نظر ہم دونوں پر ڈالنے کے بعد اپنی توجہ دوسری طرف منعطف کر دی۔ میں کرشنا کو سنبھالے ہولے ہولے قدم قدم اُن کی طرف بڑھتا رہا۔ اُن کے سامنے سے گزرے بغیر عمارت سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

جوں جوں ہمارا درمیانی فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے دل کی دھڑکن اور خون کی گردش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کرشنا کے جسم کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی میری سانس پھول گئی۔ میرے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی برین گن پر میری گرفت ہر لمحہ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں فوجی تن کر اٹین شن کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کی نظریں سامنے کی طرف تھیں اور میری طرف سے وہ قریب قریب مطمئن اور بے خبر ہو چکے تھے۔ میرا اور اُن کا درمیانی فاصلہ جب تین فٹ رہ گیا تو اُن میں سے ایک کی توجہ اُس آواز کی طرف مبذول ہوئی جو فرش سے کیپٹن کرشنا کے پیر گھسٹنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ کرشنا اپنے پیر اُٹھا کر خود چلنے سے قاصر تھی اور میں اُسے کندھے پر ڈال کر اُٹھا نہیں سکتا تھا ورنہ دیکھنے والوں کو شک ہو جاتا۔ فوجی نے حیران ہو کر کرشنا کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اصلیت جان سکتا۔ میں نے کرشنا کی لاش اُس پر پھینک دی۔ دوسرے سپاہی نے چونک کر حرکت کرنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں میرا خنجر کام کر چکا تھا۔ اُس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ اوندھے منہ اپنے ساتھی پر گرا جو کرشنا کی لاش کو ہٹا کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ فرش پر گر گیا۔ میں نے چھلانگ لگائی اور برین گن پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبا دیا۔ چند لمحے اُس نے مزاحمت کی۔ اُس کا بندوق والا ہاتھ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بلند ہوا مگر پھر بے جان ہو کر گر گیا۔ چشم زدن میں مَیں اپنے دونوں دشمنوں سے نجات پا چکا تھا۔ کتنی ستم ظریفی تھی کہ کرشنا جو اپنی زندگی میں میری جان لینے پر تُلی ہوئی تھی مرنے کے بعد میری جان بچانے کا فرض ادا کر رہی تھی۔ میری منہ بولی بہن شیلا کا عطا کیا ہوا خنجر ایک بار پھر کام دے گیا تھا۔ خنجر کو فوجی کی وردی سے صاف کرنے کے بعد میں نے دوبارہ اپنی کمر میں لگا لیا اور دل ہی دل میں شیلا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرش پر سے اپنی برین گن اُٹھالی۔ مرنے والے ایک سپاہی کی مشین گن بھی میں نے اپنے کندھے پر لٹکا لی۔ میرا مقابلہ ایک پوری فوج سے تھا اور محض ایک برین گن شاید اُس کے لیے کافی نہ ہوتی۔ میں نے چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی بھی موجود نہ تھا مگر اِن تینوں لاشوں کا برآمدے میں یوں پڑا رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے باری باری انہیں گھسیٹ کر برآمدے کے باہر جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دیا اور پھونک پھونک قدم اُٹھاتا ہوا اُس دروازے کی طرف بڑھا جس کے سامنے وہ دونوں فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ کمرہ مقفل تھا۔ اس لیے مجھے چابیوں کی تلاش میں دوبارہ جھاڑیوں کے پاس جانا پڑا۔ ایک فوجی کی جیب سے چابیاں ڈھونڈ نکالنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا اور میں لپکتا ہوا دروازے پر پہنچ کر تالا کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ہوئی۔ دروازہ کھلا تو سامنے ایک ہال نما کمرہ تھا جو فرش سے چھت تک اسلحہ اور گولہ بارود سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے چھوٹے لکڑی کے کریٹس اور گتے کے مضبوط ڈبے ترتیب کے ساتھ لگا کر رکھے گئے تھے۔ ایک طرف مشین گنوں اور دوسرے آتشیں اسلحہ کا بھی ذخیرہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ہال نما کمرہ اور بالائی منزل کا کمرہ اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ ممکن ہے اس عمارت میں اسلحہ اور گولہ بارود کا کوئی اور بھی ذخیرہ ہو مگر میں نے اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ نہ میرے پاس اتنی مہلت تھی۔ جب میں نے اُس کمرے کو دوبارہ مقفل کیا تو شدتِ جذبات سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ خوشی سے میرا دل دھڑک رہا تھا اور میرے سامنے کامیابی مسکراتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

برآمدے سے گزر کر میں بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جہاں سے سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی نعمان پسند جوڑا تھا۔ اس سے مجھے فی الحال کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اپنے راز و نیاز چھوڑ کر چھوٹی حویلی کی طرف آنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ میں مضبوط قدموں سے ایک فوجی کے انداز میں چلتا ہوا آگے نکل گیا مگر اس بار میرا رُخ ہیڈکوارٹر کی عمارت کے بجائے اس کی مخالف سمت میں تھا جہاں مجھے چند جیپیں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ اِن کی تعداد آٹھ تھی۔ اِن جیپوں کے پاس کوئی شخص یا ڈرائیور موجود نہ تھا۔ میں نے جھک کر باری باری سب کے سٹیرنگ دیکھ ڈالے۔ خوش قسمتی یہاں بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک جیپ کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں کود کر جیپ میں آ بیٹھا اور آہستگی سے اسے سٹارٹ کرنے کے بعد کچی سڑک پر کافی فاصلے تک لے گیا۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں یہ عمارتیں بلند و بالا درختوں سے گھری ہوئی تھیں اور کچھ فاصلے سے دیکھ

انے تو عمارتوں کی موجودگی کا اندازہ لگانا ہی مشکل تھا۔ دو اطراف میں کچی سڑکیں تھیں اور بائیں جانب کھلا میدان۔ کسی زمانے میں یہ جاس اُگانے والے کھیت ہوں گے مگر زمانۂ جنگ میں یہ لڑائی کے میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ میدان کا ایک لمبا چکر کاٹ کر میں نے یپ کو کچھ فاصلے پر درختوں کی اوٹ میں کھڑا کیا اور خود دوبارہ چھوٹی حویلی کی عمارت کی طرف لپکا۔ ابھی تک کسی فوجی یا کسی ذی نفس سے میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا عمارت کی طرف جا رہا تھا کایک میرے سامنے والی جھاڑیوں میں جنبش ہوئی اور ایک ہیولا نمودار ہوا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے ایک زنانہ ہنسی کی آواز سنی اور پھر ایک نشے میں ڈوبی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی: "کم آن۔ بوتل کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس اثناء میں ہیولا میرے نزدیک آ چکا تھا۔ پہلی نظر میں یہ فوجی وردی میں ملبوس ایک عورت لگی مگر دوسرے ہی لمحہ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ سُجاتا تھی جو میری طرف بڑھ رہی تھی اور ہمارے درمیان اب صرف چند قدم کا فاصلہ تھا۔ میں سُجاتا کو پہلے بھی ہیڈکوارٹر کی عمارت سے نکلتے ہوئے دیکھ چکا تھا مگر وہ اس جگہ میری موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یوں بھی سُجاتا اس سے پہلے جس جس رنگ اور رُوپ میں میرے سامنے آ چکی تھی اور میرے ساتھ جو روح فرسا سلوک کر چکی تھی۔ اِس کے بعد میرے لیے سُجاتا کو بھلانا ممکن نہ تھا۔ سُجاتا اس حقیقت سے قطعی بے خبر تھی کہ اپنے جس شکار کو وہ نیم جان کر کے زنداں میں چھوڑ آئی تھی وہ اِس خوشی کے موقعے پر رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے پہنچ جائے گا۔

سُجاتا کو اچانک اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر میں رُک گیا تھا مگر وہ بدستور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی چال میں لرزش اور مدہوشی تھی۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی اور گنگناتی میرے پاس پہنچی تو میں نے اسے سیلوٹ مارا اور راستہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہو گیا۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ مسکرائی بولی "اوہو۔ جوان تم آج بھی ڈیوٹی پر ہو؟ ویری بیڈ۔" یکایک اُس کی نظریں میری نظروں سے ملیں۔ مدھم روشنی کے باوجود وہ مجھے پہچان گئی۔ اِس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار ہوئے اور پھر اُس کا ہاتھ تیزی سے کمر میں لٹکے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا مگر میں نے مہلت نہ دی۔ دوسرے لمحے اُس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک زور کا جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی اپنی مشین گن زمین پر گرا کر میں نے مضبوطی سے دوسرے ہاتھ سے اُس کا منہ بند کر دیا۔ اُس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے پوری قوت صرف کر دی مگر میری آہنی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکی۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کسی بھی وقت اُس کا بوائے فرینڈ جھاڑیوں میں سے نمودار ہو سکتا تھا۔ یا کوئی اور بھی ہم دونوں کو اس طرح گتھم گتھا ہوتے ہوئے دیکھ کر مشکوک ہو سکتا تھا۔ وہ تھی تو ایک عورت لیکن ایک صحت مند مضبوط اور سخت جان عورت تھی۔ اِسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مجھے اپنی تمام تر طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی۔ اِس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور منہ پر میرے دوسرے ہاتھ کی مضبوط بندش تھی۔ خود کو چھڑانے کے لیے وہ ایک زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنے فوجی جوتوں سے مجھے ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ حالات خاصے مخدوش تھے اور میرے پاس وقت بھی بہت کم تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ اُس کی کلائی کو میں نے ایک جھٹکے سے مروڑ کر چھوڑ دیا اور اپنا ایک ہاتھ آزاد کرانے کے بعد اُس کی گردن پر کراٹے کی ایک ضرب لگائی۔ اُس کی تمام جدوجہد اور طاقت آزمائی یک لخت بند ہو گئی۔ زمین پر گرنے سے پہلے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں روک لیا۔ جھک کر دوسرے ہاتھ سے زمین سے اپنی مشین گن اُٹھائی اور اسے بازو میں اُٹھائے مخالف سمت میں درختوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ سانس کی ہلکی آمد و رفت کے سوا اُس میں زندگی کے کوئی اور آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ درختوں کے سائے میں پہنچتے ہوئے مجھے نہ تو دقت ہوئی اور نہ ہی دیر لگی۔ اِسے آرام سے ایک موٹے سے درخت کے تنے کے ساتھ لٹا کر میں پلٹا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب میں اُن جھاڑیوں کے سامنے سے گزرا جہاں سے سُجاتا نکل کر آئی تھی تو وہاں سُجاتا کا بوائے فرینڈ مدہوشی اور خود فراموشی کے عالم میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی گیت گا رہا تھا یا سُجاتا کو جلد واپس آنے کی تاکید کر رہا تھا مگر اُس کی آواز سُجاتا تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ اُس کو ٹھکانے لگا دوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سُجاتا کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور دوسروں کو بھی خبردار کر دے مگر پھر اُس کی مدہوشی کے پیشِ نظر اندازہ ہوا کہ شاید وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی حالت میں بھی نہ تھا۔ میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کر کے برق رفتاری سے حویلی کی پچھلی جانب لپکا۔ اب تک ہر کام میری خواہش اور آسانی کے مطابق ہو رہا تھا لیکن کسی وقت بھی بنا بنایا کام بگڑتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ اِس سنہری موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں اب فوری طور پر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ عمارت کے عقب میں ایک اُجڑا ہوا ویران باغیچہ تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی عمارت کی طرف نظر دوڑائی تو روشنی کی کمی کے باوجود مجھے وہ کھلا ہوا روشندان نظر آ گیا۔ جس میں سے نائیلون کی ڈوری میں نے باہر پھینکی تھی۔ شکر ہے کہ ابھی تک کسی اور کی نظر

www.pdfbooksfree.pk

اُس کھلے ہوئے روشندان پر نہیں پڑی تھی۔ جشن جیسے ماحول اور شراب کے گردش کرتے ہوئے پیمانوں کی وجہ سے میرا کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ بلکہ یُوں کہنا چاہیے کہ قدرت نے خود بخود میرے لیے مناسب اور موزوں حالات مہیا کر دیئے تھے۔ مَیں دبے پاؤں روشندان کے نیچے پہنچا اور نائیلون کی ڈوری تلاش کرنے لگا تو مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ چاروں طرف تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ مَیں نے ہرچہ بادا باد کہہ کر اپنی جیب سے مُردہ فوجی کا لائٹر نکال کر روشن کیا اور چاروں طرف ڈوری کو تلاش کرنے لگا تو بالآخر مجھے مل گئی۔ وہ زمین سے قریباً چار فٹ اُونچائی پر لٹک رہی تھی اِس لیے پہلی نظر میں مجھے نظر نہ آسکی تھی۔ ڈوری کو آگ دکھانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اِسے سُلگانے کے بعد مَیں پُوری قوت سے بھاگا اور اُس جگہ پہنچ گیا جہاں جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جس جیپ میں چابی لگی ہوئی تھی اِسے مَیں نے بہت تیزی سے ریورس گیئر میں ڈال کر نکالا اور تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا عمارت سے دُور چلا گیا۔

سڑک کچی تھی اور ہموار بھی نہیں تھی مگر مَیں اُونچے نیچے گڑھوں، ہچکولوں اور دھچکوں سے بے نیاز تیزی سے جیپ دوڑاتا ہوا کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دُور نکل جانا چاہتا تھا۔ میری نظریں سامنے ناہموار کچی سڑک پر تھیں کیونکہ اندھیری رات میں اِس عارضی سڑک پر ڈرائیونگ آسان نہ تھی مگر اِس کے باوجود میں کنکھیوں سے پُرانی عمارتوں کی طرف دیکھتا جاتا تھا جو لمحہ بہ لمحہ مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھیں۔ اپنے اندازے کے مطابق ایک محفوظ فاصلے پر پہنچ کر مَیں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے جیپ روک لی اور آنے والے واقعات کے انتظار میں عمارتوں کی طرف نظر ڈالی جو تاریکی اور بلند و بالا درختوں کے درمیان میں حائل ہو جانے کی وجہ سے اَب مجھے صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یکایک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور مجھے اُونچے درختوں کے عقب میں آتشبازی سی چلتی ہوئی نظر آئی۔ دھماکہ خاصا زور کا تھا اور جنگل کی تنہائی اور سناٹے نے اُس کی آواز کو اور زیادہ خوفناک اور بھیانک بنا دیا تھا۔ اِس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی دھماکوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر آگ کے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مدھم شور کی کچھ انسانی آوازیں بھی اُس میں مِلی جُلی تھیں۔ مَیں چشمِ تصور میں اِس قیامت اور افراتفری کو دیکھ رہا تھا جو ہیڈ کوارٹر اور پُرانی حویلی کی عمارت میں مچی ہو گی۔ نشے میں چُور فوجی افسر اور سپاہیوں کو بھاگنے کی مہلت بھی نصیب نہیں ہُوئی ہو گی۔ عمارتوں کے اندر موجود محافظ اور جشن مناتے ہوئے فوجی افسروں اور اُن کی ہم جلیسوں کو تو شاید سوچنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہو گا مگر مجھے یقین تھا کہ عمارت کے آس پاس چوکسی کرنے والے فوجیوں اور اِردگرد کی جھاڑیوں میں رنگین محفلیں سجانے والے جوڑوں کو بھی سنبھلنے کا موقعہ نہیں مل سکا ہو گا۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے اور اِس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے دھماکوں کی آوازیں بھی جاری تھیں۔ یکایک ایک رعد نما آواز فضا میں گونجی اور جنگل میں یُوں محسوس ہوا جیسے بے شمار بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں کوند رہی ہیں۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھپا لیا اور غیر ارادی طور پر جیپ کی سیٹ پر اوندھا ہو کر جُھک گیا۔ مَیں نے میدانِ جنگ میں توپوں اور بمباری کی آوازیں بھی سُنی تھیں مگر ایسی خوفناک آواز اِس سے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے کوئی ایٹم بم پھٹ گیا ہو۔ گولے اور بارُود کے جو محفوظ ذخیرے مَیں نے اِس عمارت میں اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اُن کے علاوہ بھی یہ عمارتیں شاید اسلحہ کے ڈپو کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ اِکادُکا قیدیوں کو عذاب دینے کے لیے شاید اِن عقوبت خانوں میں رکھا جاتا ہو گا، لیکن درحقیقت یہ اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جو اتفاق سے مجھے نظر آ گیا اور مَیں اُسے تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دھماکوں کی آوازوں کے ساتھ ہی ویران اور تاریک جنگل کا ایک حصّہ بقعۂ نُور بن گیا۔ اُن لوگوں کے جشن میں رنگ و نور اور آتشبازی کی جو کمی تھی وہ اِس آتشزدگی نے پُوری کر دی۔ آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے آس پاس کے خُشک درختوں اور جھاڑیوں نے بھی آگ پکڑ لی ہے۔ مَیں نے مزید رُکنا لاحاصل جانا اور جیپ کو سٹارٹ کر کے بستی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک اور فرض میرا منتظر تھا مگر روانہ ہونے سے پہلے مَیں اُن بے گناہ قیدیوں کے لیے دُعائے مغفرت پڑھنا نہیں بھُولا جو ممکن ہے اِس وقت بھی اُن عمارتوں کے کسی گوشے میں موجود ہوں اور لقمۂ اجل بن گئے ہوں، لیکن بعض اوقات ایسی قربانیاں بھی دینی ہی پڑتی ہیں۔ خُدا کی مشیت میں کسی کو چارہ نہیں ہے۔ اگر میرا کوئی ہم قوم اِس ہلاکت آفرینی کا شکار ہوا ہو گا تو یقیناً اسے خُدا کے حضُور شہادت کا رُتبہ مِلا ہو گا۔

شیلا کے بتائے ہوئے راستے پر اندھا دُھند جیپ دوڑاتے ہوئے مَیں کئی بار بھٹکا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس نے مجھے زبانی طور پر راستہ بتایا تھا۔ میرے لیے یہ علاقہ اجنبی اور غیر مانوس تھا۔ پھر تاریکی نے رہے سہے نشانات بھی آنکھوں سے اوجھل کر دیئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جذبات کی شدت نے بھی میرے دِل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ ایک طرف مجھے یہ خُوشی تھی کہ مَیں دُشمن کی قید اور موت کے مُنہ سے بچ نکلا اور اِس کوشش میں دُشمن کے بہت بڑے ذخیرے کا پتہ لگانے اور اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف اِس خُوشی کے موقع پر مجھے رہ رہ کر اپنے اُن تین جاں بلب ساتھیوں

کا خیال آ رہا تھا جو اپنے مشن کے آغاز ہی میں اپنی جانوں کو مُلک اور قوم پر نثار کر بیٹھے۔ اَب مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اُنہوں نے بے جگری سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دشمنوں پر کوئی بھی مُلکی راز افشا کئے بغیر موت کو گلے لگایا تھا۔ اُن پر یہ الزام ایک تہمت سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے مشن کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو مجھ سے پُوچھ گچھ کے دوران وہ لوگ ضرور اُن کے بیان کردہ حقائق کا حوالہ دیتے۔ ایک اور فکر جو مجھے دامنگیر تھی وہ بستی میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تھی۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کی تباہی نے سارے علاقے میں دُور دُور تک کے رہنے والوں کو خبردار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ شیلا کی بستی تک بھی یہ روشنی اور آوازیں ضرور پہنچی ہوں گی۔ وہاں موجود فوجیوں اور دوسرے لوگوں پر اِس کا کیا ردِّعمل ہوا ہو گا اور کہیں انہوں نے اُن قیدیوں کو ہلاک تو نہ کر دیا ہو گا جو زنداں سے بستی میں رات گزارنے کے لیے منتقل کر دیئے گئے تھے مگر پھر مجھے اپنی مُنہ بولی بہن شیلا کا خیال آیا۔ میرا دِل یہ ماننے کو کسی طور آمادہ نہیں تھا کہ شیلا کے ہوتے ہوئے اُن بے بس قیدیوں پر کوئی آنچ آسکتی ہے۔

اپنے اندازے سے قریباً نصف گھنٹے تاخیر سے میں اُس بستی کے پاس پہنچ گیا جس کا پتہ نشان شیلا نے مجھے سمجھایا تھا۔ یہ ایک مختصر سی بستی نظر آتی تھی جس میں جھونپڑیوں کی تعداد کسی طرح بھی پندرہ سے زائد نہ ہو گی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ بستی والے میری راہ میں رُکاوٹ بننے کی صلاحیت اور طاقت نہیں رکھتے تھے۔ زیادہ تر جھونپڑیاں ایک طرف کُھلے میدان میں تھیں مگر دو جھونپڑیاں قدآور درختوں کے سائے میں بنی ہوئی تھیں جو شیلا اور اُس کی نند کی ملکیت تھیں۔ اِن جھونپڑیوں میں شیلا، اُس کا شوہر، اُس کی نند، نند کا گھر والا اور ایک کمسن بچے کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ شیلا کی اطلاع کے مطابق اُس کی نند کے خاندان سے فوجیوں نے ایک رات کے لیے اُن کی جھونپڑی خالی کرا لی تھی۔ اُس میں قیدی رکھے گئے تھے جن کے دروازے کے باہر فوجی پہرہ تھا۔ شیلا کے گھر میں فوجی محافظوں نے ڈیرہ جمایا تھا جہاں بقول شیلا دارُو کی موج بہار تھی۔

میرے اندازے کے مطابق تو اتنی دیر میں اُن سب کو مدہوش ہو جانا چاہیے تھا۔ بستی سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر مَیں نے جیپ روکی اور حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ مَیں ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ مَیں اچانک جیپ لے کر بستی میں پہنچ جاؤں یا جیپ کو کسی پوشیدہ جگہ چھپا کر اکیلا ہی پیدل شیلا کے گھر جاؤں؟ مگر پھر مَیں نے جیپ میں سوار ہو کر جانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مشین گن اور فالتو میگزین جیپ کے فرش پر تھا جبکہ دوسری مشین گن مَیں نے اپنے ہاتھ میں اِس طرح تھام رکھی تھی کہ ایک لمحہ کے نوٹس پر فائر کھول دوں۔ مَیں کسی متوقع حملے کے لیے پُوری طرح چوکنا اور تیار تھا۔

شیلا کے بتائے ہوئے گھر کے سامنے مَیں نے جیپ روکی تو وہاں پہلے سے ایک فوجی جیپ موجود تھی۔ اِس جیپ گاڑی میں کوئی موجود نہ تھا۔ مَیں نے پاس جا کر تصدیق کی۔ اسلحہ نام کی کوئی چیز اُس کے اندر نہیں تھی۔ مشین گن کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام کر مَیں اپنی جیپ سے کُودا اور پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھاتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ میری ساری توجہ اور تمام حسیات کا مرکز سامنے والی جھونپڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دائیں جانب ایک بڑے درخت کی جانب سے ایک ہیولا میری طرف لپکا تو میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاشعوری طور پر مَیں نے ایک دم مشین گن کا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا۔ میری اُنگلی حرکت میں آنے ہی والی تھی کہ مَیں نے سرگوشی میں ایک آواز سُنی ”بھیا!“ اور مَیں جس حالت میں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔ خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مَیں نے فائر کھولنے میں تاخیر کر دی تھی ورنہ مَیں اَن جانے میں شیلا کو بھُون کر رکھ دیتا۔

وہ دوڑی ہوئی میرے پاس آئی۔ نیم تاریکی میں اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”کہاں سے آ رہے ہو؟ یہ دھماکوں کی آوازیں کیسی ہیں! کیا جنگل میں کہیں لڑائی ہو رہی ہے یا بم گرے ہیں؟ تم نے اُس طرف دیکھا جدھر آگ کی لپٹیں نظر آ رہی ہیں؟“ اُس نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر دیئے۔ اُس کا اِشارہ اُس سُرخی کی طرف تھا جو دُور جنگل میں شفق کی طرح درختوں کی اُونچی چوٹیوں کے اُوپر سے نظر آ رہی تھی۔ اِس سے پہلے کہ مَیں کوئی جواب دیتا اُس نے میرے ہاتھوں، شانے اور سر کو نرمی سے چھُوا اور محبت بھرے لہجے میں پُوچھنے لگی ”تم ٹھیک تو ہو نا! کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟“

اُس کی پیار بھری آواز میں تشویش بھی شامل تھی۔ تمام کشیدگی اور پریشانی کے باوجود مَیں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا: ”سب ٹھیک ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

”کیا کہیں بم گرے ہیں؟“ اُس نے دوبارہ سوال کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

"بم نہیں گرے شیلا۔ وہ۔ وہ فوجی ہیڈکوارٹر تھا نا۔ اُس میں گولہ بارُود بھرا ہوا تھا۔ اُس حویلی میں آگ لگی اور ساری بلڈنگیں پٹاخوں کی طرح بیٹھ گئیں۔" میں اپنی آواز میں چھپی ہوئی مسرت کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یوں لگا جیسے اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی روشنی ایک دم ماند پڑ گئی۔

"ہائے دیا" وہ دونوں ہاتھ کلیجے پر رکھ کر بے اختیار بولی۔ "وہاں تو بڑا نقصان ہوا ہوگا؟ سارے لوگ مر گئے ہوں گے!؟"

"ہاں اور کیا۔" میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا نہیں سوکھی ہوئی آتشبازی کی طرح شعلے اور چنگاریاں سلگے جنگل میں اُڑ رہی ہیں۔ وہاں کون بچا ہوگا۔"

شیلا ایک لمحہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر رفتہ رفتہ ایک غضبناک تاثر پھیلنے لگا تھا۔ جب وہ بولی تو اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تم نے انہیں جلا دیا۔ سب کو مار دیا؟!"

میں اُس کے لہجے کی گرختگی پر حیران رہ گیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا۔ بولو؟ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

مجھے کوئی اور جواب نہ سوجھا "وہ میرے دشمن تھے شیلا۔"

"مگر میں نے تو تمہیں آزاد کرا دیا تھا۔ پھر تم نے اُن سب کو کیوں برباد کر دیا؟"

میں نے کہا: "سمجھنے کی کوشش کرو شیلا۔ لڑائی میں سب کچھ جائز ہے اور یہی ہوتا ہے کہ جس کا داؤ چلتا ہے وہ اپنے دشمن کو معاف نہیں کرتا۔ جنگ میں پہل کرنے والا ہی کامیاب رہتا ہے۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ یہ بتاؤ تمہارے مہمانوں کا کیا حال ہے؟"

مگر شیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور مجھے تک رہی تھی۔ میں اُس کی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو تو نہیں دیکھ سکا مگر اُس کی بھرّائی ہوئی رقت میں ڈوبی ہوئی آواز سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ رو رہی ہے۔ "بھیّا" تم نے اُن سب کو مار دیا؟ مٹا دیا؟ وہ میرے دیش کے لوگ تھے۔ میرے دیش کے سپاہی تھے:" وہ اُس کے آگے نہ بول سکی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ میں حیران ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ یکایک وطن اور قوم کی محبت کا جذبہ اُس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے قطعی خلاف توقع اور خطرناک تھی۔

"میں نے۔ میں نے تمہیں اس لیے تو نہیں بچایا تھا کہ تم ان سب کو مٹا دو۔ ملیا میٹ کر دو۔ میں نے تمہیں اپنا بھائی اِس لیے تو نہیں بنایا تھا کہ تم میرے دیس کے بھائیوں کو ختم کر دو۔ وہ تمہارے دُشمن تھے۔ مگر میرے دیش کے سپوت تھے۔ میرے دیش کی رکھشا کرنے والے تھے تم نے اُن سب کو ختم کر دیا؟!"

یکایک جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اُس نے میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ "یہ تم نے کیا کر دیا۔ کیا کر دیا تم نے؟ تم ظالم ہو، خونی ہو۔ قاتل ہو۔" اُس نے دیوانہ وار میرے سینے پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے اُس کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کی مگر اُس پر دیوانگی کا عالم تھا۔ اُس کے چہرے پر میرے لیے نفرت تھی اور اُس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی جو ظاہر ہے کہ میرے لیے خطرے کی علامت تھی۔ میں نے پہلے نرمی سے اُس کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر اُس کی جنون خیزی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے جھپٹ کر مشین گن کی نالی تھام لی اور میرے ہاتھ سے چھیننے کے لیے اسے جھٹکے دینے لگی۔ اب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے مشین گن اُس کے ہاتھ سے چھڑائی اور زمین پر ڈال دی۔ وہ مشین گن کی طرف لپکی مگر میں نے ایک ہاتھ سے اُس کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی اور سختی سے گرفت میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ اس کے باوجود اُس کی دیوانگی کم نہ ہوئی تو میں نے پے در پے کئی تمانچے اُس کے چہرے پر رسید کیے "شیلا ہوش میں آؤ۔ ہوش میں آؤ شیلا ورنہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تم نے میرے دیش کے رکھوالوں کو مارا ہے۔" وہ چلائی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "وہ تمہارے رکھوالے نہیں تمہاری عزت کے دُشمن تھے۔ وہ بھیڑیے تھے جنہیں اپنے پرائے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بھول گئیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟ انہوں نے تمہاری عزت اور تمہارے گھر والے کے بھروسے پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اپنی آبرو پر ڈاکہ ڈالنے والوں کو تم اپنا رکھوالا سمجھتی ہو؟ مت بھولو کہ میں نے کسی غرض، لالچ اور مطلب کے بغیر اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں اُن وحشیوں کے چنگل سے بچایا تھا۔ اُن کی نظروں میں انسانیت اور عورتوں کی عزت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ موقعہ ملتا تو وہ سب

تمہارے ساتھ وہی سلوک کرتے جو جنگل میں اُن کے ساتھی درندے کرنے والے تھے۔ پھر بھی تم انہیں اپنا بھائی کہتی ہو اور جسے اپنا بھیّا کہا تھا اُسے اپنا دُشمن سمجھتی ہو؟ تم کیسی عورت ہو جسے اپنی عزت آبرو کا بھی پاس نہیں ہے۔ جسے دُشمنوں کا احساس نہیں؟ میں تمہیں غلط سمجھا تھا شیلا۔ تمہاری پیار بھری باتوں کے دھوکے میں آ گیا تھا۔ اگر تم مجھے ایسا ہی سمجھتی ہو جیسا تم نے کہا ہے تو پھر میں اِس رشتے کی قید سے آزاد ہو گیا ہوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان قائم کیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے اپنے سے دُور دھکیلا۔ وہ سنبھلنے کے باوجود زمین پر گر گئی۔ اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور وہ زمین پر سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ وقتی طور پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ خاموش مجھے گھورتی رہی۔ یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ شیلا زمین پر جس جگہ مُنہ کے بل جا کر گری تھی وہاں اُس کے ہاتھوں کے پاس ہی میری مشین گن پڑی تھی۔ یکایک اُس نے ہاتھ بڑھا کر مشین گن کو اُٹھا لیا اور مجھے گھورتی ہوئی آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُٹھتے اُٹھتے بھی اُس نے مشین گن کو تھامے رکھا جس کا رُخ بدستور میری طرف تھا۔ اُس وقت اُس کی کیفیت ایک زخمی شیرنی جیسی تھی۔ وہ مشتعل تھی۔ غضبناک تھی۔ میں نے اُس کے جذبات کو مجروح کیا۔ اُس کے ہم وطنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ میرے لیے اُس کی نظروں میں نفرت بھرے انتقام کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں اتنی مشکل سے جیتی ہوئی بازی ایک عورت کے مقابلے میں ہار گیا تھا۔ دُشمن کی اتنی بڑی قوت کو تن تنہا تباہ کر دینے والا شخص ایک مسلح عورت کی مشین گن کی زد میں تھا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اُس کی اُنگلی کا معمولی سا دباؤ میرے جسم کو چھلنی کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں اُس پر چھلانگ لگا سکتا تھا۔ مگر مشین گن جیسے مُہلک اور جان لیوا ہتھیار کی مالک مجسّم آتش عورت کے سامنے یہ بھی ایک حماقت ہوتی۔ میرے بچ رہنے کے امکانات پانچ فیصد سے زائد نہ تھے مگر میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ چند لمحے ہم دونوں میں سے کسی نے بھی پلک نہیں جھپکی مگر پھر اُس کی نگاہیں جھک گئیں اور ساتھ ہی مشین گن کی نالی کا رُخ بھی زمین کی طرف ہو گیا۔ اُس نے میری طرف سے مُنہ موڑ لیا اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ وہ عورت جو کچھ دیر پہلے غیض و غضب کی تصویر بنی ہوئی تھی اَب ایک بے بس اور مجبور عورت کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اُس پر ترس اور پیار آ گیا۔ میں آہستہ سے اُس کے نزدیک گیا اور نرم آواز میں اُسے مخاطب کیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ شیلا کہ میں غصّے میں بہک گیا تھا۔ مجھے تمہیں اِس طرح مخاطب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نہ ہی میرا رویّہ مناسب تھا۔ اِس کے لیے میں شرمندہ ہوں اور تم سے معافی کا طلبگار بھی ہوں۔"

اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا: "یقین کرو شیلا۔ میں نے جو کچھ بھی ہیڈکوارٹر میں جا کر کیا وہ خلاف توقع نہ تھا۔ تم بھی جانتی تھیں کہ میں ایک دشمن سپاہی ہوں اور زمانۂ جنگ میں دُشمن کے علاقے میں پکڑا گیا ہوں۔ میں نے وہی کچھ کیا جو ایک سپاہی کی حیثیت سے میرا فرض تھا مگر میں نے تمہارے بارے میں جو الفاظ کہے میں اُنہیں واپس لینا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں اُن جنگلی حیوانوں کی درندگی سے بچایا تھا مگر یہ تم پر کوئی احسان نہ تھا۔ ایک مسلمان اور انسان ہونے کی حیثیت میں یہ میرا فرض تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ جانے بغیر بے اختیار وہ قدم اُٹھایا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی اور معصوم اور مجبور عورت بھی ہوتی تو میرا وہی رویّہ اور فیصلہ ہوتا۔ یہ تم پر میرا کوئی ذاتی احسان نہیں ہے۔ ہاں البتہ تم نے میری جان بچا کر اور مجھے قید سے رہائی دِلا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر میرا تم پر کوئی احسان تھا بھی تو تم اِس کا بدلہ ادا کر چکی ہو۔ اگر میں نے تمہاری خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا تو تم نے میرے لیے اِس سے بھی بڑا خطرہ مول لیا۔ تمہارا احسان اِس لحاظ سے بہت بڑا ہے کہ تم نے اپنے ہم وطنوں اور اپنے مُلک کے رکھوالوں کے خلاف میرا ساتھ دیا جس کے بارے میں تم بخوبی جانتی تھیں کہ وہ ایک دُشمن قوم کا سپاہی ہے۔ تم بہت عظیم ہو۔ مجھے بھائی کہہ کر ہو سکتا ہے تمہیں پچھتاوا ہو رہا ہو مگر بخدا میں تمہیں بہن بنا کر بالکل شرمسار نہیں ہوں۔ اگر تم مجھے بُرا بھلا کہو۔ مجھ سے نفرت کرو۔ مجھے جان سے مار دو تب بھی میں اپنا وہ رشتہ نہیں توڑوں گا جو ایک بار ہم دونوں کے درمیان قائم ہو چکا ہے۔" اتنا کہہ کر میں اُس کے پاس سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میں نے اُوپر اُٹھا لیے اور کہا: "شیلا۔ تمہارا مُجرم تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اگر مجھے گولیوں کا نشانہ بنا کر تمہارے ضمیر اور دِل و دماغ کو اطمینان اور سکون حاصل ہو سکتا ہے تو بے شک گولی چلاؤ۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔" میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو گیا مگر مرنے سے پہلے مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے اپنے تین جانباز ساتھیوں کی موت کا انتقام لے لیا ہے۔ گو میں اپنے مشن کو پُورا کرنے میں کامیاب نہیں رہا تھا مگر پھر بھی میں دُشمن کی طاقت پر ایک کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ موت برحق ہے ـــــ مگر میرے دِل کو یہ تسلّی تھی کہ میں بُزدلوں کی موت نہیں مر رہا۔ بہادروں کی طرح دُشمن کے بے شمار فوجیوں کو مار کر جان دے رہا ہوں۔

www.pdfbooksfree.pk

میں فولادی آتشیں گولیوں کا مُقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا مگر گولیوں کی بجائے شیلا کے ہاتھ میرے جسم سے ٹکرائے۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا تو شیلا میرے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اِس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مشین گن اُس نے زمین پر ڈال دی تھی اور میرے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "میرا بھیا۔ میرا ویر۔" وہ رِندھی ہوئی آواز میں روتی ہوئی بولی۔ "بھلا کوئی بہن اپنے بھائی پر بھی گولی چلا سکتی ہے؟ میرا دُنیا میں کوئی بھائی نہیں تھا۔ بھگوان نے تم جیسا جیالا بھائی دے دیا ہے تو کیا میں اس پر گولی چلاؤں گی؟ اس سے پہلے تو مجھے موت آجائے تو اچھا ہے۔" میں نے اپنے اُونچے اُٹھتے ہوئے ہاتھ نیچے کیے اور پیار سے شیلا کے شانے کو تھپکا مگر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں سے لگا لیے۔ پھر اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو چُومنا شروع کر دیا۔ "میرا ویر۔ میرا سُورما بھیا۔" وہ روتی جاتی تھی اور بار بار یہ الفاظ دوہرا رہی تھی۔ "بھیا مجھے معاف کر دو۔ میں ابھاگن اَن جانے میں کیا پاپ کرنے لگی تھی۔ مجھے شما کر دو بھیا۔ میں نے بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ تم پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ تمہارا دِل دُکھایا ہے۔ میرا یہ پاپ تو دوسرے جنم میں بھی ختم نہ ہوگا۔" وہ بے اختیار اور مُسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے پیار سے اِس کو جھڑکا "بس چُپ ہو جا۔"

وہ چُپ ہو کر سِسکیاں بھرنے لگی تو میں نے پیار سے اُس کو سمجھایا "دیکھ غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔ ہم دونوں بھی مٹی سے بنے ہوئے انسان ہیں۔ جذبات اور جوش میں آگئے تھے مگر ہمارے اندر جو اچھائی اور انسانیت ہے اِس نے ہمیں بھٹکنے نہیں دیا۔ پگلی کہیں کی۔ ارے معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے تجھ سے۔ اپنی بہن سُشیل کو دُکھایا ہے میں نے۔ چل اب معاف کر دے اپنے بھیا کو۔" میں اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی "بھیا۔ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ اپنے جھگڑے میں یہ تو بھول گئی کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔ نہ جانے کس وقت تمہارے دُشمن تمہاری کھوج میں یہاں پہنچ جائیں۔ نہ میں نے تمہیں کھانے پانی کو پوچھا۔ چلو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنی جھونپڑی کی طرف لے جانے لگی۔

میں بھی اچانک جذبات کے تلاطم سے باہر نکل آیا۔ "پہرے والے فوجیوں کا کیا حال ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"چل کر دیکھ لو سب کے سب بے ہوش پڑے ہوئے ہیں؟"

"اور گاؤں کے دوسرے لوگ؟"

"مُفت کی دارو پینے کو مل جائے تو اُنہیں پھر اور کیا چاہیئے۔ گاؤں کے سارے لوگ، عورتوں سمیت نشے میں اوندھے پڑے ہوئے ہیں۔"

اسی اثنا میں ہم دونوں جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ شیلا نے سچ ہی بتایا تھا۔ جھونپڑی میں چٹائی کے فرش پر دیسی شراب کی چند خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور اِس کے آس پاس تین فوجی، شیلا کا خاوند اور تین دیہاتی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے خرّاٹے لے رہے تھے۔ نہ جانے اِس وقت وہ نشے کی کون سی منزل میں تھے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مُشکل نہ تھا کہ وہ اِس وقت بے جان لاشوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

"قیدی کہاں ہیں؟ وہ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ بولی۔ "خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" وہ مجھے لے کر ساتھ والی جھونپڑی کی طرف بڑھی مگر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دو [illegible] لالٹین کی مدھم روشنی میں دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔ جو صاف ظاہر ہے کہ اُنہوں نے مدہوش فوجیوں سے ہتھیائی ہوں گی۔ پاس آئے تو میں نے واضح طور پر اُنہیں دیکھا۔ ان کی داڑھیاں اور سر [illegible] ہوئے تھے۔ لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا تھا جس کے اصلی رنگ کا اندازہ لگانا مُشکل تھا۔ وہ دونوں زخمی بھی تھے۔ تشدّد اور ظلم کے نشانات زخموں کی صورت میں اِن کے جسموں پر موجود تھے۔ ان کی عُمروں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بہت مُشکل تھا مگر دوسرا جو چند قدم پیچھے چل رہا تھا کم عمر اور زیادہ پھرتیلا نظر آتا تھا۔ اُنہوں نے مجھے دیکھ کر "السلام علیکم" کہا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکے تھے۔ شیلا نے اُنہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اظہارِ محبت اور اپنائیت کا یہ انداز بھی انوکھا تھا۔ دراصل جذبات کی شدّت نے ہم سب کی آوازیں سلب کر لی تھیں اور ہم ایک دوسرے کو لپٹا کر پیار کرنے اور آنسو بہانے کے سوا اور کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ کچھ دیر یہی عالم رہا۔ پھر ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اِس دوران شیلا خاموش کھڑی ہمیں دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جھونپڑی

کی طرف چلی گئی۔

ہم تینوں نے آپس میں تعارف کی رسم ادا کی۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں سپاہی تھے۔ ایک کا نام مُبارک تھا جبکہ دوسرا لیفٹیننٹ تھا۔ اس کا نام سجّاد تھا اور بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ ٹینکوں کی ایک لڑائی کے بعد دشمنوں کے گھیرے میں آگیا تھا۔ اتنے مصائب اور ظلم و ستم سہنے کے باوجود وہ اپنی زندہ دِلی اور مُسکراہٹ سے محروم نہیں ہُوا تھا۔ وہ دونوں ایک جھڑپ کے دوران زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ بعد میں قید کے دوران ان سے پُوچھ گچھ کی گئی اور مزید تشدّد کا نشانہ بنایا گیا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اُن کے دو ساتھی اور بھی تھے۔ جب ان سے کوئی کارآمد معلومات نہ اُگلوا سکے تو اُنہیں فائرنگ سکوئیڈ نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ ان دونوں شہیدوں کا ذِکر کرتے ہُوئے مُبارک کی آواز بھرّا گئی۔ "وہ بہت جی دار اور ہمّت والے تھے سر کوئی ظلم کوئی ستم ان کو لب کھولنے پر مجبور نہ کر سکا۔ اُنہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ چُپ چاپ ہی جان دے دی۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میرا دِل بھی بھر آیا میں نے اِسے تسلّی دی "مُلک اور قوم کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ یہ زندگی خدا کی امانت ہی تو ہے۔ ایک نہ ایک دِن تو یہ امانت اُسے لوٹانا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو کسی بُلند مقصد کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔" پھر اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے پُوچھا "یہ کہو۔ بستی میں تم پر کیا گُزری؟"

وہ مُسکرانے لگا "ہمارے پہریدار تو آتے ہی شراب کی بوتلیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ اِن کے پاس شراب کی بے شمار بوتلیں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا جنگ کے دوران اسلحہ کی بجائے شراب کا اتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس کہاں سے آگیا۔؟"

میں نے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ان کے ہاں اسلحہ کا اس سے بھی بڑا ذخیرہ ہے۔" مبارک اور سجّاد نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔ میں مُسکرایا "اطمینان رکھو۔ اب نہ شراب ان کے کام آئے گی اور نہ ہی اسلحہ کا ذخیرہ۔ ابھی تم نے اُدھر جنگل میں آتشبازی کی آوازیں سُنی ہوں گی اور روشنی بھی دیکھی ہوگی۔"

مُبارک نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی "اوہ۔ سمجھ گیا۔ سر تو یہ آپ کی حرکت ہے؟"

میں نے معصومیت سے گردن ہلائی "جی ہاں۔ میں ہی قصوروار ہوں۔"

مُبارک اور سجّاد ایک دم جوش میں آگئے "تو کیا آپ نے تمام ذخیرہ تباہ کر دیا؟"

"نہ صرف ذخیرہ۔ بلکہ آس پاس کی عمارتیں اور سارے مہمان اور میزبان بھی پہرے دار فوجیوں سمیت آتشبازی کے ساتھ ہی پھلجڑیوں کی طرح اُڑ گئے!"

وہ دونوں اس بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے تھے جو میں نے مختصر طور پر اُنہیں بتا دیں۔ ان کے لیے یہ امر نہ صرف حیرت کا باعث تھا، بلکہ مارے خوشی کے وہ دیوانے ہو گئے تھے کہ ان کو نہ صرف زنداں سے آزادی مل چکی ہے بلکہ صیّاد کا وہ آشیانہ بھی برق کا نشانہ بن کر نیست و نابود ہو چکا ہے جہاں مظلوموں پر مشقِ ستم کی جایا کرتی تھی۔ وہ تو بہت کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر اس اثنا میں شیلا سامنے والی جھونپڑی سے کھانے کا تھال لے کر برآمد ہوئی اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

شیلا تھال میں دال۔ روٹی۔ پاپڑ۔ چاول۔ نہ جانے کیا کچھ اُٹھا لائی تھی۔

"لو بھیا۔ جو بھی تھوڑا بہت کھانا ہے کھا لو۔"

"تھوڑا بہت؟" میں نے کھانے کی مقدار کو دیکھ کر کہا۔ "ارے پگلی۔ یہ تو ایک درجن آدمیوں کے لیے کافی ہے۔ اتنا ڈھیر کھانا آیا کہاں سے؟"

کہنے لگی "فوجی مہمانوں کے لیے بنایا تھا مگر ان بیچاروں کو تو پینے پلانے سے ہی فرصت نہیں ملی۔ کھانے کا ہوش کِسے تھا؟"

سجّاد نے شیلا کا شُکریہ ادا کیا اور مجھے بتایا کہ اُس نے اِن دونوں کی خاطر داری اور آسائش میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ یہ ان کا ہمارے اوپر بہت بڑا احسان ہے۔

وہ غصّے سے بولی "احسان کیا؟ بہن اگر بھائی کی خدمت کرتی ہے تو اس میں احسان تو نہیں ہوتا۔ بھیّا! انہیں منع کر دو۔ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں خفا ہو جاؤں گی۔"

"نہ نہ۔ ایسا غضب مت کرنا۔ میں تیرے بارے میں انہیں بتا دوں گا کہ غصّے کی بہت خراب ہے۔ بہت نخرے والی ہے میری بہن۔"

www.pdfbooksfree.pk

وہ ہنس پڑی: "ٹھہرو۔ میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

اُس کے جانے کے بعد ہم تینوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ سچ پوچھئے تو خدا جانے کتنے لمبے عرصے بعد گھریلو کھانے کا مزہ چکھا تھا۔ پھر حالات نے جو خوشگوار پلٹا کھایا تھا اس کی وجہ سے بھی ہم سب کی بھوک خوب کھل گئی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو جان میں جان آئی۔ اب ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ بستی میں جو دشمن فوجی مدہوش پڑے ہیں۔ اِن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؛ اور پھر یہاں سے بھاگنے کی کیا ترکیب ہو؟ مبارک کا مشورہ تو یہ تھا کہ سارے فوجیوں کو مار دیا جائے۔ وہ ان لوگوں کی قید میں کڑی سختیاں جھیل چکا تھا اور اُس کا دل نفرت اور انتقام کی آگ سے بھرا ہوا تھا مگر سجاد کا خیال تھا کہ بے ہوش دشمنوں کو بے خبری میں ہلاک کرنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ پھر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میری خاطر شیلا نے اپنے ہم وطنوں کی تباہی اور ہلاکت کا صدمہ جس صبر کے ساتھ برداشت کیا ہے وہ اسی کا حوصلہ ہے۔ اگر باقیماندہ فوجیوں کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو شاید وہ منہ سے کچھ نہ بولے مگر اس کے دل پر جو گزرے گی وہ میں خوب جانتا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ فوجیوں کو باندھ کر ڈال دیا جائے اور انہیں ہتھیاروں سے محروم کر دیا جائے۔ میں یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ بعد میں ان فوجیوں سے فرض شناسی اور غفلت کے جرم میں باز پرس کی جائے گی اور فوجی قواعد کے مطابق سنگین سزائیں ملیں گی۔ چنانچہ ہم نے جلدی جلدی بے ہوش فوجیوں کو اکٹھا کیا اور باندھ کر ڈال دیا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی کارروائی سے بالکل بے خبر تھے۔ بعض نے نشے میں منہ سے کچھ آوازیں بھی نکالیں جن کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ گاؤں کے دوسرے مردوں اور عورتوں کو بھی ہم نے اکٹھا کر کے ایک جھونپڑی میں ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں شیلا خاموش، خالی خالی نظروں سے ایک طرف کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ شیلا اور اس کے گھر والے کو ہم نے ان کی اپنی جھونپڑی میں بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا شوہر تو بے ہوش تھا مگر شیلا کو شک و شبہ سے محفوظ رکھنے کے خاطر کوئی مناسب بندوبست کرنا بہت ضروری تھا۔ میں نے شیلا کو یہ بات بتائی اور پھر یہ تجویز پیش کی کہ ہم اس کے ہاتھ پیر باندھ کر چھوڑ جائیں گے تاکہ اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے۔ شیلا خاموش میری طرف دیکھتی رہی پھر اتنا بولی: "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جو تم ٹھیک سمجھتے ہو کرو۔"

اب سب سے مشکل مرحلہ پیش آیا۔ یعنی شیلا کو باندھ کر اس سے رخصت ہونے کا۔ میں نے ایک رسی سے شیلا کے ہاتھ اور پیر باندھ دیئے۔ وہ چپ چاپ آنسو بھری نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر میں نے اسے آرام سے ایک چارپائی پر لٹا دیا اور کہا: "معاف کرنا بہن تمہاری حفاظت کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اب مجھے اجازت دو۔ ہمیں بہت لمبا اور انجانا سفر طے کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ہمت سے اس کا سر تھپکا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ اللہ نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ مجھے خود اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا اور پھر اگر قسمت نے ساتھ دیا اور بچ کر حفاظت سے اپنے وطن واپس پہنچ بھی گیا تو دوبارہ شیلا سے ملاقات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اُس کے گاؤں اور آس پاس کے علاقے کا نام اور پتہ نشان دریافت کر لیا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ میں دشمن کے ملک میں کون سے علاقے میں ہوں اور مجھے واپسی کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ میں کسی مزید تاخیر کے بغیر رخصت ہونا چاہتا تھا۔ شیلا کی سسکیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ مجبوراً اس کو الوداع کہا اور پلٹ کر جانے لگا تو اُس نے مجھے پکارا: "بھیا سنو۔" میں رک گیا۔ سوچا عورتوں کی عادت کے مطابق پھر روئے گی مگر اُس کے نزدیک پہنچا تو اس کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آرہے۔ بولی: "بھیا۔ تمہیں نہ جانے کتنا لمبا سفر کرنا ہوگا۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے مشین گنوں کی طرف اشارہ کیا تو ہنس پڑی: "مگر ان کو کھا تو نہیں سکتے نا! اُوپر والی ٹوکری میں کپڑے ہٹا کر دیکھو۔ تھوڑے سے پیسے رکھے ہیں۔ وہ لے جاؤ۔"

"ارے نہیں! پیسوں کی مجھے کیا ضرورت ہے۔"

"کون جانے کیا حالات ہوں۔ کیا ضرورت پڑ جائے۔ ساتھ رکھ لو شاید کام آجائیں۔ اگر بچ گئے تو اپنی بچھڑی ہوئی بہن کی یادگار سمجھ کر رکھ لینا۔ یا پھر کسی کو دان کر دینا۔ مجھے اس کا بدلہ بھگوان کے پاس سے مل جائے گا۔"

جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس نے جس پیار سے کہا تھا اس کے پیشِ نظر انکار کرتا تو اُس کا دل ٹوٹ جاتا۔ ٹوکری میں تین چار سو روپے سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ نہ جانے کس طرح اُس نے کوڑی کوڑی جوڑ کر یہ پیسہ جمع کیا ہوگا جو اس نے اپنے منہ بولے بھائی کی نذر کر دیا۔ چلتے چلتے میں نے ایک بار پھر شیلا کو محبت سے دلاسہ دیا۔ جھونپڑی کا دروازہ بند کیا تو وہ خاموش ڈبڈبائی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا مگر تیزی سے جھونپڑی کی کنڈی چڑھانے کے بعد میں اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف بڑھا جو جیپ کے پاس میرے منتظر کھڑے تھے۔ اِن دونوں کو تمام حالات کا علم ہو چکا تھا اور انہیں میرے جذباتی لمحے کا پورا پورا احساس تھا۔ جیپ میں ہم نے فالتو مشین گنیں اور ایمونیشن بھی ڈال لیا تھا۔ میں نے سٹیرنگ سنبھالا اور جیپ رخصت ہوئی تو میرا دل شیلا کی یاد میں غمگین ہو گیا۔ کاش میں دنیا بھر میں اپنی واحد بہن کے پاس رہ سکتا یا اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ کہنے کو وہ منہ بولی بہن تھی مگر میں نے زندگی میں بہن اور بھائی کے رشتے کا پہلی بار مزہ چکھا تھا اور پھوپھی کے بعد یہ پہلی ہستی ملی تھی جو مجھ سے بے لوث اور بے اندازہ پیار کرتی تھی اور میری خاطر اپنی جان تک قربان کرنے پر آمادہ تھی۔ میں نے سوچا۔ کاش شیلا مجھے مختلف حالات میں اور مختلف مقام پر ملی ہوتی تو میں اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہ سماتا۔ اِس کے قدموں میں زمانے بھر کی خوشیاں ڈھیر کر دیتا۔ اسے آسائشوں سے لاد دیتا۔ دنیا کا کوئی غم اِس کے نزدیک نہ آنے دیتا —— پھر میں نے شیلا کے شوہر کے بارے میں سوچا۔ یہ حقیقت ہے کہ شیلا کے بارے میں میرے جذبات ایک سگے بھائی سے زیادہ شدید تھے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کے شوہر سے میرا کوئی قلبی یا جذباتی تعلق قائم نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے نظر بھر کر غور سے اُس شخص کی صورت تک نہیں دیکھی تھی جو میری منہ بولی بہن کا سہاگ تھا۔ اِس الوکھے رشتے کے متعلق سوچ کر میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

ہماری جیپ کچی پگڈنڈیوں پر سفر کر رہی تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ میں بے خوفی کے ساتھ جیپ کی روشنیاں جلا کر سفر طے کر رہا تھا۔ کیونکہ راستہ انجانا اور تاریک تھا۔ یوں بھی نواحی علاقے میں دشمن کے فوجیوں کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہم تینوں نے دشمن کے فوجیوں کی وردیاں زیب تن کر رکھی تھیں اور اِن ہی کی فوجی جیپ میں سوار تھے۔ دشمن سے آمنا سامنا ہونے کی صورت میں ہمارا فوراً پکڑا جانا ممکن نہ تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ پچھلی کامیابیوں اور کامرانیوں نے ہمارے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ ہم خود اعتمادی کے جذبے سے سرشار تھے۔

کافی راستہ طے کرنے کے بعد مجھے مبارک کی آواز سنائی دی: "صاحب آخر ہم کدھر جا رہے ہیں؟ کچھ پتہ بھی ہے؟"

میں چونک پڑا۔ واقعی اِس کا سوال بہت اہم اور برقت تھا۔ شیلا نے مجھے اس علاقے کے بارے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق ہم اپنی سرحدوں سے کم از کم سو ڈیڑھ سو میل دُور تھے۔ لیکن درحقیقت ہم کس مقام پر تھے اور راہ میں کون کون سے اور کتنے مشکل مقام آتے تھے اُس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ سمت اور جگہوں کا تعین کرنے کے لیے میرے پاس نہ کوئی نقشہ تھا اور نہ کمپاس۔ دراصل جب ہمیں مشن پر بھیجا گیا تھا تو اُس علاقے کے بارے میں ہمارے پاس تمام ضروری معلومات اور کوائف موجود تھے جہاں ہمیں پیراشوٹ کے ذریعے اُتارا گیا تھا مگر اس کے باوجود ہم پر جو گزری اور جس طرح ہم چاروں ایک دوسرے سے بچھڑ کر بھٹک گئے اس کی وجہ سے جائے وقوع کے بارے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر گرفتار ہونے کے بعد پوری ہو گئی۔ ہمارے کاغذات پہلے ہی تلف ہو چکے تھے۔ گرفتاری کے بعد ہمیں جن راستوں سے گزار کر اس مقام پر لایا گیا۔ اِس کے متعلق بھی ہمیں کوئی علم نہ تھا۔ البتہ مجھے یہ علم ضرور تھا کہ آس پاس کے علاقے میں اسلحہ کی ایک فیکٹری اور ایک ائرپورٹ بھی ہونا چاہیئے۔ مگر کہاں اور کس سمت میں؟ اِس بارے میں کچھ اندازہ نہ تھا۔ لیکن صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ ہم رات کے اندھیرے میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں اور اپنی سرحدوں کے نزدیک نہ پہنچ جائیں تاکہ دن کی روشنی میں اگر دشمن سے سامنا بھی ہو جائے تو وہ ہمیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ اِس کے علاوہ گھر جانے کی صورت میں رات کے وقت بچ نکلنا زیادہ آسان تھا۔

مبارک اور سجاد میری صورت تک رہے تھے اور میں ان خیالوں میں گم تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ دونوں بھی راستوں کے بارے میں میری راہنمائی کرنے سے قاصر تھے۔ بلکہ دیکھا جائے تو میں ان کے مقابلے میں کچھ زیادہ باخبر تھا۔ اُن دونوں کی خود اعتمادی اور بلند مورال کو برقرار رکھنا بھی لازمی تھا اس لیے میں مسکرایا اور بڑے اعتماد سے میں نے کہا: "دیکھو دوستو۔ راستوں کا صحیح اندازہ مجھے نہیں ہے لیکن اتنا محسوس کر سکتا ہوں کہ ہم درست سمت جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی نہ بھولو کہ قدرت ہم پر مہربان ہے۔ آج کے دن کامیابی اور نصرت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ چند گھنٹے پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پانسہ اس طرح پلٹ جائے گا۔ اب تو ہمیں خدا کے بھروسے پر ہی قدم اٹھانا ہوگا۔"

www.pdfbooksfree.pk

وہ دونوں اُلجھن میں ضرور تھے لیکن فکرمند اور خوف زدہ ہرگز نہیں تھے۔ آخر کو وہ ہماری جری اور جاں باز فوج کے سپاہی تھے، جنہیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا آتا ہے۔

سجاد کہنے لگا۔ "آپ یہ نہ سمجھئے کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ ارے صاحب جس اللہ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے اگر اس کی رضا ہوگی تو ہم اپنی منزل تک بھی پہنچ جائیں گے۔"

مبارک بولا: "صاحب آپ نے سولہ آنے ٹھیک بات بولی ہے۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اُس نے جو ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے وہی ہو کر رہے گا۔ پھر پریشانی کس بات کی؟ اور پھر اللہ نے آپ کا جیسا بلند اقبال آدمی ہماری مدد کے لیے بھیج دیا ہے تو پھر ڈر کس بات کا۔؟"

خدا پر اور اُس کے بعد مجھ پر ان کا اعتماد اور بھروسہ حیرت انگیز حد تک غیر متزلزل تھا۔ دراصل وہ مجھ سے حوصلہ حاصل کر رہے تھے اور میں اُن سے۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ منزل پر پہنچانا اُوپر والے کا کام ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جیپ پھر سٹارٹ کر دی۔ رات جنگل اور تنہائی کے اِس ماحول میں ہماری جیپ کی آواز کے سوا کوئی اور آواز نہ تھی۔ حد تو یہ ہے کہ جنگلی جانور بھی خاموش دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں نے سکوت توڑنے کے لیے بات چیت کرنے کی ٹھانی: "سجاد۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"ابھی تو میں خود بچہ ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔ "میری ابھی شادی نہیں ہوئی ورنہ اماں کا بس چلتا تو وہ چھ سال پہلے ہی مجھے دو چار بچوں کا ابّو بنا دیتیں۔"

"تم نے اپنی ماں کی آرزو کیوں نہیں پوری کی؟"

"وہ شوخی سے بولا: "ارے صاحب۔ آدمی یا تو سپاہی بن جائے یا شوہر؟ یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ جس کو ایک پل کے لیے زندگی کا بھروسہ نہ ہو وہ دوسروں کی زندگی کیوں خراب کرے؟"

مبارک سے خاموش نہ رہا گیا۔ بولا: "معاف کرنا صاحب۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ پر اتنا جانتا ہوں کہ موت برحق ہے۔ گھر میں بستر پر بھی آسکتی ہے اور جنگ کے میدان میں بھی۔ جس کی جتنی لکھی ہے وہ اسے گزارنی ہے۔ میرے گاؤں میں سو سو برس کے بوڑھے موجود ہیں جن کی ساری عمر فوج میں گزری ہے۔ جنگوں میں بھی گئے۔ زخمی بھی ہوئے مگر ابھی تک زندہ ہیں۔ گھر بار، پوتا، نواسہ، سبھی ہیں۔ ان کے لیے اللہ نے گولی گولی نہیں بنائی تھی اس لیے بچ گئے۔ اِسی گاؤں کے کئی سوہنے جوان چٹ پٹ مر گئے۔"

"کیسے؟" میں نے سوال کیا۔

"کوئی گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ کوئی نہر میں ڈوب گیا۔ کسی کو سانپ نے کاٹ لیا۔ میرا ایک دوست تھا۔ اچھا بھلا، جوان، خوبصورت۔ زمیندارہ کرتا تھا۔ کوئی فکر نہ فاقہ۔ مزے کرتا تھا۔ جس دن شادی ہونے والی تھی رات کو ہیضہ ہو گیا۔ دوسرے دن مر گیا۔ تو سر، زندگی اور موت کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے؟"

میں اِس کے فلسفے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ سجاد سے مخاطب ہوا: "صاحب چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، پر میں یہی کہوں گا کہ اگر اللہ زندگی دے اور خیر خیریت سے گھر واپس جاؤ تو اپنا گھر بسا لو۔" پھر وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا: "سر۔ کیا بات ہے اپنے گھر بار کی۔ انسان کے بیوی بچے نہ ہوں تو وہ کس کے لیے زندہ رہے؟ مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ جنازہ بھی جائز نہیں ہوتا کنواروں کا۔"

میں اور سجاد دونوں ہنس پڑے۔ مبارک اَن پڑھ اور اُجڈ سپاہی سہی مگر بات پتے کی کہی تھی اُس نے۔

میں نے سجاد کو چھیڑا: "کیوں، کوئی لڑکی وڑکی دیکھ رکھی ہے ماں نے؟ یا تم نے کوئی آنکھ مٹکا کر رکھا ہے؟"

سجاد خاموشی سے مسکراتا رہا۔ بڑی جھینپی جھینپی سی ہنسی تھی اِس کی۔ میں نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کون ہے یار؟ ہمیں نہیں بتاؤ گے؟"

"میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ ہم بچپن سے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہم دونوں نے عہد کیا ہے کہ اگر شادی کریں گے تو ایک دوسرے کے ساتھ ورنہ زندگی بھر کنوارے بیٹھے رہیں گے۔"

مبارک کہنے لگا: "بلی آپ ہی آپ تھیلے سے باہر نکل آئی۔ میری مانو تو کنوارے بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ کیوں ظلم کرتے ہو اس غریب کے ساتھ۔ اور خود اپنے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" سجاد اس موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا: "مبارک۔ تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"شادی؟ ارے صاحب میری تو بڑی بیٹی دو چار سال بعد شادی کے قابل ہو جائے گی۔"

سجاد نے اُسے غور سے دیکھا اور بولا۔ "اتنی بڑی عمر تو نہیں لگتی تمہاری۔"

"عمر بڑی نہیں ہے سر۔ چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تھی۔ چھ بچے ہیں میرے۔ دو لڑکیاں، چار لڑکے۔"

"تمہیں محبت نہیں ہے اُن سے؟" سجاد نے سوال کیا۔

اُس نے سرد آہ بھری۔ "محبت؟!! سر میرا بس چلے تو جان قربان کر دوں ان پر۔"

"یاد نہیں آتے تمہیں؟"

"اِن ہی کی یاد کے اور اللہ کے سہارے تو زندگی کٹ رہی ہے سر۔" وہ زور سے ہنسا مگر پھر اچانک چپ ہو گیا۔ میں اور سجاد بھی اُداس ہو گئے۔ واقعی۔ کیا گزرتی ہو گی مبارک کے دل پر اور اُس کے بیوی بچے اس کے بغیر کیوں کر دن کاٹتے ہوں گے؟"

اُداسی کی چادر نے ہم تینوں کو وقتی طور پر اپنے اندر لپیٹ لیا۔ تینوں ہی اپنے اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کی یادوں میں کھو گئے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ جیپ کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ ہم جس جگہ سے گزرتے ہمارے پیچھے گرد و غبار کا ایک بگولا آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا نظر آیا۔ کبھی کبھی جیپ زور زور سے اُچھلتی اور ہچکولے کھانے لگتی۔ راستے میں گڑھے، چھوٹے چھوٹے نالے اور بنجر کھیت بھی ملے مگر میں نے رفتار کم نہیں کی۔ صرف ایک ہی دُھن سوار تھی کہ کسی طرح جلد سے جلد اپنے وطن کی سرحد کے اندر پہنچ جائیں۔

یکایک مبارک کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے ایک لمحہ تامل کیا۔ پھر بولا: "سر۔ آپ کوئی آواز سن رہے ہیں؟"

مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی مگر جب کان لگا کر سنا تو ایک عجیب سی گونج محسوس ہوئی۔ میں نے جیپ کی رفتار ہلکی کر دی۔ آواز بہت دور تھی مگر بھنبھناہٹ تھی ضرور۔

سجاد بھی غور سے سن رہا تھا۔ یکایک بولا: "کوئی آواز ضرور ہے۔ پر کس چیز کی؟ یہ پتہ نہیں چلتا۔"

پُراسرار آواز کی سمت اور ذریعہ جاننے کے لیے میں نے جیپ کو قریبی قد آور درختوں تلے روک دیا۔ بھنبھناہٹ کی آواز بڑھتی جا رہی تھی ——— مبارک جو بہت توجہ سے کان لگائے سن رہا تھا یکایک چیخ اُٹھا: "سر۔ یہ تو ہیلی کاپٹر کی آواز ہے۔"

ہم تینوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ آواز بڑھتی جا رہی تھی اور ہمارے قریب آ رہی تھی۔ اَب واضح طور پر میں ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی پھڑ پھڑاہٹ سن سکتا تھا۔ "واقعی۔" میں نے کہا: "یہ تو ہیلی کاپٹر ہے!"

ہم تینوں نے مشین گنیں سنبھال لیں اور آنے والے واقعات کے انتظار میں سانس روک کر بیٹھ گئے۔

آسمان پر بائیں جانب سے آواز اور پھر روشنی کا ایک دھبا ہماری طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اَب اُس کے خدوخال اور آواز بالکل واضح ہو گئی تھی۔ یہ ایک فوجی ہیلی کاپٹر تھا جو پرواز کرتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔

مجھے مبارک کی سرگوشی سنائی دی: "سر۔ زیادہ اُونچائی پر نہیں ہے۔ لگاؤں نشانہ؟"

"نہیں۔ پہلے حالات کا جائزہ لو اور ہدایات کا انتظار کرو۔"

ہیلی کاپٹر اَب ہمارے سروں کے نزدیک آ گیا تھا۔ ہماری جیپ درختوں کے جھنڈ تلے تھی۔ اگرچہ ہیلی کاپٹر کی بلندی زیادہ نہ تھی مگر پھر بھی درختوں اور تاریکی نے ہمیں ایک محفوظ کور فراہم کر دیا تھا۔ ہماری مشین گنوں کے رُخ ہیلی کاپٹر کی جانب اور اُنگلیاں لبلبی پر تھیں۔

"گولی نہ چلانا۔" میں نے ہدایت دی: "ہو سکتا ہے آس پاس دوسرے فوجی بھی موجود ہوں۔ فائرنگ کی آواز سن کر چوکنا ہو جائیں گے۔"

ہیلی کاپٹر ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔ اس کا رُخ ہیڈ کوارٹر کی طرف تھا۔ ہم تینوں اِس نئی صورتِ حال سے سوچ میں پڑ گئے۔ سجاد بولا۔

www.pdfbooksfree.pk

"میں تو کہتا ہوں اللہ کا نام لے کر اُڑا دو۔" یہ کہہ کر اُس نے مشین گن کی نالی ہیلی کاپٹر کی اُٹھائی مگر اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا اس کا ہاتھ خود بخود ساکت ہو کر رہ گیا۔ جس جانب سے ہیلی کاپٹر نمودار ہُوا تھا اسی طرف سے بھنبھناہٹ کی مزید آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ چند ہی لمحے بعد ہیلی کاپٹر ہمارے نزدیک آ گئے۔ یہ تعداد میں چار تھے اور دو دو ایک ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ یکایک جنگل میں سُرخ روشنی پھیل گئی۔ یہ روشنی درمیان والے ہیلی کاپٹر سے پھینکی گئی تھی۔ شاید وہ لوگ روشنی کے بموں کے ذریعے جنگل میں موجود ہر چیز کو دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ ہمارے لیے پریشان کُن بات تھی اور خطرناک بھی ہو سکتی تھی مگر غالباً وہ ہمیں اور ہماری جیپ کو نہ دیکھ سکے۔ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئی مگر ہمارے جذبات میں تلاطم اور لرزش پیدا کر گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" مبارک بولا۔

سجّاد نے کہا "معلوم ہوتا ہے اُنہیں ہیڈ کوارٹر کی تباہی کا علم ہو چکا ہے یا پھر وہ معمول کے حفاظتی مشن پر ہیں۔"

"اُنہیں ہیڈ کوارٹر کی تباہی کا علم نہ بھی ہو گا تو اب ہو جائے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "فی الحال ہمارے لیے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہ ہم اس علاقے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اس لیے صرف ایک ہی راستہ ہے ہمارے سامنے۔"

"وہ کیا؟" وہ دونوں ہم آواز ہو کر بولے۔

"ہمیں واپس بستی میں چلنا چاہیئے۔ وہاں ہمیں وقتی طور پر پناہ مل سکتی ہے اور مزید معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"موت کے مُنہ میں پھر واپس جاؤ گے؟" سجّاد تیز آواز میں بولا۔

"اِس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ہم جیپ لے کر بھاگیں گے تو وہ اُوپر سے دیکھ لیں گے۔ اِن کی نظروں میں آ گئے تو ہم کتنی دُور اُن سے بھاگ سکتے ہیں؟ اگر اسی کھلی اور غیر محفوظ جگہ کھڑے رہے تو وہ دوبارہ واپس آئیں گے۔ اور ہمیں بھُون کر رکھ دیں گے۔ یہاں چھُپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور پھر یہ مت بھُولو کہ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان بھی نہیں ہے۔ کھُلے آسمان کے نیچے کب تک اِن کی عقابی نظروں سے بچے رہیں گے؟ اور اگر درختوں کے ذخیرے میں چھُپ بھی گئے تو بھُوکے پیاسے مر جائیں گے۔ ہمیں بلا تاخیر واپس چلنا چاہیئے۔"

اِن دونوں نے میری رائے سے اتّفاق کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ میں نے فوراً جیپ کو ریورس کیا اور پوری رفتار سے اُس راستے پر دوڑا دیا جس سے ہم گزر کر آئے تھے۔ واپسی کے سفر میں ہم تینوں بالکل خاموش، اپنی سوچوں اور تفکّرات میں گُم تھے۔ خدا جانے کتنی دیر ہم سفر کرتے رہے۔ مگر یوں لگا جیسے واپسی میں ہم نے راستہ جلدی طے کر لیا۔ سامنے بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ہر چیز اُسی حالت میں تھی جس میں ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ فوجی جیپیں کھُلے میدان میں کھڑی تھیں۔ ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اُن جیپوں سے ذرا ہٹ کر اپنی جیپ کھڑی کر دی اور کُود کر بستی کی طرف بھاگا۔ جاتے جاتے سجّاد اور مُبارک کو ہدایت کر گیا کہ وہ بدستور جیپ میں بیٹھے رہیں جب تک کہ میں واپس آ کر اُنہیں نہ بلاؤں یا اُنہیں بستی میں آنے کا اشارہ کروں۔

میں تیزی سے شیلا کی جھونپڑی کی طرف بڑھا۔ دروازے کی کُنڈی بدستور لگی ہوئی تھی۔ دروازے کے پٹ کھول کر اندر دیکھا تو منظر وہی تھا جو میں پہلے دیکھ چُکا تھا۔ شیلا رسیّوں سے بندھی نیم دراز تھی۔ کچھ فاصلے پر اُس کا شوہر پڑا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہے کہ وہ ابھی مدہوش تھا۔ دروازہ کھُلنے کی آواز پر شیلا نے گھبرا کر دیکھا مگر پھر کسی اور کی بجائے مجھے کھُلے دروازے میں کھڑا پایا تو اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نمودار ہُوئے۔ میں لپک کر اُس کی طرف گیا۔ "کیا بات ہے؟" وہ میرے پریشان چہرے کو دیکھ کر بولی۔ "لوٹ کر کیوں آ گئے؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اُسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ "اِن لوگوں کو ہیڈ کوارٹر پہنچ کر سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور پھر وہ ہماری تلاش میں سارا جنگل چھان ماریں گے۔ ہو سکتا ہے وہ مزید فوجی امداد بھی بلا لیں۔"

شیلا ایک دم گھبرا گئی۔ "اب کیا ہو گا بھیّا؟"

"اللہ مالک ہے۔" میں نے یہ فقرہ اُس سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلّی دینے کے لیے کہا تھا۔ "اچھا سنو۔ آس پاس کوئی چھُپنے کی جگہ ہے؟ کوئی پرانی عمارت جس میں تہہ خانہ ہو؟ یا کوئی غار وغیرہ؟"

www.pdfbooksfree.pk

"ایسی تو کوئی جگہ نہیں ہے۔" وہ فکرمند ہو کر بولی: "اور پھر دن نکلنے تک تو ساری لبستی جاگ جائے گی۔ فوجی سپاہی بھی ہوش میں آ جائیں گے۔ اتنے بہت سے لوگوں سے کیسے بچو گے؟"

واقعی اس کی بات معقول تھی۔ واپس لبستی کا رُخ کرتے وقت مَیں نے یہ پہلو نظر انداز کر دیئے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" مَیں نے بلند آواز سے کہا: "ہمارا یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ خود ہمارے لیے بھی اور تیرے لیے بھی۔" یہ کہہ کر مَیں تیزی سے پلٹا۔

"کہاں جاؤ گے؟" اُس نے مجھے پکارا۔

اِس سوال کا جواب تو خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔ شیلا نے مجھے مزید پریشانی میں ڈال دیا تھا: "یہ جنگل کتنا گھنا ہے؟ اس میں ہم لوگ چھپ سکتے ہیں؟" مَیں نے رُک کر سوال کیا۔

"سامنے والا جنگل تو بہت گھنا ہے۔" وہ بولی: "پر وہ جب ڈھونڈنے آئیں گے تو بہت سارے فوجی ساتھ لائیں گے۔ مَیں نے تو سُنا ہے کہ وہ شکاری کتے بھی لے کر آتے ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔"

میرا ذہن قریب قریب ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرے پاس مہلت زیادہ نہیں ہے۔ ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اُنہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ شیلا کا یہ خیال بھی غلط نہ تھا کہ وہ فوری طور پر مزید کُمک منگائیں گے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تباہی پھیلانے والے زیادہ دُور نہیں جا سکتے۔ وہ سرحدوں کی اور زیادہ مضبوطی سے ناکہ بندی کر دیں گے اور علاقے کا چپہ چپہ چھان ماریں گے۔ تباہی اور ناکامی کی جھنجھلاہٹ انہیں چین نہ لینے دے گی جب تک کہ وہ اپنے مطلوبہ مجرموں کو کھوج نہ لیں۔

"شیلا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ مَیں کہاں جاؤں گا۔ کیا کروں گا؟ مگر یہاں رُکنا بھی مناسب نہیں ہے۔ مَیں اپنے ساتھ تمہاری زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" یہ کہہ کر مَیں جانے کے لیے مڑا۔

"بھیا۔" اُس نے مجھے پکارا: "میرے ہاتھ پیر کھول دو۔ مَیں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"کہاں؟" مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"جہاں تم جاؤ گے۔"

"پگلی میری زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"

"جیون مَرن تمہارے ساتھ ہو تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی؟ بھگوان کرے میری عمر بھی تمہیں لگ جائے۔ مَیں اپنی جان وار کر تمہیں بچا لوں گی۔"

مَیں اس کی سادگی اور بے لوث پیار پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اُس پر اس قدر پیار آیا کہ مَیں دوبارہ اس کے پاس پہنچ کر دوزانو بیٹھ گیا۔ مَیں نے اِس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومے۔ اُنہیں آنکھوں سے لگایا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ یوں لگا جیسے بس یہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی انجام زلیست۔ چاہے جو آفت آئے، قیامت آئے مگر مجھے بہن کی محبت کے سائے تلے بیٹھ جانا چاہیئے۔ اگر موت آئے گی تو ہم دونوں کو ساتھ ہی آئے گی۔ شیلا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے: "سارے جیون میں ایک بھائی ملا۔ وہ بھی اتنی تھوڑی دیر کے لیے اور پھر میرا اور میرے دلیس کا دُشمن۔ میرے دلیس والے اس کے خون کے پیاسے۔ ہائے بھگوان۔ یہ کیا انوکھا رشتہ بنایا ہے تو نے!" وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ بخُدا۔ اُس وقت میرے جذبات نے مجھے بالکل اندھا کر دیا۔ جی چاہا زندگی کے جتنے بھی لمحات باقی ہیں وہ اس مُنہ بولی بہن کے محبت بھرے سائے میں گزار دوں۔ موت آئے بھی تو اسی کے آنچل کی چھاؤں میں۔ میرا دل بھر آیا۔ شیلا کے لیے میرے دِل میں پیار نے اس شدت سے زور مارا کہ اگر میری سگی بہن بھی ہوتی تو شاید اس موقعے پر میرے جذبات اِس سے زیادہ شدید نہ ہوتے۔ مَیں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "شیلا۔ میری بہن۔ تو مجھے اچانک اِس طرح کیوں مل گئی۔ تُو نے میرے وطن سے دُور کیوں جنم لیا؟ تیرا دلیس، تیرا مذہب مجھ سے الگ کیوں ہے؟ ہم کیسے بھائی بہن ہیں کہ چاروں طرف سے دُشمن کے خونی سمندر میں گھیرے ہوئے ہیں۔ نہ تیرے پاس رہ سکتا ہوں۔ نہ تجھے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ نہ تُو مجھے اپنے دامن میں پناہ دے سکتی ہے، نہ مَیں تیری جان بچا سکتا ہوں۔"

شیلا خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایسی ممتا، ایسا پیار تھا کہ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مَیں نے بے اختیار اس کو لپٹا لیا۔ یوں لگا جیسے مَیں اپنی ماں کی آغوش میں ہوں۔ ماں کی آغوش کی گرمی تو مجھے یاد نہیں تھی مگر دل نے کہا کہ وہ بھی اِس سے مختلف نہیں ہو گی۔

یکایک باہر سے جیپ کے ہلکے ہارن کی آواز آئی اور مَیں چونک پڑا۔ ایسا محسوس ہُوا جیسے خواب سے بیدار ہو گیا ہوں۔ شیلا کے پاس آ کر مَیں یہ بھی بھول گیا تھا کہ باہر میرے دو اور ہم وطن فوجی میرے منتظر ہیں اور مجھے صرف اپنی ہی نہیں، اُن کی زندگی کی بھی فکر کرنی ہے۔ پھر مجھے مادرِ وطن کا خیال آیا جس نے مجھے گود میں کھلا کر پرورش کر کے اتنا بڑا کیا تھا۔ جس کا پیار میرے اور اپنے سارے بیٹوں کے لیے بے کراں تھا، لازوال تھا۔ اِس کی مٹی سے میرا رشتہ خون کے تمام دوسرے رشتوں سے بالاتر تھا۔

مَیں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ شیلا کے سر کو تھپکا اور کھڑا ہو گیا۔ شیلا نے بھی غالباً میرے دِل و دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات کو بھانپ لیا تھا۔ ہمارے درمیان محبت کے رشتے بہت گہرے اور وسیع تھے مگر وہ اور مَیں دونوں جانتے تھے کہ ان کے درمیان ایک سرحد بھی ہے۔ جسے عبور کرنا ہم دونوں کے لیے ناممکن ہے۔ وہ خاموشی سے، آنسو بھری نگاہوں کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں اس کے ہونٹوں نے حرکت کی: "جاؤ بھیا۔ بھگوان تمہاری سہائتا کرے۔"

مَیں قریب قریب بھاگتا ہُوا اِس کی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اِس کے پاس ٹھہروں گا تو ڈانواڈول ہو جاؤں گا۔ کشمکش میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ فیصلے اور عمل کی قوت سے محروم ہو جاؤں گا، اس لیے شیلا پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر مَیں اس کی جھونپڑی سے باہر نکل گیا مگر باہر نکل کر دروازے کی کُنڈی بند کرنا نہ بھُولا۔ جھونپڑی کے باہر بالکل خاموشی تھی۔ ایک لمحہ رُک کر مَیں نے آہٹ لینے کی کوشش کی۔ خاموشی کی آواز کے سوا کوئی دوسری صدا نہ تھی۔ سوچنے کی صلاحیت پہلے ہی سلب ہو چکی تھی۔ مَیں ایک کھوئے ہوئے انسان کی طرح تاریکی میں کھڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن سلیٹ کی طرح بالکل صاف تھا۔ انسان بھی عقل و شعور سے بہرہ مند ہونے کے باوجود بعض اوقات کتنا بے بس اور بے عقل ہو جاتا ہے۔ عقل و شعور اور دانش بھی ایک خاص منزل تک ہی ساتھ دیتے ہیں۔ شاید دیوانگی اسی کو کہتے ہیں!؟

مَیں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ یکایک تاریکی سے ایک سایہ نمودار ہُوا اور دوسرے لمحے مَیں اس کی گرفت میں تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ مَیں سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یک دم لوٹ آئی تھی۔ اِس سے پہلے کہ مَیں اپنی مدافعت میں کوئی حرکت کرتا ایک نرم آواز میرے کانوں کے پاس سنائی دی: "رامو تُو کتنا جھُوٹا ہے۔ اتنی دیر ہو گئی آیا کیوں نہیں؟"

اتنی دیر میں مجھے احساس ہو چکا تھا کہ آنے والا سایہ ایک عورت کا تھا۔ مَیں نے اُسے ہٹانا چاہا مگر نرم و ملائم ہونے کے باوجود اس کی گرفت میں بہت مضبوطی تھی۔

"ڈرتا کیوں ہے؟ اُدھر تو سب دارو کے نشے میں اُلٹے پڑے ہیں۔ مَیں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ چل اب مجھے موٹر میں سیر کرا۔"

یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ مجھے محافظ فوجیوں میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے لیے فوجی وردی میں ایک نرالی کشش ہوتی ہے۔ یہ مختصر رومانس پچھلے چند گھنٹوں کے دوران ہی چڑھا ہو گا: "ارے بولتا کیوں نہیں؟" اُس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"تو سوئی نہیں ابھی تک؟" مجھے اس کے سوا کوئی بات نہیں سُوجھی۔

"تُو نے مِلنے کا وعدہ کیا تھا سوتی کیسے؟ جسونت تو اتنا غصیل ہو گیا پر بڑھیا کسی طرح سونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بڑی ہوشیار نیند ہے اس کی۔ جب بھی مَیں بستر سے اُٹھتی وہ آواز مار دیتی۔ کون ہے؟ کہاں چلی ہے؟" مَیں بھلا پانی پینے کا بہانہ کب تک کرتی۔ بس اسے افیم کی ایک اور گولی دے کر آئی ہوں۔ اچھا۔ اب دیر نہ کر۔ کیا یہیں باتیں کرتے ہُوئے سویرا کر دے گا؟" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی مگر میرا بازو ابھی تک اُس کی گرفت میں تھا۔ ایک جھٹکے سے اُس نے مجھے بھی کھینچ کر اُٹھا لیا۔ وہ ایک صحت مند اور قدآور عورت تھی۔ مَیں تاریکی میں اس کا چہرہ ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی وہ میرا چہرہ دیکھ سکی۔ ورنہ مجھے پہچان لیتی۔ مجھے خاموش اور پس و پیش میں دیکھا تو تیز آواز میں کہنے لگی: "رامو۔ تُم نے دارو تو نہیں پی لی۔ تُو نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے مُنہ بھی نہیں لگائے گا۔"

"نہیں نہیں۔" مَیں اِس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"جھُوٹے، ذرا اپنا مُنہ تو سُونگھا۔" اُس نے ایک جھٹکے سے میرا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ یہ حرکت اتنی خلافِ توقع تھی کہ میرے سنبھلنے سے

www.pdfbooksfree.pk

پہلے وہ اور میں ایک دوسرے کے رُوبرُو کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ تیکھے نقوش کی ایک خوش شکل عورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بھی میرا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ ایک ثانیے کے لیے اس نے اپنی بڑی بڑی چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر اس طرح سمٹ کر پیچھے ہٹی جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا۔

"تم راموتو نہیں ہو۔ کون ہو تم؟" وہ غصیلی مگر دبی آواز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اس کی آنکھوں میں شک و شبہ کی ایک برق سی لہرائی اور وہ چلاّ کر بولی "پہچان گئی۔ تم۔ تم قیدی ہو۔ میں نے دن کے وقت تمہیں دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مجھ سے دُور ہو گئی اور پھر اُس جھونپڑی کی طرف بھاگی جہاں مجھے قید رکھا گیا تھا مگر میں تو خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چند لمبے لمبے ڈگ بھر کر میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی تھی۔ میں نے اِسے پکڑنا چاہا تو وہ چیخ کر بولی "مجھے مت چھونا میں شور مچا کر سب کو بُلا لوں گی۔"

بستی والے بے ہوش اور نشے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کی چیخ کون سُنتا۔ پھر بھی میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مگر اُس نے بے تحاشا چیخنا چلاّنا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ اُس کے مُنہ پر جما کر میں نے اسے بے قابو کرنے کی کوشش کی۔

اُس نے پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے پھر بھی اُس کا میرا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز سُن کر مبارک اور سجاد بھاگے ہوئے آئے۔ مجھے ایک عورت کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے دیکھا تو ان کے قدم وہیں رُک گئے۔

"سر!" مبارک نے حیرت اور بے اعتباری سے مجھے دیکھا۔

"پکڑو اِسے۔" میں نے اُسے حکم دیا۔ "نہ جانے کہاں سے نکل کر آ گئی ہے۔ ہمارے لیے کوئی نئی مُصیبت نہ کھڑی کر دے۔"

مُبارک نے آگے بڑھ کر عورت کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ بے اختیار ٹھوکریں اور لاتیں مار رہی تھی۔ میں نے اس کے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھایا تو اُس نے مبارک کے ہاتھوں پر دانت گاڑ دیئے۔ ضبط کے باوجود اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ عورت کی جدوجہد تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اَب وہ اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔

مُبارک تکلیف سے مُنہ بنائے اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ سجاد کے مُنہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ واقعی صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی۔ ایک عورت ہم دو مَردوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر میں نے اُس کی گردن پر کراٹے کی ایک ضرب لگائی اور وہ ایک دم بے جان ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

"سر۔ یہ مصیبت کون ہے۔ کہاں سے آ گئی۔" مُبارک نے مجھ سے پُوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے جھلاّ کر کہا۔ "اس کے بارے میں میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم جانتے ہو۔ اَب اسے گھسیٹ کر کسی جھونپڑی کے سامنے ڈال دو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

مُبارک نے مستعدی سے میری ہدایت پر عمل کیا اور بے ہوش عورت کو ایک قریبی جھونپڑی کے دروازے پر ڈال دیا۔

"شیلا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" میں نے اُنہیں بتایا۔ "اور خود اُس کے لیے بھی ہمارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔"

"لیکن سر۔ آس پاس جنگلوں میں کوئی چُھپنے کی جگہ تو ہو گی؟" مبارک نے پُوچھا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور پھر ہم قریبی جنگلوں میں کب تک پوشیدہ رہ سکتے ہیں؟" میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "دشمن زخمی سانپ کی طرح اِنتقام لینے کے لیے بیتاب ہے۔ وہ اِس علاقے کا ایک ایک کونا چھان ماریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے رُخصت ہو جائیں۔"

"مگر جائیں گے کہاں؟" سجاد نے تشویشناک لہجے میں پُوچھا۔

"خدا بہتر جانتا ہے۔ اگر زندگی ہوئی تو بچ جائیں گے ورنہ اس سے پہلے بھی تو ہم موت کے دہانے پر ہی کھڑے تھے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں سر۔" مبارک فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "جس خدا نے ہمیں اُن شیطانوں سے بچایا ہے آگے اسے ہماری زندگی منظور ہوئی تو پھر بچالے گا ورنہ مرنا تو برحق ہے۔ مگر سر۔ خدا کی قسم۔ اپنے ساتھ کئی سو کو لے کر مریں گے۔"

"اچھا۔ چلو۔ اَب وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے حتی الامکان بہت دُور پہنچ جانا چاہیئے۔"

ہم تیزی سے جیپ کی طرف لپکے۔ سجاد پُوچھنے لگا "ایک جیپ اور لے چلیں؟"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

وہ بولا۔ "اتنی بہت سی جیپیں یہاں بیکار کھڑی ہیں۔ اور پھر ہو سکتا ہے ہمیں دوسری جیپ کی بھی ضرورت پڑے۔"

"دیکھو سجاد۔ ہم لوگوں کا یکجا رہنا ضروری ہے۔ علیحدہ علیحدہ ہو کر ہم کسی اَن جانی مُصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ جب جینا مرنا ساتھ ہی ہے تو پھر دو گاڑیوں میں سفر کرنے کی کیا تُک ہے؟"

"سر۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں مگر ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟" مبارک نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں ہاں۔ کہو۔"

"سر۔ ہم نے اس جیپ میں بہت لمبا سفر کر لیا ہے۔ پٹرول کم ہو گیا ہو گا۔ اگر ہم دوسری جیپ لے لیں تو ٹھیک نہ ہو گا؟"

"بھئی مبارک۔ تمہیں بہت اچھی موجھی ہے۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری جیپوں میں اگر پٹرول کے فالتو بھرے ہوئے ڈبے موجود ہوں تو ہمیں وہ بھی ساتھ رکھ لینے چاہئیں۔"

تجویز معقول تھی۔ چنانچہ ہم نے فوراً اپنی مشین گنیں اور گولیوں کا ذخیرہ دوسری جیپ میں مُنتقل کر دیا۔ مبارک اور سجاد نے تلاش کر کے پٹرول سے بھرے ہوئے دو ڈبے بھی برآمد کر لیے۔ مبارک کا خیال تھا کہ ہمیں کھانے پینے کا کچھ سامان بھی ساتھ رکھ لینا چاہیئے مگر کھانا تو اس وقت دستیاب ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ پانی رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی بوتل یا تھرمس وغیرہ نہیں تھا۔ کسی جھونپڑی کے اندر جا کر کھانا یا پانی کے لیے برتن تلاش کرنا عقلمندی سے بعید تھا۔ ہم کسی مشکل میں پھنس سکتے تھے اور پھر ایک ایک منٹ ہمارے لیے قیمتی تھا۔

جب ہم اپنی نئی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہونے لگے تو میرا دِل بے اختیار شیلا سے ایک بار پھر مُلاقات کرنے کو چاہا۔ بلکہ سچ تو ہے کہ اُسے اپنے پیچھے چھوڑنا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا۔ کتنی خواہش تھی کہ یا تو اُسے اپنے ساتھ لے چلوں یا پھر خود اس کے پاس ہی رہ جاؤں مگر ان دونوں میں سے کوئی بات ممکن نہ تھی۔ میری چھٹی حس مجھے اس کے بارے میں متفکر کر رہی تھی۔ مجبوراً صبر کا پتھر سینے پر رکھا اور جیپ سٹارٹ کر دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا سگی اور ماں جائی بہن کے لیے بھی بھائیوں کے دِل میں ویسی ہی محبت اور کسک پیدا ہوتی ہے، جیسی میں اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کلیجہ مَسل کر پھینک دیا ہو۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اِس کے سوا کوئی دُوسرا چارہ کار نہ تھا۔ "خدایا۔" میں سوچنے لگا۔ "اگر تو انسانوں کے دِلوں میں پیار کا ایسا لازوال جذبہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو پھر اُن کو اتنا بے بس کیوں کر دیتا ہے کہ وہ اپنوں سے بچھڑ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟!"

جیپ نے سٹارٹ ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ ہمارے سامنے نہ کوئی راستہ تھا، نہ کوئی منزل۔ مگر پھر بھی ہمیں اَن جانے راستوں اور اَن دیکھی منزل کی طرف گامزن ہونا تھا۔ ابھی ہم بستی سے زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ مبارک نے یکایک کان لگا کر غور سے کچھ سُننے کی کوشش کی اور پھر اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔

"سر۔ ذرا سُنیے۔"

میں اور سجاد دونوں سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ "سر۔ درختوں کے پیچھے جیپ روک دیجئے۔" مبارک بولا۔ میں نے جیپ درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے روک دی۔

"تمہارے تو خواہ مخواہ کان بجتے ہیں۔" سجاد جھلا کر مبارک سے مخاطب ہوا مگر میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ واقعی مبارک کا کہنا صحیح تھا۔ ایک بھنبھناہٹ کی آواز بہت فاصلے سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے مکھی بھن بھن کر رہی ہو۔ میں نے چوکنا

www.pdfbooksfree.pk

ہو کر اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ اب سجاد نے بھی شاید آواز سُن لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔

"یہ تو ہیلی کاپٹر ہے۔" مَیں نے کہا۔

"اور اِسی طرف آ رہا ہے۔" سجاد بولا۔

"سر۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" مبارک نے پُوچھا۔

"یہ وہی ہیلی کاپٹر ہیں جو ہمیں ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔" مَیں نے خیال ظاہر کیا۔ "ہیڈ کوارٹر کے علاوہ دوسری جگہ یہی ہو سکتی ہے جہاں اُن لوگوں نے اپنے قیدی اور فوجی محافظ مُنتقل کر دیئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے بستی کی طرف آئیں گے۔"

مُبارک فوراً مشین گن اُٹھا کر اٹین شن ہو گیا۔ "بس تو جی۔ مارنے مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔"

مشین گن مَیں نے اور سجاد نے بھی سنبھال لی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہمیں بستی کے نزدیک رہ کر ہیلی کاپٹر میں سوار دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیئے یا جنگل میں دُور نکل جانا چاہیئے۔ ذہن فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا مگر فیصلہ خود بخود ہو گیا۔ اس لیے کہ ہیلی کاپٹر کی آواز نہایت تیزی سے ہمارے نزدیک آ رہی تھی اور بھاگ کر کہیں دُور جانے کی مہلت نہ تھی۔ مَیں نے جیپ کو درختوں کے ذخیرے میں اور آگے لیجا کر روک دیا۔ اب ہمارے اور بستی کے درمیان بہت سے درختوں کی شاخیں اور تنے حائل تھے۔ ہم بستی کو صاف طور سے دیکھ سکتے تھے مگر اُس طرف سے کسی کا ہمیں دیکھ لینا قریب قریب ناممکن تھا۔ تاریکی اور درختوں نے ہمیں ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کر دی تھی۔ اس اثنا میں ہیلی کاپٹر کی آواز بالکل نزدیک آ چکی تھی۔ یہاں تک کہ چند لمحے بعد ہم نے ہیلی کاپٹر کو بھی دیکھ لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود لوگ بہت عجلت میں ہیں اور جلد سے جلد فاصلہ طے کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جب ہم نے بستی کی طرف آتے ہوئے ہیلی کاپٹروں کو ہیڈ کوارٹر کی طرف پرواز کرتے ہُوئے دیکھا تھا تو اُن کی رفتار اتنی تیز نہ تھی۔

پہلے آسمان پر ہیلی کاپٹر کا ہیولا نمودار ہوا اور پھر ہیلی کاپٹر صاف نظر آنے لگا۔ مشین گنوں پر ہم تینوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ بستی کے سامنے کھیت اور کُھلا میدان تھا جو ہیلی کاپٹر کے اُترنے کے لیے نہایت موزوں تھا اور ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے بھی بہت جلد اِس خیال کی تصدیق کر دی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر اُس میدان میں لینڈ کر گیا۔ کچھ دیر پنکھوں کا شور جاری رہا اور تیز ہوا آندھی کی طرح چاروں پھیل گئی۔ اِس ہَوا میں گرد و غبار کی آمیزش بھی تھی۔ ہمیں یوں محسوس ہُوا جیسے یک لخت آندھی اور طوفان نے ہمیں گھیر لیا ہے مگر پھر رفتہ رفتہ اِس میں کمی واقع ہونے لگی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی رفتار کم ہو گئی مگر پنکھے بند نہیں ہُوئے۔ ہم سانس روکے آنے والے واقعات کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک ہیلی کاپٹر میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔ شاید وہ لوگ آس پاس کے ماحول اور حالات کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ پھر ہیلی کاپٹر کا دروازہ کُھلا اور اُس کے اندر سے یکے بعد دیگرے چار مسلح فوجی کُود کر باہر نکلے۔ باہر آتے ہی انہوں نے اپنی برین گنوں کو محتاط انداز سے سامنے تان لیا اور پھر چاروں نے چار مختلف سمتوں کی طرف چہرے کر لیے۔ وہ کسی بھی متوقع حملے کے لیے بالکل تیار تھے۔ اُدھر ہمارے اعصاب بھی تن کر ٹوٹنے کے نزدیک تھے۔ ایک اشارے کی دیر تھی اور ہماری مشین گنیں ان پر گولیوں کی بارش کر دیتیں۔ مبارک اور سجاد نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر مَیں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنہیں فائر کھولنے سے منع کر دیا۔

چاروں فوجیوں نے جب کسی طرف دُشمن کے آثار نہ پائے اور نہ کوئی مزاحمت نظر آئی تو وہ بستی کی طرف رُخ کر کے آگے پیچھے قطار کی شکل میں بستی کی طرف چل پڑے۔ مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ ہیلی کاپٹر میں موجود پائلٹ نے ان کے ہمراہ باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ اتنی دُور سے یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ ہیلی کاپٹر میں اَب اور کتنے فوجی موجود ہوں گے۔ لیکن یہ فور سیٹر ہیلی کاپٹر تھا۔ پائلٹ کے علاوہ اِس میں چار سے زائد افراد کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ پھر بھی محض اندازے کی بنا پر جوش و جذبات سے مغلوب ہو کر جلد بازی میں کوئی قدم اُٹھانا ہمارے حق میں خود کشی کے مترادف ہوتا۔ چاروں فوجی بڑے چوکس ہو کر بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک جھونپڑی کے پاس رُک گئے۔

وہ مکمل حالتِ جنگ میں تھے اور پوری پوزیشن لیے ہوئے تھے۔ وہ جھونپڑی میں موجود امکانی دُشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل مستعد

اور تیار تھے مگر پھر کوئی آہٹ یا مزاحمت نہ پائی تو اُنہوں نے بُلند آواز میں پُکارنا شروع کر دیا۔ "اندر کون ہے باہر آ جاؤ۔"

اندر سے کوئی جواب نہ مِلا تو ایک فوجی نے کرخت لہجے میں پُکار کر کہا۔ "اندر جو کوئی بھی ہے باہر آ جاؤ۔ ورنہ جھونپڑی کو اُڑا کر رکھ دیں گے۔"

اندر پھر بھی خاموشی رہی تو ایک فوجی پھُونک پھُونک قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔

یکایک اِس کے مُنہ سے ایک آواز نکلی اور وہ رُک گیا۔ باقی تینوں فوجی فوراً زمین پر گِر گئے۔ یہ غنیمت ہے کہ اُنہوں نے فائرنگ شروع نہ کر دی۔ سامنے والے فوجی نے جُھک کر دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بُلایا۔ دراصل اس کو وہ بے ہوش عورت زمین پر پڑی ہوئی نظر آ گئی تھی جس سے ہم نے بمشکل جان چھُڑائی تھی۔ فوجیوں نے عورت کے پاس بیٹھ کر اِس کا جائزہ لیا اور پھر حیرانی اور شک و شبہ سے آس پاس نظریں دوڑائیں۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر جھونپڑی کے دروازے پر لگی ہوئی کُنڈی کھول دی اور پھر زور سے ٹھوکر مار کر دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ اندر اُسے مدہوش انسانوں کے سِوا اور کیا نظر آ سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ دو فوجی لپک کر اُس کے پیچھے چلے گئے مگر تیسرا عورت کے پاس ہی کھڑا رہ گیا۔ شاید رات کی تنہائی میں ایک جوان اور صحت مند عورت کو یوں نظر انداز کر کے چلا جانا اُس غریب کیلئے آسان کام نہ تھا۔ اِس لیے وہ اُس کے پاس ہی رُک گیا اور جُھک کر اسے زیادہ غور سے دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

جھونپڑی کے اندر جانے والے تینوں فوجی جلد ہی باہر نکل آئے۔ اُن میں سے ایک نے اشارہ کیا اور وہ سب کے سب آس پاس کی جھونپڑیوں کی طرف چل پڑے۔ مجبوراً چوتھا فوجی بھی بیہوش عورت کے پاس سے اُٹھ کر ایک جھونپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شیلا کی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ کھول کر ایک فوجی اندر داخل ہوا اور پھر چند لمحے بعد وہ دروازے پر دوبارہ نمودار ہوا اور زور زور سے اپنے ساتھیوں کو پُکارنے لگا۔

اُس نے جھونپڑی کے اندر مدہوش فوجیوں اور شیلا کے خاوند کو دیکھ لیا تھا مگر اس کے لیے سب سے زیادہ ہیجان خیز بات غالباً شیلا کی موجودگی تھی جو ہوش میں تھی۔ تینوں فوجی پلٹ کر شیلا کی جھونپڑی کی طرف لپکے اور اندر چلے گئے۔ جھونپڑی میں صرف ایک لالٹین روشن تھی جس کی مدھم روشنی میں میرے لیے اتنے فاصلے سے کچھ دیکھنا ناممکن تھا مگر مَیں قیاس کر سکتا تھا کہ جھونپڑی کے اندر کیا ہو رہا ہوگا؟ انہوں نے شیلا کو رسیوں سے آزاد کر دیا ہوگا اور وہ اُنہیں کوئی من گھڑت کہانی سُنا رہی ہو گی۔

مجھے معلوم تھا کہ شیلا اُن کو کافی دیر تک مصروف رکھے گی۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک وہ اُنہیں باتوں میں لگائے رکھے گی۔ ہم لوگ اُن کی دست بُرد سے محفوظ رہیں گے۔ پھر مدہوش فوجیوں کو ہوش میں لا کر اُن سے احوال سُننا بھی ضروری امر تھا۔ چنانچہ کچھ دیر کے لیے یہ سب لوگ ہماری طرف سے بے خبر ہو کر رہ گئے تھے اور اُن کی توجہ دوسرے امور کی طرف مبذول ہو چُکی تھی۔ شیلا نے ہمیں جو موقعہ فراہم کیا تھا اِس سے فائدہ اٹھانا اَب ہمارا فرض تھا۔ کیونکہ شیلا غالباً اِس حقیقت سے آگاہ نہیں تھی کہ مزید چار اور ہیلی کاپٹر بھی ہماری کھوج میں لگے ہُوئے ہیں جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے اپنے اِن دشمنوں کو دیکھ چُکے تھے۔ کچھ خبر نہ تھی کہ کیا وہ چاروں یا اِن میں سے کوئی ہیلی کاپٹر اس طرف آ جائے۔ اِس صورت میں ہمارے لیے مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ چنانچہ مَیں نے فیصلہ کیا کہ جب تک چاروں فوجی شیلا کی جھونپڑی میں مصروف ہیں ہمیں ضروری کارروائی کرنے سے بالکل گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے ابھی تک ہلکے ہلکے حرکت کر رہے تھے اور پائلٹ نے بھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اسے ہیلی کاپٹر کے اندر ہی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کمربستہ رہنے کا حُکم مِلا ہوگا۔ وقت کی ڈوری مختصر ہوتی جا رہی تھی اور فوری عمل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ مَیں نے مبارک اور سجاد کو جیپ میں بیٹھنے کی ہدایت کی اور بذاتِ خود کود کر دبے پاؤں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ جنگل میں تاریکی کا راج تھا۔ ہیلی کاپٹر بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے اندر بھی کوئی لائٹ روشن نہ تھی۔ کسی ممکنہ حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ روشنی کے ذریعہ دُشمن کو باخبر یا متوجہ کرنے سے باز رہیں۔ یہ امر میرے لیے بہت سود مند ثابت ہُوا۔ مَیں مشین گن تھامے ہُوئے بے آواز مگر تیز قدموں سے ہیلی کاپٹر کے عقب میں بڑھا۔ اِس مشن پر روانہ ہونے سے

www.pdfbooksfree.pk

پہلے میں نے سجاد کو جیپ میں اپنی جگہ آفیسر انچارج مقرر کر دیا تھا اور اسے ہدایت کر دی کہ اگر صورتِ حال خراب ہو جائے تو وہ اپنی صوابدید اور فوری فیصلے سے کام لے۔ مناسب سمجھے تو فائرنگ شروع کر دے ورنہ جیپ لے کر بھاگنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ مجھے بخوبی علم تھا کہ سجاد اور مبارک میں سے کوئی بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ مجھے دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔ پھر بھی میں نے اُنہیں اپنی طرف سے آزاد کر دیا تھا۔

میں ہیلی کاپٹر کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اندر بیٹھے ہوئے پائلٹ کا سر نظر آنے لگا۔ اِس کی نظریں اور تمام تر توجہ سلنے جھونپڑی کی طرف تھی۔ وہ ہمہ تن اپنی نگاہوں کے سامنے پیش آنے والے ڈرامے کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ یہی میرے لیے نادر موقعہ تھا۔ میں احتیاط سے چلتا ہُوا ہیلی کاپٹر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اِردگرد کا جائزہ لیا اور پھر بھونچال کی طرح ہیلی کاپٹر میں داخل ہو گیا۔ پائلٹ اس اچانک اور خلاف توقع حملے سے اتنا بوکھلایا کہ چند لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ مجھے بھلا اس سے اچھا موقعہ کہاں مل سکتا تھا۔ میں ایک ہی جست میں اس کے سر پہ پہنچ گیا۔ اِس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کے واپس لوٹنے سے پہلے میری مشین گن کی خوفناک نالی اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کے چہرے پہ پیدا ہونے والے حیرت کے آثار خوف میں تبدیل ہو گئے۔

"خبردار" میں نے دبی آواز میں اُسے متنبہ کیا۔ "اگر آواز نکالی یا حرکت بھی کی تو تمہارے جسم کی ایک بوٹی بھی سلامت نہیں رہے گی۔"

وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ۔" میں نے ہدایت کی جس کی تعمیل اُس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کر دی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں کوئی اسلحہ نہ تھا۔ پھر میں نے اُس کے سامنے بورڈ کو دیکھا۔ وہاں بھی چیونگم کے ایک پیکٹ کے سوا کوئی اور چیز نظر نہ آئی۔ پھر بھی میں نے آس پاس ہر چیز کو کھنگال ڈالا۔ کوئی خطرناک چیز وہاں نظر نہ آئی۔ اب میں پائلٹ کی طرف متوجہ ہُوا۔

"باقی چار ہیلی کاپٹر کہاں ہیں؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

"اُدھر" وہ سہمی ہُوئی آواز میں بولا۔ "وہ ہیڈ کوارٹر کے پاس ہیں۔" ڈر کے مارے اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"کیا وہ بھی تمہارے پیچھے آئیں گے؟"

"ہمارے کو کھبر نہیں۔ بائی گاڈ۔ اپن نہیں جانتا۔"

میں اِس کی بزدلی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ شاید ہماری اور اُن کی فوج میں سب سے بڑا فرق بُزدلی اور بہادری کا ہی تھا۔ وہ موت کو سامنے پا کر دہل کر رہ گیا تھا۔ جبکہ ہمارے فوجی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے للکارنا جانتے تھے۔

"بائی گارڈ۔ ہمارا بھروسہ کرو۔" وہ گھگھیا کر بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "وائرلیس اُٹھاؤ۔"

اُس نے مشینی انسان کی طرح میرے حکم کی فی الفور تعمیل کی۔

"ہیڈ کوارٹر پر موجود لوگوں کو خبردار کر دو کہ بستی میں سب ٹھیک ہے۔ سب قیدی موجود ہیں اور ہم تلاش کے لیے آگے جا رہے ہیں۔"

اُس نے حرف بحرف میرے احکام کی تعمیل کی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی یہ رپورٹ خاص متاثر کُن تھی جس کسی نے بھی یہ رپورٹ وصول کی تھی اس نے اپنے آفیسر کو پہنچا دی ہو گی اور اُس نے بھی یقین کر لیا ہو گا۔

ہیلی کاپٹر کے دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے دونوں ہاتھ ہلائے۔ مبارک اور سجاد کی نظریں یقیناً اس طرف لگی ہوئی ہوں گی۔ اُنھوں نے جیپ سے باہر نکل کر ہیلی کاپٹر کی طرف لپکنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں کی۔ ہیلی کاپٹر تک پہنچنے کے لیے اُنہوں نے بھی عقبی راستہ ہی استعمال کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہیلی کاپٹر کے اندر موجود تھے۔

"کیا خیال ہے؟" میں نے سجاد سے پُوچھا۔ "ہمیں ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو جانا چاہیئے؟"

"بالکل۔" اُس نے جواب دیا۔ "یہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ نے بہترین چانس دیا ہے۔"

"اللہ بڑا مسبّب الاسباب ہے سر۔" مبارک نے بھی اس کی مزید تصدیق کرنا ضروری جانی۔

"تو پھر دیر کاہے کی ہے؟" اور پھر میں پائلٹ سے مخاطب ہُوا۔ "چلو پارٹنر۔ آج تو اپنے ہیلی کاپٹر کو جیٹ بنا کر دکھا دو۔"

وہ خوف زدہ ہو کر پُوچھنے لگا۔ "ہماری جان تو بچ جانے گی نا سَر؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر شکایت کا موقعہ نہیں دو گے تو شاید بچ جاؤ گے۔"

وہ مستعدی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا اچانک ایک زنانہ چیخ کی آواز گونجی اور ہم سب کی توجہ اس چیخ کی طرف مبذول ہو گئی۔ چیخ کی آواز نمایاں طور پہ شیلا کی جھونپڑی کی طرف سے آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سوچ سکتے یکے بعد دیگرے کچھ اور چیخیں بُلند ہوئیں۔ میں نے بلاتامل ہیلی کاپٹر سے باہر چھلانگ لگا دی

ہیلی کاپٹر

سے چھلانگ لگانے کے بعد وہ کسی احتیاط اور پیش بندی کے بغیر دیوانہ وار جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ مُبارک اور سجاد کو اتنی مُہلت ہی نہ ملی کہ مجھے کہتے یا کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے۔ شیلا کی جھونپڑی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر میرے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سامنے لالٹین کی ہلکی روشنی کے باوجود جھونپڑی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ شیلا کا خاوند بدستور اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیروں کے نزدیک ایک فوجی مدہوشی کے عالم میں دراز تھا۔ شیلا جسے میں رسّی سے باندھ کر چارپائی پر چھوڑ آیا تھا اس وقت بھی چارپائی پر ہی تھی۔ وہ رسّیوں سے آزاد ہو چکی تھی مگر اس کے ساتھ ہی لباس کی قید سے بھی قریب قریب آزاد ہونے والی تھی۔ چاروں فوجیوں میں سے کسی کے ہاتھ میں بھی گن نہیں تھی۔ ایک فوجی کے ہاتھ میں شیلا کی ساڑھی کا آنچل تھا۔ دوسرا اُس کے بازو تھامے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی اور پیروں سے اُنھیں ٹھوکریں لگا رہی تھی۔ باقی دو فوجیوں کے ہاتھوں میں شراب کی بوتلیں تھیں اور وہ اِس گھات میں تھے کہ شیلا کی ٹھوکروں سے بچ کر اسے بے بس کر دیں۔ یکایک شیلا کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ اِس کے مُنہ سے آواز نکلنی بند ہو گئی اور ساتھ ہی آزاد ہونے کی جدوجہد بھی۔ اس کے چہرے پر بیک وقت حیرت، شرم اور خوشی کا تاثر نمودار ہوا۔ آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ شاید اِس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس جذبے کا اظہار کرے۔ اس کے عین سامنے کھڑے ہوئے فوجی نے اُس کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ لیے اور دروازے کی طرف پلٹا۔ ساڑھی کا آنچل ابھی تک اِس کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور ساتھ ہی میری مشین گن سے نکلنے والی گولیاں اِس کے جسم کو چھلنی کر گئیں۔ سناٹے میں فائر کی آواز سے سارا جنگل گونج اُٹھا۔

باقی تینوں فوجیوں کو بھی میں نے سنبھلنے کی مُہلت نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ جان سکتے کہ اُن پر کون سے آفتِ ناگہانی نازل ہو گئی ہے اُن کے خون میں ڈوبے ہوئے بے جان جسم فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اِن چاروں کی ہلاکت کے بعد بھی میں بدستور دروازے کی چوکھٹ کے پاس ہی کھڑا رہا۔ میری سانس مشکل میرے سینے میں سما رہی تھی۔ غصّے اور نفرت کی شدّت نے مجھے قریب قریب دیوانہ کر دیا تھا۔ میں نے ان فوجیوں کو اس لیے ہلاک نہیں کیا تھا کہ وہ میرے دُشمن تھے۔ میری نفرت اور غیض و غضب کا سبب یہ تھا کہ یہ بدبخت اس مُلک کے محافظ تھے۔ مُلک کے ساتھ ساتھ وطن کی بہو بیٹیوں کی آبرو کے بھی رکھوالے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنی ہم وطن عورتوں کی طرف بُری نیّت سے اُٹھنے والی ہر نگاہ کو گولی کا نشانہ بنا دیتے لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ہوس میں ڈوبے ہوئے فوجیوں کو شیلا سے بے حُرمتی کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اب یہ دوسرا موقعہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ ایک فوجی مشن پر تھے۔ ایک خطرناک اور چالاک دُشمن کی کھوج میں تھے جس نے کچھ دیر پہلے ان کے بہت بڑے فوجی مرکز کو راکھ اور اینٹوں کا ڈھیر بنا دیا تھا لیکن بستی میں پہنچ کر حالات کا گہری نظر سے جائزہ لینے اور فوری طور پر مؤثر اقدامات کرنے کی بجائے وہ رنگ رلیوں میں ڈوب گئے تھے۔ یہ کیسے انسان تھے؟ کیا انسان اتنا بھی گر سکتا ہے؟ اور خاص طور پر وہ انسان جس نے مُلک و قوم کے تحفظ کا حلف اُٹھایا ہو اور جس کی زندگی کا مقصد ہی ان کی رکھوالی کرنا ہو! بس چلتا تو میں اِن درندوں کو ایک بار پھر زندگی کی دولت سے مالا مال کرنے کے بعد دوسری بار پھر بھی سزا دیتا۔ کاش یہ میرے اختیار اور قدرت میں ہوتا اور میں اِن بھیڑیوں کو بار بار زندہ کرتا اور بار بار انسانیت کی اِس توہین پر موت کی سزا دیتا۔ لیکن میں ایک بے بس اور خاکی انسان تھا۔ یہ سب کچھ میرے قبضۂ قدرت سے باہر تھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ جو لوگ میری گولیوں کا نشانہ بنے تھے وہ بذاتِ خود ایک ایسے مذہب کے پیرو تھے جو اس بات کا پرچار کرتا ہے کہ ہر شخص کو مرنے کے بعد بار بار جنم لینا پڑتا ہے اور زندگی میں وہ

www.pdfbooksfree.pk

جو کرم (اعمال) کرتا ہے مرنے کے بعد سزا یا جزا کے طور پر اُسے دوسرے جنم میں اِسی مناسبت سے تخلیق کیا جاتا ہے۔ اچھے کرموں والے دوسرے جنم میں بہتر مخلوق کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ گناہ گاروں کو جانور یا دوسری حقیر اور قابلِ نفرت مخلوق کی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے مگر یہ لوگ اپنے مذہب کے اس فلسفے پر بھی کاربند نہ تھے اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ سارے ہی مذاہب انسانوں کو بہتر اخلاق و عادات اختیار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھے اعمال کی صورت میں انعام اور بُرے اعمال کے نتیجے میں سزا کی خبر سُناتے ہیں۔ خود اسلام اس اعتبار سے ایک مکمل دین ہے اور اس نے انسانوں کی رہبری کے لیے جامع اصول مقرر کر دیئے ہیں مگر ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ وہ مسلمان جو اسلام کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں، اسلام کی تعلیمات کے منافی اقدام کرنے سے باز نہیں رہتے۔ نہ جنت کی بشارت اُن پر کوئی اثر چھوڑتی ہے اور نہ ہی دوزخ کا عذاب اُنھیں غلط کاموں سے باز رکھتا ہے تو پھر دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے کوئی کیا شکایت کر سکتا ہے؟

میں اِن خیالات سے چونکا اور نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے شیلا کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا۔ وہ شاید ابھی تک اس اچانک صدمے اور خوشی کے تاثر سے سنبھل نہ سکی تھی اور ساکت و جامد کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو شیلا کی نگاہیں از خود جُھک گئیں اور پھر وہ غیر ارادی طور پر اپنی ساڑھی کو اپنے جسم پر لپیٹنے لگی۔ اس لمحے مجھے اس پر اتنا ترس اور اتنا پیار آیا کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، دِل بھر آیا۔ ایک عورت کی تقدیس کو مٹی میں ملانے والوں پر تو غصّہ تھا ہی لیکن عورت ذات کی بے بسی اور مجبوری نے میرا دل دہلا دیا۔ خدایا۔ اتنی نازک شے کو تُو نے اپنی حفاظت کرنے کی طاقت سے کیوں محروم رکھا ہے؟ اور اگر انھیں صنفِ نازک ہی بنایا تھا تو مردوں کے دِلوں میں ایسا جذبہ کیوں پیدا کیا ہے جو اس مُقدّس ہستی کے احترام کو ملانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا؟

شیلا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش، آنسوؤں کے راستے اپنے دِلوں کی بھڑاس نکالتے رہے پھر وہ سنبھلی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی: "بھیا۔ تمہیں بھگوان نے پھر میری عزت کی رکھوالی کے لیے بھیج دیا؟ تم تو چلے گئے تھے۔ پھر کیسے واپس چلے آئے؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی مَیں ہنس پڑا۔ مَیں نے کہا: "شیلا۔ تیرا بھگوان اور میرا خُدا اتنا بے خبر نہیں ہے کہ وہ ایک شریف اور نیک عورت کی پارسائی کو برباد ہوتا دیکھ کر بھی خاموش رہے۔ اُس نے مجھے تیری حفاظت کی ذمّہ داری سونپی ہے، تُو میری بہن ہے پگلی۔ کیا ایک بھائی کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ اس کی بہن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے؟"

شیلا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی مگر پھر اپنے مدہوش شوہر کی طرف دیکھ کر وہ زہریلے لہجے میں بولی: "میری عزت کا رکھوالا تو میرا گھر والا ہے بھیا۔ دیکھو۔ کیسے مزے سے پاؤں پھیلائے سو رہا ہے۔ جب جنگل میں اُن بھیڑیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور تم نے آکر مجھے اُن کے پنجوں سے بچایا تھا اُس وقت بھی یہ بے شرم اور بے غیرت پتی دارُو کے نشے میں دھت پڑا ہُوا تھا۔ اور دیکھ لو آج بھی کیا مست اور بے خبر ہے"

"تو پھر کیا ہُوا؟" مَیں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "تیری حفاظت کا بندوبست تو ہو گیا ہے نا؟" مگر پھر مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ شیلا نے ایک قابلِ غور بات کہہ دی ہے۔ ایک شرابی شوہر اور اپنے آس پاس بدمست آوارہ فوجیوں کے ہجوم کے ہوتے ہوئے وہ کیوں کر اپنے آپ کو ان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھ سکے گی اور کب تک؟

معاً مَیں نے ایک فیصلہ کیا: "شیلا۔ تُو میرے ساتھ چلے گی؟"

"کہاں؟" وہ اس خلافِ توقع سوال سے چونک کر بولی۔

"جہاں بھی مَیں جاؤں۔"

"مگر تم تو خود بھاگے پھر رہے ہو۔ اپنے وطن سے، اپنے گھر سے دُور دشمنوں میں گھرے ہوئے ہو۔ تمہاری تو اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح تمہاری خوشبو سُونگھتے پھر رہے ہیں اور موقعہ ملتے ہی تمہیں شکار کر لیں گے۔ پھر تم میرا بوجھ کیسے اُٹھاؤ گے"

بات اس نے دُرست کہی تھی مگر میرے اندر کا سویا ہوا برادرانہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا۔ مَیں نے کہا: "شیلا۔ میں چلا جاؤں گا تو اس جنگل میں تیری حفاظت کون کرے گا؟ تیرا گھر والا نشے میں ڈوبا رہتا ہے۔ چاروں طرف بھُوکے دَرِندوں کا راج ہے۔ اس ماحول میں تیرا ٹھیک نہیں ہے۔ مَیں تمہیں یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ چل میرے ساتھ۔"

میرے لہجے میں اتنا خلوص، پیار اور تحکم تھا کہ شیلا نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی ساڑھی کے پلّو کو سمیٹ کر سر پر ڈالا، اپنے مدہوش شوہر اور جھونپڑی میں پڑی ہوئی چاروں لاشوں کو نفرت سے دیکھا اور میری طرف بڑھی: "چلو بھیا۔" اُس نے فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ نہ سوچ بچار کی ضرورت محسوس کی تھی۔

"چلو" مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ شاید کچھ دیر کے لیے مَیں اپنے گردوپیش سے بے گانہ ہو گیا تھا اور مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ مَیں دُشمن کے ہیلی کاپٹر میں اپنے دو ساتھیوں اور ایک دُشمن کے پائلٹ کو منتظر چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہیلی کاپٹر زیادہ دُور نہ تھا۔ اس کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور صاف ظاہر تھا کہ پائلٹ ابھی تک سجّاد اور مُبارک کے قابو میں ہے۔

ابھی مَیں اور شیلا ہیلی کاپٹر تک نہیں پہنچ پائے تھے کہ پیچھے اپنے پیچھے سے ایک للکار سُنائی دی: "رُک جاؤ۔"

میرے قدم رُک گئے، شیلا بھی میرے ساتھ ہی تھم گئی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جھونپڑی کے دروازے میں وہی عورت کھڑی تھی جسے کچھ دیر پہلے فوجیوں نے گھسیٹ کر ایک جھونپڑی کے آگے ڈال دیا تھا۔ زیادہ تشویش اور خطرے کی بات یہ تھی کہ اُس کے ہاتھ میں ایک مشین گن بھی تھی جو غالباً اس نے کسی فوجی کے پاس سے اُٹھالی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مشین گن تھامے گھٹنوں کے بل کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بکھر کر شانوں پر پھیل گئے تھے، نیم تاریکی میں اُس کا وجود ایک آسیب نظر آتا تھا۔

"شیلا تجھے لاج نہیں آتی، دیش کے دُشمن کے ساتھ جا رہی ہے۔ اپنے دھرم کو، اپنے پتی کو، اپنے کُنبے کو بھول گئی ہے؟"

شیلا خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ شیلا کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے مگر مُنہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

"اور تُو۔" اس بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "راکھش۔ مَیں تجھے۔ نشٹ کر دوں گی۔" اُس کے الفاظ سے آگ برس رہی تھی۔ نفرت سے اُس کا چہرہ بگڑ کر اور مسخ ہو چکا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جو خود اپنی زبان سے کچھ دیر پہلے یہ اقرار کر چکی تھی کہ وہ چوری چھپے گھر سے باہر نکل کر جنگل میں ایک غیر مرد کا انتظار کرتی رہی تھی مگر اَب یہی عورت ستی ساوتری کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی اور شیلا کو گناہ اور ثواب کا مطلب سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُس نے مجھے دوسری طرف سوچنے کا موقعہ بھی نہیں دیا۔ الفاظ کے مُنہ سے نکلتے ہی اُس نے مشین گن پر اپنے ہاتھوں اور اُنگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اُس کا اچانک نمودار ہونا میرے لیے ایک انتہائی خلافِ توقع واقعہ تھا۔ مَیں ابھی تک پوری طرح اس سے پہلے رونما ہونے والے واقعات کے تاثر سے ہی نہیں سنبھل سکا تھا کہ یہ ایک دوسری آفت نازل ہو گئی۔ اُس نے مجھے اتنی مُہلت بھی نہیں دی کہ مَیں اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی مشین گن کی نالی کا رُخ اُس کی طرف موڑ سکتا۔ "تڑاتڑ" کی آواز نے جنگل کے سنّاٹے کو توڑ دیا۔ نہ جانے کس لمحے شیلا ایک قدم بڑھ کر میرے اور مشین گن کی گولیوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ جس وقت میرا دماغ سوچنے کے قابل ہُوا اور مَیں نے زمین پر لیٹ کر شیلا کو اپنے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے گرایا اس وقت تک نہ جانے کتنی گولیاں شیلا کے جسم میں پیوست ہو چکی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے فائرنگ کی آواز بند ہوئی اور دوبارہ گونجی تو مجھے کامل یقین تھا کہ اس مرتبہ یہ فائرنگ میرے جسم کو چھلنی کر دے گی لیکن مشین گن کا برسٹ ختم ہونے کے بعد بھی مَیں محفوظ تھا۔ غالباً اس بار نشانہ پوری طرح دُرست نہیں تھا؟ لیکن نہیں۔ مَیں نے اُس عورت کو مشین گن سمیت ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرتے دیکھا اور پھر ہیلی کاپٹر کے دروازے سے کُود کر سجّاد باہر نکلا۔ اُس نے عورت کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتا ہوا میرے نزدیک آیا۔ "سر۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟" وہ دوزانو ہو کر جُھک گیا اور اس نے میرا ہاتھ تھام کر میرے جسم کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

"مَیں بالکل محفوظ ہوں سجّاد۔" مَیں فوراً ہی کسی سہارے کے بغیر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تھینک یو فار سیونگ مائی لائف۔"

یہ کہہ کر مَیں شیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ مجھ سے دُور نہیں تھی مگر پھر بھی بہت دُور جا چکی تھی۔ اتنی دُور جہاں تک نہ آواز جا سکتی ہے اور نہ ہی وہاں جا کر کوئی واپس لوٹ سکتا ہے۔ مَیں نے جُھک کر دیکھا۔ اُس کی سفید ساڑھی پر خود اس کے اپنے خون سے نقش و نگار بن گئے تھے۔ اُس کا ایک ہاتھ میری جانب اُٹھا ہوا تھا اور دوسرا اس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید وہ اپنے منہ بولے بھائی کے مرنے کا منظر دیکھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن نہیں، یہ موت تھی جس نے اس کی آنکھیں

www.pdfbooksfree.pk

ہمیشہ کے لیے بند کر دی تھیں۔ وہ مر چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جس وقت میں نے اُسے جھٹکے سے اپنے ساتھ کھینچا تھا اس وقت بھی وہ زندہ نہ تھی۔ مگر وہ اپنے منہ بولے بھائی پر نثار ہو گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے میں اُس کی سلامتی اور اُس کی عزت و آبرو کے بارے میں فکر مند تھا۔ اب وہ میری سلامتی کا زندہ ثبوت بن کر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میں بے اختیار اس پر جھک گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نہ جانے کتنی دیر تک میں روتا رہا۔ مجھے گرد و پیش کا کوئی ہوش تھا نہ احساس۔ جب میں اپنے ہوش و حواس میں واپس آیا تو سجاد مجھے تھامے ہوئے کھڑا تھا "دیر نہ کیجیے۔ ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے" وہ مدھم آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سجاد، یہ میری بہن ہے۔ منہ بولی بہن۔ دیکھا کس طرح میری جان بچانے کے لیے قربان ہو گئی؟ کیا میں اسے یہاں اسی حالت میں تنہا چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

"وہ بہت عظیم عورت تھی۔" سجاد نے میرا شانہ دبایا۔ "خدا اُسے اس نیکی کا اجر دے گا۔ اُس نے ایک بھائی کی ہی نہیں ایک مجاہد کی بھی جان بچائی ہے۔ اللہ سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ اب ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آئیے۔"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھانے کی کوشش کی مگر میں مچل گیا۔ بپھر کر بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا، میں اپنی بہن کی بے گور و کفن لاش کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"سر، یہ نہ بھولیے کہ اُس نے آپ کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بہن کی یہ عظیم قربانی رائیگاں چلی جائے۔ خدا کے کاموں میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اُس کی رضا یہی تھی۔ آئیے۔ اُس کے لیے دعائے مغفرت کیجیے اور پھر واپس چلیے۔ یاد رکھیے، ہم پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔" سجاد کے اِن فقروں نے میرے سلگتے ہوئے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ یوں لگا جیسے بے چین جذبات کو قرار آ گیا ہو۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔

میں نے آنسو بھری نگاہوں اور غم سے بوجھل دل کے ساتھ ایک آخری نظر شیلا پر ڈالی اور میرے ہاتھ بے اختیار دعا کے لیے اُٹھ گئے۔ وہ ایک غیر مسلم تھی مگر میں خدا سے اُس کی مغفرت کے لیے دعا کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا تو سجاد بھی دعا میں میرے ساتھ شامل تھا۔ خدا جانے ہماری یہ حرکت مذہب اور شریعت کی رُو سے جائز تھی یا ناجائز مگر یہ ایک بے اختیار اور غیر ارادی عمل تھا۔ بعد میں بھی اکثر میں نے اس موضوع پر سوچا ہے اور ہر بار اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہو سکتا ہے خداوند تعالےٰ نے اُس بے گناہ اور نیک عورت کی رُوح کو اپنی رحمت کے صدقے میں بخش دیا ہو۔

میں جھکا اور ساڑھی کا آنچل شیلا کے چہرے پر ڈال دیا۔ یوں، لگتا تھا جیسے میرے دل کو سکون اور قرار حاصل ہو چکا ہے۔ آنکھیں بھی خشک تھیں۔ آخری نظر اس پر ڈالی اور میں سجاد کے ہمراہ ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑا، مگر چلتے چلتے یہ سوچنا نہ بھولا کہ واقعی کارخانۂ قدرت بھی عجیب ہے، کوئی نہیں جان سکتا کہ پل بھر بعد کیا ہونے والا ہے؟ ایک وقت تھا جب میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ شیلا کا کیا ہو گا؟ میں اسے اپنے ساتھ لیے تو جا رہا ہوں مگر اس کا مستقبل کیا ہے یا میں اس کی حفاظت کیونکر کر سکوں گا؟ یہ مسئلہ پلک جھپکنے میں خود بخود حل ہو چکا تھا۔ شیلا نے میرے لیے بوجھ بننا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس وہ مرتے مرتے بھی مجھ پر ایک احسانِ عظیم کر گئی تھی۔ کتنی عظیم عورت تھی وہ جس نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی آبرو رکھ لی تھی۔ میری کوئی حقیقی بہن بھی ہوتی تو شاید میرے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتی۔ جان قربان کر دینے سے زیادہ اور کوئی انسان کیا کر سکتا ہے!

شیلا کے بے جان جسم پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد میں ہیلی کاپٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ مبارک ابھی تک پائلٹ کی کنپٹی سے مشین گن کی نالی لگائے ہوئے مستعد کھڑا تھا۔ اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے بھی پائلٹ سے نہیں ہٹی تھی اس لیے وہ ہیلی کاپٹر کے باہر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بھی بے خبر ہی تھا مگر پائلٹ کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں اور صاف ظاہر ہے کہ وہاں جو بھی ڈرامہ ہوا پائلٹ اس کی تمام تفصیل کا شاہد تھا۔ اسے غالباً ابھی تک یقین نہ تھا کہ ہم اس کی جان بخشی کر دیں گے۔ اس لیے کہ جب میں نے اسے فوری طور پر ہیلی کاپٹر اُڑانے کا حکم دیا تو وہ دونوں ہاتھ باندھ کر گھگھیانے لگا اور جان بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ "فضول باتوں میں ضائع نہ کرو۔ جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے چلو اور یاد رکھو ہمارے حکم کی تعمیل ہی میں تمہاری زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔"

ہیلی کاپٹر حرکت میں آیا اور فضا میں بلند ہونے لگا۔ گاؤں اور گاؤں کے لوگ ہم سے بتدریج دُور ہونے لگے یہاں تک کہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئے۔ میرا ذہن اور دل انتہائی بوجھل ہو رہا تھا۔ سجاد نہ جانے کب سے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں خیالوں میں گم تھا۔ آخر اُس نے میرا بازو چھوا اور میں چونک پڑا۔ "کتنی دیر سے آپ کو مخاطب کر رہا ہوں مگر آپ دھیان ہی نہیں دے رہے۔"

"سوری! کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سر، سب سے پہلے تو پائلٹ کو یہ بتائیے کہ ہمیں جانا کدھر ہے!"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ سوال فی الوقت میرے لیے بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ گذشتہ لمحات میں رُونما ہونے والے واقعات نے مجھے اس مسئلے پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی مگر اب میری تمام حسیات جاگ اُٹھی تھیں اور کام کر رہی تھیں۔ میں پائلٹ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے ایک اسلحہ ساز فیکٹری اور ائیرپورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ دونوں یہاں سے کتنے فاصلے پر ہیں؟"

اُس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ائیرپورٹ ہم سے قریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں موقع کی اہمیت کے اعتبار سے چاق و چوبند ہوابازوں کا ایک دستہ ہمہ وقت چوکس رہتا تھا۔ یہ ایک اہم فضائی مرکز تھا جس کی موجودگی یا اہمیت سے ہمارے حکام ابھی تک باخبر نہیں تھے۔ اسلحہ ساز فیکٹری اس ائیرپورٹ سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھی۔ مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں مقامات سرحدوں کے بہت زیادہ اندر واقع تھے اور اگر ہم وہاں جاتے تو اپنے مُلک کی سرحدوں سے اور زیادہ دُور ہو جاتے لیکن اس خطرے کو مول لیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا چنانچہ میں نے پائلٹ کو ہدایت کی کہ وہ ہیلی کاپٹر کا رُخ ائیرپورٹ کی طرف موڑ دے۔ ساتھ ہی میں نے اُسے یہ انتباہ بھی کر دیا کہ اگر اس نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ہماری جانوں کو کوئی خطرہ لاحق ہونے سے پہلے ہی وہ خود اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ پائلٹ کو اپنی زندگی بہت زیادہ پیاری تھی۔ اُس نے کسی چوں و چرا کے بغیر ہماری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ہمیں اپنی وفاداری کا ایک بار پھر یقین دلایا اور ہیلی کاپٹر تیزی سے شمال مغرب کی سمت پرواز کرنے لگا۔ ہم زیادہ بلندی پر نہیں پرواز کر رہے تھے اس لیے نیچے کھیت کھلیان، کھلے میدان اور درختوں کے ذخیرے صاف نظر آ رہے تھے۔ کھیتوں میں ہمیں مویشیوں کے سوا کوئی ذی رُوح نظر نہ آیا۔ ویسے بھی یہ بیشتر علاقہ گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جنگلات کا یہ خطّہ فوجی کارروائیوں کے لیے بہت موزوں تھا۔ غالباً اسی لیے ہائی کمان نے ہماری گوریلا کارروائیوں کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا۔

ائیرپورٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں اپنی حکمتِ عملی طے کرنی تھی۔ ہم تینوں دُشمن کے فوجیوں کی وردی زیبِ تن کیے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی اِن ہی کے تھے اس لیے پہلی نظر میں ہماری اصلیت کا راز فاش ہونے کا مطلق اندیشہ نہ تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم نے پائلٹ سے اس علاقے خصوصاً ائیرپورٹ کے ارد گرد کے مشہور مقامات کے نام دریافت کر کے یاد کر لیے۔ پائلٹ بہت زیادہ مددگار ثابت ہو رہا تھا اور ہمیں مطلوبہ معلومات سے کہیں زیادہ بتانے پر تُلا ہوا تھا۔

ابھی ہمیں پرواز کرتے ہوئے تین چار منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ چند ہی لمحے بعد دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے جو بہت تیزی سے پرواز کرتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے وائرلیس کے ذریعے ہمارے پائلٹ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ ایک ہیلی کاپٹر میں اُن کا گروپ کمانڈر بھی موجود تھا جو ہمارے پائلٹ سے یہ جواب طلبی کر رہا تھا کہ اس کی اجازت اور حکم کے بغیر اس نے اپنا رُخ کیوں تبدیل کر لیا اور واپس پہنچ کر اسے رپورٹ کیوں نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمارے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو فوری طور پہ اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی اور اُن دونوں جہازوں کا رُخ تبدیل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ شدہ ہیلی کاپٹر اور بستی کی طرف جا کر حقیقتِ حال معلوم کرنے کے خواہاں تھے۔ پائلٹ نے بے چارگی سے ہماری طرف دیکھا۔ یہ اطلاع وہ ہمیں پہلے ہی فراہم کر چکا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر مشین گنوں اور چھوٹی توپوں سے لیس ہیں۔ میں نے اسے خاموشی سے اپنے گروپ کمانڈر کا حکم ماننے کی ہدایت کی اور ہمارا ہیلی کاپٹر تیزی سے اُن دونوں کے عقب میں پرواز کرنے لگا۔ ہمارا باہمی فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دو منٹ بعد ہم پھر اسی گھنے جنگل کے اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ جس میں شیلا کی بستی واقع تھی اور اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ بستی پہنچتے ہی گروپ کمانڈر کو تمام صورتِ حال کا علم ہو جائے گا اور ہم دوبارہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ مبارک اور سجاد خاموش تذبذب کے عالم میں کھڑے کبھی مجھے اور کبھی ہمارے آگے جانے والے ہیلی کاپٹروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی ہم گھنے

www.pdfbooksfree.pk

درختوں کے ذخیرے کے اُوپر پہنچے میں نے مُبارک اور سجاد کو اشارہ کیا۔ مُبارک نے اپنی مشین گن کی نال پائلٹ کی کنپٹی پر رکھ دی اور سجاد اپنی مشین گن سنبھال کر دروازے کے پاس چوکس ہو گیا۔ میں نے بھی اپنی مشین گن کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے ہماری مشین گنوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ آگے جانے والے ہیلی کاپٹر ہم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ ہماری فائرنگ کی بوچھاڑ خلاف توقع اور بالکل اچانک تھی۔ اس لیے انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ دونوں ہیلی کاپٹر چشم زدن میں آگ کے گولوں کی شکل میں تبدیل ہو کر زمین پر گرتے ہوئے نظر آئے مجھے یقین کامل تھا کہ دونوں میں کوئی ایک شخص بھی جاں بر نہ ہو سکے گا۔ ہمارے پائلٹ کے لیے یہ تمام کارروائی ایکا ایکی عمل میں آئی تھی۔ وہ شاید دل ہی دل میں خوش ہو گا کہ اُس کی جاں بخشی کا وقت قریب آ گیا اور بہت جلد ہم تینوں اُس کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے وہ چشم تصور میں ہمیں سزا بھگتتے ہوئے بھی دیکھ رہا ہو لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اُس کی حسرتیں خاک میں مل چکی تھیں۔ وہ جن پر تکیہ کیے بیٹھا تھا وہ آناً فاناً موت کی وادی میں پہنچ گئے تھے اور ایک بار پھر وہ ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ سجاد خوش ہو کر بولا "سر ہمیں جنگل میں اُتر کر اپنی تسلی کر لینی چاہیے کہ وہ سب کے سب ختم ہو چکے ہیں:"

ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے سجاد۔" میں نے اُسے سمجھایا: "اُن میں سے کوئی زندہ نہیں بچ سکتا اور اگر بچ بھی گیا تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس دُور اُفتادہ ویران اور گھنے جنگل میں کسی سواری کے بغیر اُس کا اپنی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اتنی دیر میں ہم اپنے ٹارگیٹ پر پہنچ چکے ہوں گے:"

"یو آر رائٹ سر" مُبارک پہلی بار انگریزی میں چہکا۔ خوشی کا تاثر اُس کی آواز سے موسیقی کی طرح پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ کامرانی کی روشنی سے دمک رہا تھا۔ اُس نے اپنی مشین گن سے پائلٹ کی کنپٹی کو سہلایا اور بولا: "میرے بیٹے۔ واپس اُسی راستے پر ہو جاؤ جس طرف ہم پہلے جا رہے تھے۔" پھر شاید اُسے خیال آیا کہ وہ میری موجودگی میں براہ راست احکامات جاری کر رہا ہے۔ معذرت خواہانہ انداز میں وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "سر۔ یہ حکم میں نے آپ کی طرف سے دیا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ بہت دیر کے بعد بلکہ دیکھا جائے تو بہت عرصے بعد میں بے اختیار ہنسا تھا۔ دُشمن کے دو ہیلی کاپٹروں کی تباہی سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ ہم ایک بار پھر اُن کے نرغے سے نکل کر آزاد ہو گئے تھے اور ایک بہت بڑی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ پائلٹ کا چہرہ ایک بار پھر مٹی کے رنگ کا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوف اور مایوسی جھانک رہی تھی اور اُس کے ہاتھ لرزتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اُس نے مایوسی کے عالم میں ایک جھٹکے سے ہیلی کاپٹر کا رُخ ایک بار پھر ائرپورٹ کی جانب موڑ دیا۔ اس بار ہمارے ہیلی کاپٹر کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ چند منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اُس نے ہمیں بتایا کہ اب وہ ائرپورٹ سے بیس میل دُور ہے اور راڈار کی زد میں ہے۔ میری ہدایت پر اس نے ائرکنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا اور اپنی شناخت کرانے کے بعد لینڈ کرنے کی اجازت طلب کی۔ اس عرصے میں ہم گھنے جنگلوں سے گزر کر کھلے میدانوں اور کھیتوں کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ درخت اور جنگل یہاں بھی تھے مگر اُن کے درمیان ایک ہموار خطۂ زمین بھی موجود تھا۔ یہ ائرپورٹ ہی نہیں ایک اہم فوجی اور فضائی مرکز بھی تھا کیونکہ عمارتوں اور دوسری تنصیبات کا سلسلہ کافی دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہم نے طیارہ شکن توپیں بھی نصب دیکھیں۔ درختوں کے بعض جُھنڈوں میں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل بھی مزید نصب ہوں گے۔ ہمارے بارے میں ذرا سا بھی شک پیدا ہونے کی صورت میں ایک اُنگلی کے ہلکے دباؤ سے ہمارا ہیلی کاپٹر صفحۂ ہستی سے مٹ سکتا تھا مگر پائلٹ کو اپنی زندگی عزیز تھی اور میرا پڑھایا ہوا سبق وہ طوطے کی طرح وائرلیس پر سُنا چکا تھا جس کے بعد اُن لوگوں کو ہماری طرف سے بدگمانی یا شک و شبہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پائلٹ نے انھیں مطلع کیا تھا کہ وہ گروپ کمانڈر جبین سنگھ کی ہدایت پر مزید معلومات فراہم کرنے کے لیے ائرپورٹ پر لینڈ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی شناخت بھی کرا دی تھی اور ائر ٹاور میں موجود ٹریفک کنٹرولر ذاتی طور پر بھی اُس کو جانتا تھا۔ اس کے بعد کسی قسم کا خطرہ درپیش ہونے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اب ائرپورٹ کے رن وے ہماری نگاہوں کے سامنے تھے۔ یہ ایک اہم فضائی مرکز تھا اور میلوں تک رن وے کا مکڑی کے جالوں کی طرح جال بچھا ہوا تھا۔ کئی عمارتیں بھی تھیں جن میں سے اکثر ریت کی بوریوں سے گھری ہوئی تھیں۔ چند مقامات پر ہم نے زیر زمین مورچوں کی نشانیاں بھی دیکھیں۔ جگہ جگہ بھاری بکتر بند گاڑیاں پوزیشن سنبھالے کھڑی تھیں۔ کئی مقامات پر ہم نے بھاری ٹینک بھی ایستادہ دیکھے۔ طیارہ شکن

توپوں اور میزائیلوں کی بھی بہتات تھی۔ اس کے بعد ہمیں ائرپورٹ ٹرمینل یا مرکزی آپریشن سنٹر کی عمارت نظر آئی۔ یہ ایک منزلہ عمارت کافی وسیع تھی اور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُوپر سے دیکھنے میں یہ بظاہر فوجی بیرکس نظر آتی تھیں مگر ہم جانتے تھے کہ یہ ایک اہم اعصابی مرکز ہے۔ اس عمارت سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر بمبار جنگی جہازوں کا ایک بیڑا کھڑا ہوا تھا۔ گننے پر ان جہازوں کی تعداد پندرہ نکلی۔ پائلٹ ہمیں یہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ ان جہازوں کے پائلٹ چوبیس گھنٹے قریبی عمارت میں کمربستہ رہتے ہیں اور چند لمحوں کے نوٹس پر یہ بمبار جہاز موت کا خوفناک سایہ بن کر فضا میں پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بظاہر گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے اس علاقے میں ایک اتنا بڑا اور اہم فضائی مرکز بھی موجود ہو گا۔ عمارت کے نزدیک جیپوں اور فوجی گاڑیوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ میں نے بمبار طیاروں کے نزدیک کھلے گھاس کے میدان میں ہیلی کاپٹر اُتارنے کی ہدایت کی۔ پائلٹ اس حکم پر حیران تو ضرور ہوا ہو گا مگر اُس کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب اپنی آزادی کو نزدیک تر دیکھ رہا تھا۔ تین افراد خواہ وہ کتنے ہی مہلک ہتھیاروں سے لیس کیوں نہ ہوں دُشمن کے ایک فوجی مرکز پر بے دست و پا ہی کیے جا سکتے ہیں۔ وہ چشم تصور میں ہماری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا تھا اور ہماری اس حماقت پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ ہم نے جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ شخص اپنی جان بخشی کے عوض ہمیں یہ پیش کش بھی کر چکا تھا کہ اگر ہم رضامند ہوں تو وہ ہمیں اپنے مُلک کی سرحد کے نزدیک چھوڑ آئے گا۔ ایک اور تجویز اس نے یہ بھی پیش کی تھی کہ اگر ہم اسے جنگی قیدی بنانے کا یقین دلائیں تو وہ ہیلی کاپٹر سمیت ہمیں پاکستان کی سرحد کے پار لے جا سکتا ہے مگر ہم نے اُس کا کوئی مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ اب جب کہ ہم چاروں طرف سے دُشمنوں کی ہلاکت خیزیوں میں گھرے ہوئے ایک محصور مقام پر ہیلی کاپٹر اُتارنے کا حکم دے رہے تھے تو اس کی آنکھوں میں اُمید اور فتحیابی کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

ہمارا ہیلی کاپٹر زمین پر اُترا تو آس پاس کسی نے بھی اس طرف توجہ نہ دی۔ یہ ایک معروف ائرپورٹ اور فوجی مرکز معلوم ہوتا تھا۔ غالباً یہاں ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہو گا۔ پھر جب خود اُن کی اپنی ہی فوج کا ایک ہیلی کاپٹر ائرکنٹرول ٹاور سے کلیرنس حاصل کرنے کے بعد زمین پر اُترا تو ظاہر ہے کہ کسی کو کیا اعتراض یا شک ہو سکتا تھا۔ میں نے پائلٹ کو ہدایت کی کہ وہ ہیلی کاپٹر کا انجن چالو رکھے۔ مُبارک کی مشین گن کی نالی اس وقت اُس کی کنپٹی پر نہیں تھی پھر بھی وہ مُبارک کی مشین گن کی زد میں تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ مُبارک کی اُنگلی کا معمولی سا دباؤ بھی اُس کے جسم کو چھلنی کر دے گا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ ہم لوگ اپنی کارروائیوں کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ جس لمحے کو اپنی نجات کا لمحہ سمجھ رہا ہے وہ دراصل اس کے لیے ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔

ہیلی کاپٹر سے کود کر میں باہر نکلا اور نزدیک ہی کھڑی ہوئی ایک جیپ کا رُخ کیا۔ اس کے ساتھ ہی سجاد نے پائلٹ کو دوبارہ ہیلی کاپٹر اُڑانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ کچھ پس و پیش کے بعد اس نے سجاد کے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس اثنا میں جیپ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ ایک فوجی اس کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر مسکرایا مگر میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بہت زیادہ عجلت میں ہوں۔

"جیپ کی چابی کہاں ہے؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی مگر جب میں نے چابی لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا: "سوری سر۔ مجھے چابی کسی کو دینے کا آرڈر نہیں ہے۔ میں آپ کو ہیڈکوارٹر پہنچا سکتا ہوں۔"

میں نے کسی تاثر کا اظہار کیے بغیر گردن ہلائی اور کُود کر جیپ میں سوار ہو گیا۔ اس نے سٹیرنگ سنبھالا اور جیپ کو سٹارٹ کرتے ہوئے پُوچھنے لگا: "کون سے فرنٹ سے آئے ہیں سر؟"

میں بلاوجہ سوال و جواب کی اُلجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا اس لیے مختصراً جواب دیا: "تم اپنے کام سے کام رکھو۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔"

وہ خاموشی سے کان دبا کر جیپ کو موڑنے میں مصروف ہو گیا۔ اس لمحے میں نے ہیلی کاپٹر کو فضا میں بلند ہو کر ہیڈکوارٹر کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کی بلندی زیادہ نہ تھی اور رفتار بھی بہت کم تھی۔ اس رفتار سے ہیلی کاپٹر کو عمارت تک پہنچنے کے لیے بمشکل ایک منٹ

www.pdfbooksfree.pk

کا وقت درکار تھا۔ گویا میرے پاس بھی اس سے زیادہ مہلت نہ تھی۔ میں دل ہی دل میں مُسکرایا اور جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا: "دیکھو جیپ کو ادھر لے لو۔" میرا اشارہ جنگی طیاروں کی قطاروں کی طرف تھا۔

"وہ آؤٹ آف بونڈ ہے سر۔" وہ میرے برتاؤ کی وجہ سے مجھے اپنے سے بڑا افسر خیال کر کے مرعوب ہو گیا تھا۔

"آپ کو جانا کدھر ہے؟" یہ کہہ کر اس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ مگر میرا دھیان ہیلی کاپٹر کی طرف لگا ہوا تھا جو ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور اس کے سامنے والی کھلی جگہ میں لینڈ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب تک سارا کام منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ سکیم یہ تھی کہ عمارت کے سامنے پہنچ کر سجاد اور مبارک پاس کھڑے ہوئے آئل ٹینکروں کو مشین گنوں کا نشانہ بنائیں گے اور پھر ہیلی کاپٹر لے کر تیزی سے روانہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک آفت کی وجہ سے سب کی توجہ عمارت کی طرف ہو گی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر مجھے جنگی طیاروں کو نشانہ بنانا تھا۔ یہ بات ہم بھی جانتے تھے کہ یہ ایک طرح سے خودکشی کی مہم تھی جس میں بچنے کا صرف بیس فیصد امکان تھا۔ مگر میں یہ دیکھ کر ساکت رہ گیا کہ ہیلی کاپٹر زمین پر اُترنے کی بجائے اُس سے تیس چالیس فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا مسلسل ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ معاً مجھے خیال گزرا کہ شاید پائلٹ نے اِن دونوں کے ارادے کو بھانپ کر کچھ پس و پیش اور گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جلد ہی میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ مشین گن کے فائر فضا میں گونجے اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک انسانی جسم کو ہیلی کاپٹر سے نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ اب ہیلی کاپٹر اور عمارت کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے میری جیپ کے ڈرائیور کو بھی ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میری طرح اُس نے بھی ایک انسانی جسم کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ پائلٹ کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔

جیپ ڈرائیور کے مُنہ سے آواز نکلی: "او مائی گاڈ۔ یہ کیا تماشہ ہے؟" مگر اس کی آواز مشین گن کی فائرنگ میں ڈوب کر رہ گئی۔ سجاد اور مُبارک نے فائر کھول دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر چلانا ان دونوں میں سے کسی کو نہیں آتا تھا مگر اُن کے پاس ڈولتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف توجہ دینے کا وقت ہی نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے آئل ٹینکروں پر گولیوں کی بوچھار شروع کر دی تھی جو فوراً ہی آگ پکڑ کر شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اتنی دیر میں ہیڈ کوارٹر پر موجود فوجیوں اور محافظوں کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ بھاری آرمرڈ کاریں پوزیشن لے کر اپنی توپوں کے دہانے ہیلی کاپٹر کی طرف موڑ رہی تھیں اور شاید اس مرکز پر موجود تمام اسلحہ کا ٹارگٹ اس وقت وہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ مگر ہیلی کاپٹر کو توپوں گولیوں یا میزائیلوں کا نشانہ بنانے کا مطلب یہ تھا کہ براہِ راست ائر ہیڈ کوارٹر کو بمباری کا نشانہ بنایا جائے۔ یہ ایک مُشکل فیصلہ تھا جو فوری طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میرے جیپ ڈرائیور کا حیران چہرہ اور دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بھی اس خلافِ توقع واقع کی وجہ سے ائر ہیڈ کوارٹر پر موجود دوسرے لوگوں کی طرح بھونچکا رہ گیا ہے۔ میرے لیے یہ عمل موزوں ترین اور بہترین موقع تھا۔ میرا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور یہ جانے بغیر کہ اُس پر کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے، جیپ ڈرائیور کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھا اسٹیرنگ پر گر گیا۔ جیپ کی رفتار زیادہ نہ تھی اس لیے اسٹیرنگ کو سنبھالنا میرے لیے دشوار نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے اسے چلتی ہوئی جیپ سے باہر پھینکا اور اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ اس اثنا میں سجاد اور مُبارک کی مشین گنیں مسلسل آگ برسا رہی تھیں اور ائرپورٹ پر بے شمار آئل ٹینکر اور ان سے ملحقہ دوسری گاڑیاں وغیرہ شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ ایک ٹینک تیزی سے ہیلی کاپٹر کو اپنی زد میں لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹینک کے درمیانی دہانے کی توپوں سے چند فائر ہوئے مگر گولے ہیلی کاپٹر کی بجائے ائرپورٹ بلڈنگ پر گرے۔ اتنی دیر میں مُبارک اور سجاد نے غالباً آخری جانفروشانہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اُن کی مشین گنیں آگ برسا رہی تھیں مگر جلتی ہوئی گاڑیوں کے شعلوں نے خود ہیلی کاپٹر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر آگ میں لپٹے ہوئے ایک گولے کی صورت اختیار کر گیا اور آگ کا یہ گولا ائر ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے ٹکرایا۔ ایک فلک شگاف دھماکہ ہوا جس سے آس پاس کی فضا لرز کر رہ گئی۔ ائرپورٹ پر ب قیامت کا سماں تھا۔ میں نے دیکھا کہ عمارت سے کچھ پائلٹ دوڑتے ہوئے نکلے۔ اُن کا رُخ جنگی طیاروں کی طرف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اُن بیش قیمت ہوائی جہازوں کو آگ کا نشانہ بننے سے پہلے محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتے تھے۔ ابھی میں مُبارک اور سجاد کے شجاعانہ کارنامے

www.pdfbooksfree.pk

کی داد بھی نہ دینے پایا تھا۔ نہ ہی اُن کی شہادت پر مَیں نے فاتحہ پڑھی تھی لیکن ان باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میری جیپ اس وقت ایک بکتر بند گاڑی کے پاس سے گزر رہی تھی جس کا ڈرائیور اسے موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں نے جیپ کی رفتار تیز کی اور خود جیپ سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت میری جیپ کا رُخ ایک جنگی جہاز کی طرف تھا۔ بکتر بند گاڑی کے ڈرائیور نے ایک تیز رفتار جیپ کو براہِ راست ہوائی جہاز کی طرف لپکتے ہوئے دیکھا تو حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں مَیں زمین پر لوٹ لگا کر اس کی گاڑی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میری مشین گن کی ضرب اس کی گردن پر لگی اور وہ خاموشی سے لُڑھک گیا۔ مَیں نے بکتر بند گاڑی میں سوار ہو کر اس کا رُخ ہوائی جہازوں کی طرف موڑ دیا۔ بھاری میزائلوں سے لیس یہ آرمرڈ کار اس وقت میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ مَیں دھوئیں اور شعلوں کے درمیان پائلٹس کو بے تحاشہ ہوائی جہازوں کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اِن میں سے ایک دو پائلٹ اپنے قریبی ہوائی جہازوں پر سوار ہوتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ایک خواب جیسا منظر تھا مگر میں پائلٹس سے زیادہ چابکدست ثابت ہوا۔ بکتر بند گاڑی سے میزائل تیر کی طرح نکلا اور درمیان میں کھڑے ہوئے ایک ہوائی جہاز سے ٹکرایا۔ مجھے نشانہ لینے کا وقت بھی نہیں ملا تھا مگر یہ پہلی ضرب ہی بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ ایک دھماکے کے ساتھ ہوائی جہاز کے پرخچے اُڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی جیسے آتشبازی چھوٹنے لگی۔ قریب کھڑے ہوئے دوسرے جہاز بھی یکے بعد دیگرے آگ کے شعلوں اور دھماکوں کا نشانہ بننے لگے۔ کچھ پائلٹ اپنے جہازوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ کچھ تھوڑے فاصلے پر تھے۔ اس ناگہانی عذاب نے اُنھیں بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ دھماکوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ دوسرا فائر کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ سارے ائرپورٹ کے طول و عرض میں قیامت برپا تھی۔ نفسانفسی کا عالم تھا۔ دھماکے، آتشزدگی، شعلے، دھواں، گاڑیوں کی آوازیں، زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخیں۔ غرضیکہ جہنم کا منظر تھا۔ کسی کو کسی کی خبر تھی اور نہ کسی کا ہوش تھا۔ ہر ایک اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ مَیں نے بکتر بند گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد شعلے اِس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ مَیں نے جو جیپ ہوائی جہازوں کی طرف روانہ کی تھی وہ درمیان میں ہی کسی گاڑی یا ٹینک سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی تھی۔ اب مجھے ایک اور جیپ کی تلاش تھی۔ اس دھواں دھار فضا میں جب کہ ہر طرف موت کا ہولناک کھیل جاری تھا اور ہر چیز دھماکوں اور شعلوں کی نذر ہو رہی تھی۔ ایک جیپ کی تلاش کچھ آسان کام نہ تھا۔ مَیں دیوانہ وار مقابلتاً محفوظ علاقے میں جیپ کی تلاش میں مصروف تھا مگر مجھے ایک بھی کارآمد جیپ نظر نہ آئی۔ اکثر موٹر گاڑیاں، جیپیں اور طیارے شعلوں کا شکار ہو کر جل رہے تھے۔ بعض ڈھانچوں کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ناگاہ میری نگاہ رَن وے سے کچھ دُور کھڑی ہوئی ایک جیپ گاڑی پر پڑی۔ دھوئیں کے مرغولوں، بارُود اور تیل کی بدبُو اور مُسلسل بھاگ دوڑ کی وجہ سے میرا سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ فضا میں آکسیجن کی کمی پیدا ہو گئی تھی۔ جیپ کافی فاصلے پر تھی اور مجھے وہی میری واحد اُمید نظر آ رہی تھی۔ مجھے فی الفور اس جیپ کو اور خود اپنے آپ کو جتنی جلدی ممکن ہو اس قیامت سے بچا کر دُور لے جانا تھا۔ مَیں نے اپنی بچی کُھچی طاقت یکجا کی اور جیپ کی طرف دوڑ لگا دی۔ میری آنکھوں کے سامنے سُرخ دائرے ناچ رہے تھے مگر مَیں جیپ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی تھی کہ اگنیشن میں چابی بھی لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے جیپ پر سوار ہو کر اسے پُوری رفتار سے بھگانے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کی۔ مجھے نہ سمتوں کا علم تھا نہ منزل کا پتہ تھا۔ مگر جس طرف بھی کُھلی ہوئی فضا نظر آئی مَیں نے اُسی طرف جیپ دوڑا دی۔ ہر منٹ قیمتی تھا کسی بھی لمحے کوئی آگ کا گولہ مجھ پر آ کر گر سکتا تھا یا کسی دھماکے سے اُڑنے والے طیارے کا ٹکڑا قہر بن کر مجھ پر نازل ہو سکتا تھا مگر انسان کی جینے کی خواہش اُسے ناقابلِ یقین مشکلات سے بھی نجات دلا سکتی ہے اور شاید میری قوّتِ ارادی ہی تھی جس کی بنا پر مَیں بہت جلد اِس آتش فشاں سے دُور پہنچ گیا۔ دھماکوں کی خوفناک آوازیں باقاعدگی سے آ رہی تھیں مگر میرے پاس نہ تو مُڑ کر دیکھنے کا وقت تھا اور نہ اِس کی ضرورت تھی۔ قریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد مَیں نے جیپ روکی اور اسٹیرنگ پر سَر رکھ کر سستانے لگا۔ شدید اعصابی اور جسمانی جدوجہد نے مجھے انتہا سے زیادہ تھکا دیا تھا۔ اُدھر میری نیند بھی پُوری نہیں ہوئی تھی۔ اِن تمام چیزوں نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ دوسرے ہی لمحے مَیں غفلت کی نیند سو گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر موت کا بھیانک کھیل جاری تھا اور خود میری اپنی زندگی بھی ہر آن خطرے میں تھی لیکن فوری خطرے سے محفوظ ہو جانے کے بعد میرے جسم اور اعصاب نے ہڑتال کر دی تھی اور مَیں ان عناصر کے سامنے بے بس ہو کر نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔ میری آنکھ کُھلی تو ابھی تک سورج کی روشنی باقی تھی۔ کچھ دیر تو میرے حواس قابو میں ہی نہ آئے پھر مجھے گزرے ہوئے واقعات کا خیال آیا

تو ساری باتیں ایک بُھولے بسرے خواب کی طرح یاد آئیں۔ گھڑی دیکھی تو تین بجے سہ پہر کا وقت تھا۔ نہ جانے کب سے مجھے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا اور اَب بھوک نے مجھے بے تاب کر دیا تھا۔ جیپ کی تلاشی لی تو پتہ چلا کہ وہاں بھی کھانے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ سب سے زیادہ پریشان کُن بات یہ تھی کہ میرے پاس اسلحہ کی فراوانی بھی نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے والی جیپ میں ہم نے کئی مشین گنوں کا ذخیرہ رکھا ہوا تھا مگر اَب وہ تمام اسلحہ جیپ کے ساتھ ہی میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ محض ایک ریوالور میری پیٹی میں لگا ہوا تھا۔ جنگل، بیابان، دشمن کا مُلک، ہر قدم پر جان جوکھوں کا معاملہ اور اِن سب کے مقابلے کے لیے میرے پاس صرف ایک ریوالور اور کچھ گولیاں، مگر یہ بھی بہت غنیمت تھا۔ بالکل نہتّا ہونے کے مقابلے میں یہ ایک خوشگوار اور اطمینان بخش صورتِ حال تھی جس کے لیے مَیں نے ایک بار پھر خداوند تعالےٰ کا شُکر ادا کیا۔

دُور سے دھماکوں کی آوازیں گاہے گاہے ابھی تک سُنائی دے رہی تھیں مگر اَب مَیں اِن سے بے پروا تھا۔ میرا مشن کامیاب ہو چکا تھا حالانکہ اِس مُہم میں میرے دو جاں باز اور قابلِ اعتبار ساتھی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکے تھے۔ میری آنکھوں میں وہ سماں پھر گیا جب سجّاد اور مُبارک کا جلتا ہوا ہیلی کاپٹر ائرپورٹ کی مرکزی عمارت سے ٹکرا کر ایک بہت بڑے آگ کے گولے کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بے شک وہ بہت شجاع اور جیالے لوگ تھے جنھیں شہادت کا رُتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ پھر مجھے سجّاد کا خیال آیا جس نے ابھی گھر بھی نہیں بسایا تھا۔ جس کے دوست، احباب اور رشتے دار اس کی شادی کے ارمان دِل میں لیے بیٹھے تھے۔ مُبارک کی بچّیاں اَب کس کے آسرے پر زندگی گزاریں گی؟ مگر انسانوں کو خدا کے سوا اور کس کا آسرا ہو سکتا ہے۔

جیپ آہستہ آہستہ سفر کر رہی تھی۔ میری نگاہیں آس پاس کے علاقوں پر تھیں، جہاں بے ثمر درختوں اور گھاس پھُونس کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں تھا۔ نہ جانے یہ بے منزل سفر کتنی دیر تک جاری رہے گا؟ کھانے کے لیے مجھے کچھ دستیاب بھی ہو سکے گا یا اتنی خطرناک اور جاں جوکھوں کی مہمات سے زندہ بچ رہنے کے بعد بھوک اور فاقہ کشی سے ہلاک ہونا میرا مقدّر بن چکا تھا؟ زیادہ پریشان کُن بات یہ تھی کہ مجھے اس علاقے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ نہ آس پاس کی بستیوں اور آبادیوں کا کوئی اندازہ تھا۔ مَیں نے اس خیال سے جیپ کی رفتار بڑھا دی کہ ممکن ہے رات ہونے سے بیشتر کسی آباد علاقے میں پہنچ جاؤں۔ کچھ دیر بعد جنگلوں کا سلسلہ کوہستانی علاقے میں تبدیل ہونے لگا۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر گھنے درخت سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ یہاں کوئی پکّی سڑک بھی نہ تھی مگر مَیں چھوٹی موٹی رُکاوٹیں عبور کرتے ہوئے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ مَیں نے پہلی بار جیپ کے میٹر پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ پٹرول بھی زیادہ نہیں ہے۔ گاڑی میں موجود پٹرول پچاس ساٹھ میل سے زائد مسافت کے لیے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ فالتو پٹرول کے لیے کوئی ڈبّہ بھی جیپ میں موجود نہ تھا گویا کچھ دیر بعد جیپ بھی میرا ساتھ چھوڑنے والی تھی اور آس پاس آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔

مَیں ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ایک سنسناہٹ کی آواز سُنائی دی۔ مَیں نے جیپ کی رفتار کم کر دی اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا۔ کیونکہ تھوڑی دیر بعد جیپ کا ایک ٹائر بیٹھ چُکا تھا۔ مَیں نے پریشانی کے عالم میں جیپ روکی اور کُود کر باہر نکلا۔ پچھلے ٹائر کی ہوا نکل چُکی تھی اور قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا ایک تیر اس میں پیوست تھا۔ یہ ایک ناگہانی اُفتاد تھی۔ تیر کا بھلا آج کے دَور میں کون استعمال کرتا ہے؟ میرے پاس کوئی فالتو ٹائر بھی موجود نہ تھا۔ گویا اَب میں تیر اندازوں کے رحم و کرم پر تھا۔ مَیں نے تیر کو کھینچ کر ٹائر سے نکالا۔ وہ لکڑی کا بنا ہوا ایک انچ موٹائی کا ایک گول تیر تھا جس کا اگلا حصّہ نہایت تیز نوک دار دھات کا بنا ہوا تھا۔ ابھی مَیں اس کا معائنہ ہی کر رہا تھا کہ سائیں سائیں کی چند اور آوازیں سُنائی دیں اور جیپ کے باقیماندہ تینوں ٹائروں اور اگلی سیٹ میں بھی تیر پیوست ہو گئے۔ مَیں غیر ارادی طور پر لپک کر جیپ کی آڑ میں ہو گیا اور ریوالور کو ہاتھ میں تھام لیا۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا وہ کسی بھی شخص کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ پہاڑیوں کے دامن میں لگے ہوئے اُونچے درختوں کے عقب سے نیم برہنہ جنگلی نیزے اور تیر کمان سنبھالے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کی یلغار چاروں اطراف سے تھی۔ اُنھوں نے کمانوں کے چلّوں میں تیر چڑھائے ہوئے تھے اور نیزہ بردار جنگلیوں نے ہاتھوں میں نیزے اس طرح پکڑ رکھے تھے جیسے ایک اشارے پر پھینک ماریں گے۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ چہروں پر بھی جنگلی پن اور وحشت کے سوا کوئی اور تاثر نہیں تھا۔ اُنھوں نے پھٹے پُرانے کپڑوں یا کھالوں کے ٹکڑوں سے اپنے جسم کے درمیانی حصّے ڈھانپے ہوئے تھے۔ اس کے سوا ان کے جسموں پر کوئی اور لباس موجود نہیں تھا۔ پیروں میں جُوتے تھے۔ مَیں نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا مگر

www.pdfbooksfree.pk

گولی چلانے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ چاروں جانب سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ گولی چلانے کا مطلب یقینی ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں اگر دس بارہ جنگلیوں کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو تب بھی اُن کی تعداد کم نہ ہوتی۔ اُن کی تعداد کے سامنے میں بے بس تھا۔ چنانچہ خاموشی سے اپنے آپ کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ وہ سب اپنی رفتار کم کئے بغیر میری طرف بڑھتے رہے یہاں تک کہ سامنے والوں کے نیزوں کی نوکیں میرے چہرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گئیں۔ ایک اَن جانے خوف نے مجھے گھیر لیا۔ کاش مَیں نے لڑ کر جان دینے کا فیصلہ کیا ہوتا اور مرنے سے پہلے کچھ جنگلیوں کو موت کے گھاٹ تو اُتار دیتا۔ اَب بے بسی اور بُزدلی کی موت میرا مُقدّر بن چکی تھی مگر اَب کوئی حرکت یا جدّوجہد کرنا لاحاصل اور بے معنی تھا۔ مَیں خاموشی سے اُن کو دیکھتا رہا اور اُن کے اگلے قدم کا منتظر رہا۔ وہ سب میرے نزدیک آکر رُک گئے تھے اور مجھے گھُور رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہٹا کٹا قدآور جنگلی دوسروں کو ہٹاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور کرختگی تھی۔ اس نے اپنے نیزے کی اَنی میری شہ رگ پر رکھ دی اور جنگلی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا جو مَیں نہیں سمجھ سکا۔

نیزے کی نوک میری گردن میں چبھ رہی تھی مگر اس پر زیادہ دباؤ نہ تھا شاید وہ مجھے محض خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہ پڑا۔ پھر اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ غالبًا وہ مجھے چُپ چاپ ہتھیار ڈال دینے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مَیں نے ریوالور اپنی پیٹی میں رکھ لیا تو اس کی گرج چمک میں کچھ کمی ہوئی۔ اس کے اشارے پر مَیں نے قدم آگے بڑھائے۔ اس کا نیزہ میرے گلے پر سے ہٹ چُکا تھا مگر میں بدستور چاروں طرف سے جنگلیوں کے نرغے میں تھا۔ مَیں نے ایک آخری نگاہ جیپ پر ڈالی جو میرے لیے بیکار محض ہو کر رہ گئی تھی اور اپنی تقدیر پر شاکی جنگلیوں کے جلو میں پہاڑیوں اور درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔

ہم دو تین گھنٹے تک مسلسل چلتے رہے۔ اس دوران میں کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا۔ ہر طرف مہیب سنّاٹا اور خاموشی تھی۔ ہمارے قدموں کی چاپوں کے سوا کوئی دوسری آواز نہ تھی۔ اسی اثنا میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ بُلند اور گھنے درختوں کی وجہ سے تاریکی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی پھیلنے لگی تھی اور جب ہم پہاڑیوں کے دامن میں ایک کُھلے مقام پر پہنچے تو رات پڑ چکی تھی۔ یہ درختوں سے گھری ہوئی ایک جنگلی بستی تھی جو درختوں، پتّوں اور گھاس پھُونس سے بنی ہوئی تھیں۔ اُن کی چھتیں گنبدوں کی طرح گولائی میں تھیں۔ ایسی جھونپڑیاں اور ایسی بستی مَیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر وہ کسی امریکی فلم کا ایک منظر تھا۔ جب کہ موجودہ نظارہ حقیقی تھا۔ جھونپڑیوں کے درمیان ایک مختصر مستطیل نما میدان میں لکڑی کے چند موٹے موٹے تنے کٹے ہوئے پڑے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ فرنیچر کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جھونپڑیوں میں چراغ اور دیئے جل رہے تھے مگر ایک بڑی جھونپڑی کے سامنے ایک مشعل روشن تھی جس کی دھیمی دھیمی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اس جھونپڑی کے اندر دوسری جھونپڑیوں سے زیادہ روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ قبیلے کے سردار کی جھونپڑی تھی۔ ہمارا قافلہ سردار کی جھونپڑی کے سامنے جا کر رُک گیا۔ وہ شخص جس نے نیزے کی اَنی میرے گلے پر رکھی تھی آگے بڑھا اور جھونپڑی کے دروازے کے نزدیک جا کر اس نے اپنی جناتی زبان میں بآوازِ بُلند کچھ الفاظ کہے۔ چند لمحے بعد دروازے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر ہی اِس اَمر کی تصدیق ہو جاتی تھی کہ وہ قبیلے کا سردار ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ قدآور اور جسیم تھا۔ اُس کے جسم پر بھی دوسروں جیسا ہی لباس تھا مگر ایک اضافہ اس کے سَر پر لگے ہوئے پَروں کا تھا وہ گندمی رنگ کا قوی ہیکل شخص تھا۔ رُعب داب اور شان و شوکت کے اعتبار سے بھی وہ سردار ہی بننے کا مستحق تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ میں لالٹین تھامے ہوئے ایک عورت نمودار ہوئی۔ لباس اس کا بھی مردوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس کے جسم کے بالائی حصّے پر بھی ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا بندھا ہوا تھا مگر باقی جسم بے لباس تھا۔ یہ کھلتی ہوئی سانولی رنگت کی ایک صحت مند اور خوش شکل عورت تھی اس کی آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی تھیں اور کھُلے ہوئے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ سردار کی گیارہ بیویوں میں سے ایک تھی۔

سردار نے جھونپڑی کے دروازے میں رُک کر سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ اُسے دیکھ کر تمام جنگلی تعظیمًا سر جھکا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عورت ایک قدم بڑھ کر میرے اور نزدیک آگئی اور اُس نے لالٹین کو اُونچا اُٹھا کر سردار کو یہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ بخوبی میرا جائزہ لے سکے۔ میری توجّہ سردار پر مرکوز تھی۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھوں سے مجھے گھُور رہا تھا اور اُس کی

آنکھیں مجھے اپنے جسم میں چُبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس جنگلی سے مخاطب ہُوا جو مجھے پکڑ کر لایا تھا۔ جواب میں اُس نے میرے بارے میں خاصی لمبی گفتگو شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے تفصیلات بتا رہا ہو گا۔ اس کا بیان کافی دیر تک جاری رہا اور اس دوران میں سردار کی نظریں ایک بار بھی میرے سوا کسی اور طرف مُنتقل نہیں ہوئیں۔ ایک بار ہم دونوں کی نظریں بھی چار ہوئیں اور مَیں نے بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مگر اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہ ہُوا۔ جنگلی کی بات ختم ہُوئی تو سردار کے کرخت چہرے پر پہلی بار مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہُوا ۔۔۔ "تم فوجی ہو سُورما؟"

اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری زبان جانتا تھا اور یہ خیال میرے لیے خاصا تقویت بخش تھا۔ مَیں نے سر ہلا کر تصدیق کی تو اُس کی مُسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھایا اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر وہ بڑھ کر میرے نزدیک آگیا اور دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر بولا۔ "سردار لوگا، سرکار کا دوست۔ تمہارا دوست۔ تم ہمارا دوست" یہ کہا اور پھر قہقہے لگانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی اُس کے پاس کھڑے ہوئے جنگلیوں نے بھی زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اس کی خُوبرو بیوی بھی، جو لالٹین تھامے کھڑی تھی ان قہقہوں میں شامل ہو گئی۔ سارا جنگل قہقہوں کی آوازوں سے گُونج اُٹھا۔ پہلے تو کچھ دیر مَیں حیرت سے ان سب کو ہنستا ہوا دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیئے مگر جب اِن کے قہقہے بند ہونے میں ہی نہیں آتے تھے تو مَیں نے بھی ان کی آوازوں میں اپنی آواز شامل کرنا ہی مناسب خیال کیا اور ان کے ساتھ ہی فلک شگاف قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ کچھ دیر تک بے مقصد قہقہوں کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ سردار غالبًا تنگ آگیا اور وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ دوسرے جنگلیوں نے بھی اُس کی پیروی کی اور مجھے بھی اپنے قہقہوں کو روکنے میں کوئی مُشکل پیش نہیں آئی۔ سردار نے مجھے گرفتار کر کے لانے والے کو مخاطب کیا اور پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ اُس کا نام ڈونگا ہے۔ ڈونگا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر مُڑ کر دوسرے جنگلیوں سے کچھ کہا۔ وہ سب خاموشی سے اُس کے ساتھ رُخصت ہو گئے۔ سردار لوگا اُن سے فارغ ہو کر پھر میری طرف متوجہ ہُوا۔ "آجاؤ۔ تم ہمارے مہمان ہو" بازو سے تھام کر وہ مجھے جھونپڑی کے اندر لے گیا۔

جھونپڑی خاصی کشادہ تھی۔ زمین پر چٹائیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ درختوں کے کٹے ہوئے چند موٹے موٹے تنے بھی یہاں وہاں رکھے ہُوئے تھے جو غالبًا فرنیچر کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ سردار ایک تنے پر براجمان ہو گیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے دوسرے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عورت لالٹین ایک کونے میں رکھ کر اس کے قدموں کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی اور سَر اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سردار کے بدلے ہُوئے دوستانہ رویّے نے مجھے خوف اور فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھے اس مُلک کا ایک فوجی سمجھ رہا تھا اور وقتی طور پر یہ میرے لیے بہت اطمینان بخش بات تھی۔

سردار نے مجھ سے سوال کیا: "تم اِدھر جنگل میں کیوں آئے ہو؟"

مَیں نے اتنی دیر میں اُس کے متوقّع سوالات کے جوابات سوچ لیے تھے۔ مجھے اس جگہ اور یہاں کے علاقوں کے ناموں سے کوئی واقفیت نہ تھی مگر اس کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ مَیں نے کہا۔ "سردار۔ مَیں تمہیں سلام کرتا ہوں۔ مَیں بھی تمہارا دوست ہوں" مَیں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ تھامنے میں تامّل نہیں کیا۔ "ہمارا زبان آپ جانتا۔ کیسے جانتا؟"

سردار پھر مسکرایا۔ "سردار لوگا اُدھر پڑھنے گیا تھا۔ لوگا شہر میں گیا۔ لوگا سب جانتا ہے" اُس کی بیوی نے بھی فخریہ انداز میں مسکرا کر سردار کی طرف دیکھا۔

مَیں نے اُسے بتایا کہ ہمارے ایئرپورٹ پر دُشمن نے حملہ کر دیا۔ سب کچھ برباد ہو گیا۔ زیادہ تر لوگ مارے گئے۔ مَیں ایک جیپ میں جان بچا کر بھاگا اور جنگل میں راستہ بھُول گیا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے گھیر لیا میری جیپ کو بیکار کر دیا اور مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے آئے۔ اب میں اُس کی پناہ میں ہوں اور اُسے اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہوں۔

میری گفتگو نے سردار کو متاثر کیا اور وہ مجھے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اُس کی بیوی بھی متاثر نظر آتی تھی۔ "لوگا سرکار کا دوست ہے۔" وہ اُٹھ کر میرے پاس آگیا اور میرے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مار کر بولا۔ "اب تم اِدھر ہمارے مہمان ہو۔ ہم تمہاری مدد کرے گا۔ تمہیں واپس بھیج دے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

یہ واپس بھیجنے والی بات مجھے پسند نہ آئی مگر میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ سردار لوگا شہر میں آتا جاتا رہا تھا اس لیے شہری بول چال اور طور طریقوں سے واقف تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اپنے باپ کی خواہش کے برعکس وہ شہر میں آتا جاتا رہا اور شہر کے لوگوں سے اس کا میل جول رہا۔ اُس نے تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر جو اُستاد اُسے پڑھانے کے لیے جنگل میں لایا گیا تھا ایک روز جنگلی زندگی سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے بستی سے بھاگنے کی کوشش کی اور ایک جنگلی پہریدار نے اُسے ہلاک کر دیا۔ اِس طرح سردار لوگا کی تعلیم نامکمل ہی رہ گئی۔ اِس کا بُوڑھا باپ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جنگلی قبیلے کا ہونے والا سردار کسی شہری سکول میں تعلیم حاصل کرے۔ وہ یوں بھی تعلیم کے حق میں نہیں تھا اور اسے ایک بیکار اور فضول شے سمجھتا تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ جنگی اور جنگلی زندگی کے مطالعے کو زیادہ ضروری اور اہم سمجھتا تھا۔ شجاعت کے کارنامے، تیر اندازی، جنگ و جدل اور اس قسم کے دوسرے مردانہ مشغلے اِس کے نزدیک تعلیم سے زیادہ ضروری تھے۔ سردار لوگا کے باپ چاعی کو مرے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی بائیس بیویاں تھیں جو اس کے مرنے کے بعد جنگلیوں کے رواج کے مطابق اس کے بھائیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ لوگا کی ماں مر چکی تھی۔ وہ سردار چاعی کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ویسے بھی اپنی جواں مردی کے لیے مشہور تھا اس لیے باپ کے مرنے کے بعد لوگا کو سردار بننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ جس وقت بُوڑھا سردار مرا اس وقت لوگا کی صرف دو بیویاں تھیں مگر یہ بات ایک جنگلی سردار کی شایانِ شان نہ تھی کہ وہ محض دو بیویوں پر گزارہ کرے اس لیے اگلے دو سال میں اِس کی بیویوں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ اپنی سرداری کا رُعب داب برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم از کم بائیس بیویوں کا شوہر ضرور بن جائے ورنہ جنگلی اِس کو باپ کے مقابلے میں کمتر سمجھتے رہیں گے۔

کچھ دیر ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور اِس دوران میں مجھے اس جنگلی قبیلے اور اس کے سردار کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ ہماری گفتگو کے دوران میں اُس کی بیوی نیرا بالکل خاموش رہی۔ وہ ہماری باتیں سُن رہی تھی مگر صاف ظاہر تھا کہ ایک لفظ بھی اُس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ جنگلی بول چال کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتی تھی۔ دوسرے جنگلیوں کا بھی یہی حال تھا۔ سردار لوگا شہری زبان خاصی روانی سے بول لیتا تھا جو اُس کے اُستاد کی صحبت کا اثر تھا۔ اپنے شہری اُستاد کی شاگردی میں اُس نے شہر والوں کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں سُنی تھیں اور اُن کے بعض رواج بھی اپنائے تھے جس کی وجہ سے اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ بُزدل اور کاہل ہو گیا ہے۔ بُوڑھے سردار کو یقینِ کامل تھا کہ اگر لوگا کچھ اور شہری انداز سیکھ گیا تو پھر وہ سرداری کے قابل نہیں رہے گا۔ ہم باتیں کر رہے تھے مگر میرے پیٹ میں بھوک سے چوہے دوڑ رہے تھے۔ سردار لوگا نے مہمان سمجھ کر میرے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا تھا۔ دوستوں کی طرح مجھ سے باتیں کی تھیں۔ مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ مجھے کوئی چوٹ یا زخم تو نہیں آیا مگر کھانے کے بارے میں اُس نے ایک بار بھی دریافت نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو سردار یکلخت اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "دوست۔ اب تم آرام کرو۔ نیرا تمہیں رہنے کی کُٹیا دکھائے گی۔" اس کے بعد اُس نے نیرا کو مخاطب کر کے جنگلی زبان میں کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالٹین اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس بات کی منتظر تھی کہ میں اس کی رہبری میں چلوں۔ میں نے ایک بار پھر سردار کا شکریہ ادا کیا اور نیرا کے پیچھے پیچھے روانہ ہُوا مگر دروازے کے پاس پہنچ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے رُک کر سردار کی طرف دیکھا۔ نیرا بھی رُک گئی تھی۔ سردار لمبے لمبے ڈگ بھر کر میرے پاس آ گیا اور سوال طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "سردار۔ میں بہت بھوکا ہوں۔ کیا سونے سے پہلے کھانا ملے گا؟"

سردار مُسکرایا اور پھر اس نے نیرا سے کوئی بات کی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس نے نیرا کو میرے سوال کے بارے میں بتایا ہے کیونکہ وہ بھی مجھے مُسکرا کر دیکھنے لگی تھی۔

"تم نیرا کے ساتھ جاؤ۔" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر نرمی سے بولا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نیرا کے ساتھ میں سردار کی جھونپڑی سے باہر نکل کر اُس طرف بڑھا جدھر چند اور جھونپڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ نیرا مجھے آخری کونے والی جھونپڑی کے پاس لے گئی۔ دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر اُس نے لالٹین ہاتھ سے رکھ دی اور پرنام کرنے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر زیرِ لب چند الفاظ کہے۔ پھر وہ ایک طرف کو ہو گئی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے جھونپڑی کے اندر جانے کے لیے کہا۔ میں جھونپڑی میں داخل

ز نیرا لالٹین سمیت غائب ہو چکی تھی۔ میں نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ یہ سردار کی جھونپڑی سے چھوٹی تھی مگر پھر بھی بستی کی دوسری جھونپڑیوں کے مقابلے میں کافی بڑی جھونپڑی تھی۔ فرش کچی مٹی کا تھا مگر ایک طرف چٹائی اور پیالی بھی پڑی ہوئی تھی۔ درختوں کے تنے کا کوئی فرنیچر اس جھونپڑی میں موجود نہیں تھا۔ ایک طرف چند جانوروں کی کھالیں اور مٹی کے ایک دو برتن پڑے تھے۔ دوسرے گوشے میں کچھ اور سامان بھی پڑا تھا جو میرے نزدیک کاٹھ کباڑ تھا مگر ہو سکتا ہے وہ اِن جنگلیوں کے لیے مُفید اور کارآمد چیزیں ہوں۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں دیا ٹمٹما رہا تھا جو روشنی کا واحد ذریعہ تھا۔

میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ کافی تھکا ہوا تھا اور ذہنی کشمکش میں مُبتلا رہا تھا اس لیے اعصاب بھی تھک گئے تھے۔ شدید بُھوک اور اجنبی مقام کے خطرات کے باوجود تھکن کی وجہ سے بہت جلد میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں نہ جانے کتنی دیر سوتا رہا۔ یکایک جسم سے کسی ملائم چیز کے مَس ہونے سے میری آنکھ کُھل گئی۔ میری نیند اتنی گہری اور بے خبری کی تھی کہ پہلے تو مجھے یہ احساس ہی نہیں ہُوا کہ میں کہاں ہوں؟ مگر پھر جھونپڑی کی چھت میری آنکھوں کے سامنے نظر آئی تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں گھبرا کے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ کے نزدیک ہی ایک سیاہ رنگ کی بلّی کھڑی تھی۔ وہ بار بار اپنے روئیں دار جسم کو میرے ہاتھ سے رگڑ رہی تھی اور یہی وہ لمس تھا جس نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ پھر مجھے ایک زنانہ ہنسی کی کھنکتی ہُوئی آواز سُنائی دی۔ میں نے چونک کر دوسری طرف سر اُٹھایا تو وہاں ایک سیاہ فام عورت نظر آئی جو اپنے ہاتھ میں مٹی کا ایک برتن اُٹھائے ہُوئے کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا رنگ بالکل ہی سیاہ تھا۔ سیاہ بال کمر تک پھیلے ہُوئے تھے۔ آنکھوں کی سفید پُتلیوں اور دانتوں کے سوا اس کے جسم کی ہر چیز سیاہ تھی۔ اس کے دانت موتیوں سے زیادہ آب دار اور خوبصورت تھے۔ وہ ہنس رہی تھی جس کی وجہ سے مجھے دانتوں کی لڑی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ درازقامت اور متناسب جسم کی جوان عورت تھی اور نیرا ہی کی طرح کا جنگلی لباس پہنے ہُوئے تھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے اِس سے پہلے زندگی میں اتنی سیاہ فام مگر خوبصورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کے نین نقش تیکھے اور دلکش تھے اگر اس کا رنگ گورا یا سانولا ہوتا تو وہ دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار کی جا سکتی تھی مگر اس وقت بھی اِس کی رعنائی اور دلکشی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا وہ کچھ دیر مترنم آواز میں ہنستی رہی اور پھر بلّی کو ڈانٹنے کے انداز میں آگے بڑھی جو ابھی تک میرے آس پاس منڈلا رہی تھی اور اس کے مُنہ سے خرخر کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ سیاہ فام عورت نے ہاتھ میں تھامے ہوئے برتن میرے سامنے چٹائی پر رکھ دیئے اور بڑھتے ہوئے بلّی کو گود میں اُٹھا کر سہلانے لگی۔ میرا دھیان عورت اور بلّی سے زیادہ برتنوں کی طرف لگا ہُوا تھا جس میں سے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ بے اختیار ہو کر میں نے ان پر ڈھکے ہوئے پتے ہٹائے۔ ایک برتن میں بُھنا ہُوا گوشت تھا اور دوسرے میں ترکاری قسم کی چیز تھی۔ اِس کے سوا روٹی یا کوئی اور چیز موجود نہ تھی۔ میں کھانے پر پل پڑا اور اُس وقت تک کسی اور طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا جب تک کہ برتنوں میں کھانا ختم نہیں ہو گیا۔ اس کام میں چند منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگی۔ عورت پھر مُسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے جُھک کر فرش پر سے خالی برتن اُٹھائے اور جنگلی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ میں اُس کا مطلب تو نہ سمجھ سکا مگر اتنا ضرور جان گیا کہ شاید وہ میرے بے تحاشہ کھانے پر کوئی فقرہ چُست کر رہی تھی۔ بلّی کو اُس نے گود سے اُتار دیا تھا اور وہ پھر میرے گرد منڈلا رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پہلے نیرا لالٹین کے ساتھ نمودار ہُوئی اور اُس کے بعد سردار کا باوقار سراپا نظر آیا۔ اُس نے سیاہ فام عورت سے کچھ کہا اور اس کا جواب سُن کر مُسکرایا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہُوا۔ "پیٹ بھر گیا؟"

میں نے سر ہلایا اور اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"کھانا اچھا تھا؟" اُس نے پُوچھا۔

میں نے کھانے کی تعریف میں بُخل سے کام نہیں لیا۔ یہ سچ ہے کہ اتنی شدید بُھوک میں کھایا ہُوا یہ کھانا مجھے دُنیا کی لذیذ ترین خوراک لگی تھی۔ سردار نے دونوں ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ نیرا اور وہ عورت دونوں جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے سیاہ بلّی بھی کاہلی سے دُم ہلاتی ہوئی رُخصت ہو گئی۔ سردار نے جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھا ہُوا مٹی کا پیالہ اُٹھا کر ایک برتن میں سے پانی انڈیل کر مجھے پیش کیا اور میرے برابر بیٹھ گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ "سردار لوگا۔ کھانا بہت مزیدار تھا۔ آپ کی نوکرانی نے پکایا تھا؟"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "دوست۔ اِدھر جنگل میں نوکر لوگ نہیں ہوتا۔ سب لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں۔"

"مگر آپ کا کام کون کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "آپ تو سردار ہیں۔"

"ہمارا بیوی لوگ کرتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ ہماری گیارہ بیویاں ہیں۔"

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ بات وہ پہلے بھی مجھے بتا چکا تھا۔

"نیرا کو تم نے دیکھ لیا۔ گوچی بھی ہمارا بیوی ہے۔ یہ کھانا اُس نے بنایا تھا۔"

"گوچی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ یہ گوچی تھی۔ اِس کی بلّی ہر وقت اِس کے ساتھ رہتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ "گوچی بھی بلّی جیسی ہے۔ کالی کالی — کومل کومل۔"

پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں بھی احتراماً اُس کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ "دوست۔" اُس نے اچانک پوچھا۔ "تمہارا نام کیا؟"

میں اِس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سٹپٹا کر رہ گیا۔ "میرا نام؟! میرا نام راجو ہے۔" مجھے اس کے سوا کوئی اور نام جلدی میں نہیں سُوجھا۔

"دیکھو راجو۔" وہ دوستانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم ہمارے مہمان ہو۔ اِدھر ہم جنگلی لوگ مہمان پر اپنی جان بھی وار دیتے ہیں۔ ہماری ہر چیز مہمان کے لیے ہے۔ اب تم آرام کرو گے؟"

ظاہر ہے۔ اِس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سردار لوگا کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے پناہ دی اور میری مہمان داری کی۔

"یہ تو تمہارا ادھیکار ہے دوست۔ مہربانی کی بات نہیں ہے۔" وہ دروازے کی طرف رُخ کیے ہُوئے کھڑا تھا۔ یکایک اُس نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور تالی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے جھونپڑی میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ پہلے نیرا اندر داخل ہوئی۔ اِس کے بعد ایک اور عورت آئی۔ تیسرے نمبر پر گوچی آئی۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے اور بھی عورتیں آئیں۔

وہ تعداد میں کُل گیارہ تھیں۔ میں اُنہیں دلچسپی اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب اندر آ کر میرے اور سردار کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ سب سردار لوگا کی بیویاں تھیں۔ سردار نے باری باری ان میں سے ہر ایک کا نام بتا کر تعارف کرانا شروع کر دیا۔ میں اِن کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کہنے کو وہ سب جنگلی تھیں مگر رنگ اور ناک نقشے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی مختلف تھیں۔ نیرا سانولے رنگ کی تھی۔ جبکہ گوچی سیاہ فام تھی۔ دو عورتیں خاصے گورے رنگ کی تھیں۔ تین عورتیں دیکھنے میں نیپالی یا بھوٹانی لگتی تھیں۔ باقی کے نقش و نگار چینی، جاپانی اور فلپائنی ٹائپ کے تھے۔ اِن کی رنگت بھی زردی مائل سُرخ تھی۔ چہرے چوڑے ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی مگر چمکدار — اگرچہ ان سب کے انداز الگ الگ تھے مگر ایک بات اِن سب میں مشترک تھی۔ وہ سب دیکھنے میں خوش شکل، صحت مند اور دلکش عورتیں تھیں اور خوش مزاج بھی معلوم ہوتی تھیں اس لیے کہ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر شوخی سے مُسکراتی اور نظر بازی کرتی رہیں۔ سردار ایک ایک کا نام مجھے بتاتا رہا اور میں احتراماً سر جھکا کر سلام کرتا رہا۔ میرے اس انداز پر بھی وہ مُسکراتی رہیں۔ تعارف کی رسم ختم ہوئی تو کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی مگر بائیس آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے پریشان ہو کر سردار کی طرف دیکھا۔ وہ مُسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر دوستانہ لہجے میں بولا۔ "راجو۔ تمہیں کون اچھی لگتی ہے؟"

میں کیا جواب دیتا۔ اخلاقاً بولا۔ "سبھی اچھی ہیں سردار۔ تم بہت قسمت والے ہو۔ تمہیں اتنی اچھی بیویاں ملی ہیں۔"

"ہمارا باوا ہم سے زیادہ قسمت والا تھا۔ اُسے مجھ سے زیادہ بیویاں ملی تھیں اور سب بہت اچھی تھیں۔ پرا تھنا کرو کہ میرے کو باقی بیویاں بھی اچھی ملیں۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تمہاری آشیرواد سے اوش ملیں گی دوست۔ اچھا تم بولو۔ کون سی تمہیں سب سے بڑھ کر اچھی لگی ہے۔ وہی تمہاری سیوا کیلئے جھونپڑی میں رہے گی۔"

میں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "میری سیوا کے لیے؟"

"ہاں۔ یہ ہمارا رواج ہے راجو۔ مہمان کی سیوا کے لیے بیوی بھی بھینٹ کر دیتے ہیں۔ جب تک تم مہمان رہو گے تم جسے چاہو گے وہ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھے گی۔"

میں نے نیپال کے بعض علاقوں کے قبائل کے متعلق تو یہ ضرور سُنا تھا کہ وہ اپنے مہمانوں کی خاطر کے لیے اپنی بیوی بھی پیش کر دیتے ہیں۔ ٹنڈرا کے بعض سکیمو لوگوں میں بھی ایسا ہی رواج ہے مگر یہ جان کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس جنگلی قبیلے میں بھی ایسا ہی رواج ہے۔ سردار اور اُس کی بیویاں خاموش مجھے تک رہی تھیں۔ وہ سب میرے جواب کے منتظر تھے۔

میں نے کہا۔ "نہیں سردار لوگا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیا کہا؟" سردار غصّے بھری آواز میں گرجا اور پھر ناراضگی سے جنگلی زبان سے اپنی بیویوں سے مخاطب ہُوا۔ اِن سب کے چہروں پر بھی خفگی اور غصّے کے تاثرات نمودار ہو گئے۔

"راجو۔" سردار بلند آواز میں بولا۔ "تم سردار لوگا کا اپمان کر رہے ہو۔ کیا میری بیویاں اچھی نہیں ہیں۔ سُندر نہیں ہیں۔؟"

"یہ بات نہیں ہے سردار لوگا۔ تمہاری سب بیویاں بہت اچھی ہیں۔"

"تو پھر تم اُنہیں سویکار کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھو سردار۔ ہمارے ہاں شہروں میں یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ ہم جس کے گھر مہمان ہوتے ہیں اُس کی بیوی اور ماں بہنیں ہماری اپنی ماں بہنوں کی طرح ہوتی ہیں۔ عزت کے قابل ہوتی ہیں۔"

"مگر یہ تمہاری ماں بہنیں نہیں ہیں۔ یہ سردار لوگا کی بیویاں ہیں اور تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے جنگل کا چلن دوسرا ہے راجو۔ سردار کے لیے اس سے بڑا اپمان اور کوئی نہیں ہے کہ اُس کا مہمان اُس کی کسی بیوی کو سیوا کے لیے سویکار نہ کرے۔ جب دوسرے لوگ سُنیں گے تو بہت ہنسی کی بات ہو گی۔ سردار لوگا اور اُس کی بیویاں کسی کو مُنہ نہیں دکھا سکیں گی۔ یاد رکھو۔ میں تمہیں اپمان کی اچھیا نہیں کرنے دوں گا راجو۔ میں نے تمہیں اپنا دوست کہا ہے۔ پر تم میرے ویری بن جاؤ گے۔"

میں حیرت اور پریشانی سے اس کا مُنہ تک رہا تھا۔ خدایا کس مصیبت میں پھنس گیا۔ سردار کی مہمانداری تو ایک عذاب بن گئی۔

"راجو۔ کیا سوچتے ہو؟" وہ برہمی سے پوچھنے لگا۔ "اپنی جان پیاری نہیں ہے تمہیں؟" اُس کا ہاتھ کمر میں بندھے ہُوئے خنجر کی طرف بڑھنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ میں تمہیں ناراض نہیں کروں گا سردار۔ یہ تو میری عزت افزائی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے۔ میرے کرم کُھل گئے ہیں۔ مجھے معاف کرو۔ میں نے اپنے مُلک کے رسم و رواج کی وجہ سے تمہارا دل دُکھایا۔"

سردار بے اختیار ہنسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیویوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ سب ہنستے رہے اور میں تصویرِ حیرت بنا اُنہیں دیکھتا رہا۔ سردار کی ہنسی رُکی تو اُس نے سامنے کھڑی ہُوئی گیارہ بیگمات کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا اور پوچھنے لگا۔ "تم ان میں سے کِسے سویکار کرو گے؟"

میں نے گھبرا کر نیرا کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔ سردار نے مطمئن ہو کر مجھے دیکھا اور تیزی سے جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ نیرا سمیت اُس کی تمام بیویاں بھی اُس کے پیچھے پیچھے رُخصت ہو گئیں اور جھونپڑی میں سناٹا چھا گیا۔ اب میں تھا اور میری تنہائی۔ یا پھر یہ تصور کہ اب کیا ہو گا؟ کافی دیر گزر گئی۔ میں پہلے جھونپڑی میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ شاید یہ سب ایک ڈرامہ تھا اور غالباً سردار کو میری آزمائش مقصود تھی۔ یہ سوچ کر میں نے سکون کی ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی دانائی اور طبعی شرافت پر اپنے آپ کو داد دی کہ میں سردار کی آزمائش پر پُورا اُترا۔ اگر میں فوری طور پر سردار کی پیشکش قبول کر لیتا تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی آنکھوں میں اپنی وقعت کھو

www.pdfbooksfree.pk

بیٹھتا اور بہت ممکن ہے کہ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔ چہار سُو خاموشی کا راج تھا سوائے جنگلی جانوروں کی آوازوں کے جو گاہے بگاہے جنگل کے سکوت میں خلل انداز ہو جاتی تھیں ورنہ جھینگروں کی آوازوں اور ہَوا کی سنسناہٹ کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے دل میں یہ خیال مضبوطی سے جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ سردار نے واقعی میرا امتحان ہی لیا تھا یا مجھ سے مذاق کیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے اعصاب اور ذہن مکمل طور پر پُرسکون ہو گئے۔ کافی عرصے کی بھوک اور جسمانی اور ذہنی مشقت کے بعد پیٹ بھر روٹی اور دقتی سکون میسر آیا تھا۔ اس لیے ایک بار پھر میرا دماغ اور آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور میں دبے پاؤں نیند کی وادیوں میں گامزن ہو گیا لگا مگر ابھی پوری طرح سونے نہ پایا تھا کہ پہلے ایک سرگوشی اور پھر پاؤں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں ہڑبڑا کر چٹائی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کے دروازے میں ایک سایہ سا لہرایا اور پھر ایک انسانی ہیولا نمودار ہوا۔ میں یک لخت تیزی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میرا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ریوالور نکالتا جھونپڑی میں داخل ہونے والا ہیولا انسانی پیکر اختیار کر چکا تھا ــــ میرے سامنے نیرا کھڑی تھی۔ سردار بوگا کی بیوی نیرا، جسے میں نے سردار کی جھونپڑی سے لالٹین تھام کر سردار کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک مختلف عورت تھی۔ سادہ اور میلے کچیلے لباس کی جگہ وہ اب صاف ستھرا چمکدار لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی۔ لباس بڑے حصوں میں منقسم تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ بطورِ خاص جگمگاتا ہوا لباس پہن کر آئی ہے۔ اس کے بال اب بھی کمر تک پھیلے ہوئے تھے مگر اس وقت بالوں میں تیل کی چمک زیادہ نمایاں تھی، جس کی وجہ سے ان میں گہری سیاہی پیدا ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے گلے میں پھولوں کا ایک ہار پہن رکھا تھا جبکہ بازوؤں پر سیاہ چمڑے کی تنگ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور بازو بند کا تاثر دے رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے کی سادہ سی نیرا اور اس وقت کی سجی بنی نیرا میں بہت فرق تھا۔ اس کی چال میں لچکیلا پن اور زیادہ پیدا ہو گیا تھا۔

جھونپڑی میں داخل ہو کر وہ ایک لمحے کے لیے رُک گئی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے بڑے سبز پتوں کی ٹوکری میں سے گیندے کے پھول نکال کر اُس نے اپنے اور میرے درمیان بکھیر دیئے۔ پھر وہ دلفریبی سے مسکرائی اور آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ میں غیرارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک پیدا ہوئی اور وہ اپنی جگہ رُک گئی۔ میرا ذہن بہت تیزی سے پلٹیاں کھا رہا تھا۔ جسم میں عجیب قسم کی سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ خوف، پریشانی، گھبراہٹ اور بے یقینی کی ملی جُلی کیفیت نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ میرے سامنے نیرا مجسم میزبان بنی کھڑی تھی اور میرا وہ اندازہ غلط ثابت ہو چکا تھا کہ سردار بوگا نے محض میرے کردار اور خلوص کی آزمائش کے لیے اپنی کسی ایک بیوی کی خدمات پیش کی تھیں۔ نیرا کے چہرے کا تبسم غائب ہو چکا تھا اور اُس کی جگہ غصہ اور جھلاہٹ کا تاثر نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے جذبات اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ میں نیرا کو اور اُس کے ذریعے سردار کو ناراض کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے جواباً مسکرایا اور نیرا کا خیرمقدم کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ اس کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ پھر لوٹ آئی۔ وہ ہنستی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ پہلی بار مجھے ایک خوشبو کا احساس ہُوا جو نیرا کے بدن یا لباس سے اُٹھ رہی تھی۔ یہ پسینے اور پھولوں کی ملی جُلی خوشبو تھی۔ اس میں شاید سر کے تیل کی خوشبو بھی شامل تھی۔ ہم متمدن علاقوں کے رہنے والوں کے لیے وہ خوشبو نہ تھی مگر جنگل کے معیار کے مطابق نیرا اس وقت قیمتی خوشبو میں نہائی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسے مخاطب کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بولی سے نابلد تھے۔ اس کے باوجود نیرا نے جنگل کی روایات کے مطابق مجھ سے گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ جنگلی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اُس کے لہجے میں سوال کا عنصر زیادہ تھا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی سوال دریافت کر رہی تھی یا ممکن ہے وہ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ مجھے کسی چیز کی حاجت تو نہیں ہے۔ میں چپ چاپ اس کا چہرہ تکتا رہا اور پھر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر بڑھ کر میرے نزدیک بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنتے رہے۔ کاش ہم ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوتے اور میں اسے سمجھا سکتا کہ مہمان داری کے مہذب طریقے کیا ہوتے ہیں؟

آہستہ آہستہ میں چٹائی پر دراز ہو گیا۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا اور میں عجیب قسم کی بے کلی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

نیرا خاموشی سے کھسک کر میرے نزدیک آ گئی اور اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھ دیا۔ شاید عورتوں کی مخصوص حِس نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس کا ہاتھ گرم تھا، مگر نرم نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جنگل کی سخت کوشی اور محنت مشقت سے بھرپور زندگی گزارنے والی عورت کا ہاتھ شہر کی آرام طلب اور سنگھار کرنے والی عورتوں کی مانند ملائم اور شگفتہ کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اُس نے پہلے میرا سر سہلایا اور پھر آہستہ سے میری پیشانی اور کنپٹی سہلانے لگی۔ بے شک وہ ایک جنگلی عورت تھی۔ مگر سر دبانے کے فن سے پوری طرح آشنا تھی۔ یکایک وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا تو وہ بڑھ کر مٹی کے دیئے کے پاس پہنچ گئی۔ ایک ہاتھ سے دیئے کو اُٹھا کر اُس نے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں تھوڑا سا تیل اُنڈیلا اور پھر میرے پاس آ گئی۔ جب اُس نے میرے سر پر تیل لگایا تو وہ نیم گرم تھا۔ اس کے باوجود مجھے سکون اور طمانیت پہنچا رہا تھا۔ اَب وہ میرے سر میں دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں اور پوروں سے مالش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ کر زیرِ لب مسکراتی بھی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے مُنہ سے ہلکی سی آواز بھی نکلتی جیسے کوئی گیت گنگنا رہی ہو۔ یہ تمام چیزیں مل کر مجھ پر ہپناٹزم کا اثر مرتب کر رہی تھیں۔ ایک بار پھر مجھے غنودگی کا احساس ہونے لگا اور میں رفتہ رفتہ نیند کی آغوش میں گم ہو گیا۔ نہ جانے یہ کیفیت کتنی دیر باقی رہی۔ اچانک ایک دبی دبی چیخ کی وجہ سے میری آنکھ کھُل گئی۔ میں نے دیکھا کہ نیرا ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ہے اور سہمی ہوئی نظروں سے باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خوف نے ڈیرہ جما لیا تھا اور وہ ڈری ہوئی جنگلی ہرنی کی طرح بے تابی سے جھونپڑی میں گھوم رہی ہے۔ کبھی وہ دروازے کی طرف بڑھتی اور پھر خود ہی رُک جاتی۔ میری طرف دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتی اور دوبارہ میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ مجھے باہر کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے خاموشی سے کان لگا کر سُنا تو نہایت مدھم آہٹوں کی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے بہت دُور ڈھول بج رہے ہوں۔ مجھے کان لگا کر سُنتے ہوئے پایا تو نیرا میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ اور میرا چہرہ تکنے لگی۔ میری تمام تر توجہ اس آواز کی طرف تھی جو رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میں کافی فاصلے پر ڈھول کی واضح آوازیں سُننے کے قابل ہو گیا۔

ایک دم فضا میں مختلف آوازیں گونجنے لگیں، لوگوں کے بولنے کی، ایک دوسرے کو پکارنے کی اور اطلاع دینے کی آوازیں اگرچہ میں سمجھ نہیں سکتا تھا مگر میں اِن کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ سارا جنگل جو کچھ دیر پہلے خاموشی کی چادر میں لپٹا ہُوا تھا یک بیک جاگ اُٹھا۔ نیرا کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار جھونپڑی کے دروازے کی طرف جاتی اور پھر رُک جاتی۔ پلٹ کر میرے نزدیک آتی اور مجھے مخاطب کر کے کچھ بتانے کی کوشش کرتی۔ میں صرف اتنا اندازہ لگا سکا کہ وہ کسی پریشان کُن بات کی طرف مجھے متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ پھر وہ میرے پاس آ کر میرا ہاتھ تھام کر مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگی۔ میں حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا اور چپ چاپ اس کی خواہش کے مطابق آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نہیں نکلنے پائے تھے کہ تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور سردار بوگا جھونپڑی میں داخل ہُوا۔ وہ بے حد مضطرب اور پُرجوش نظر آ رہا تھا۔

"راجو، کچھ سُنا تم نے۔ وہ کاٹو آ رہے ہیں۔ وہ ہمارے جنم جنم کے بیری ہیں"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا "کون آ رہے ہیں؟"

"جنگلی آدم خور"

"آدم خور؟!" میں نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ وہ بہت دُور جنگل میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کٹھور لوگ ہیں۔ وہ آدمی کا گوشت کھاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ ظالم ہیں"

اس اثناء میں نیرا سردار کے اشارے اور حکم پر جھونپڑی سے باہر چلی گئی تھی۔ سردار نے اپنی زبان میں جلدی جلدی اسے کچھ ہدایات دی تھیں جنہیں سُن کر وہ دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں سردار کی اس اطلاع پر حیران کھڑا اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اُس نے میرا بازو تھام لیا اور کہنے لگا۔ "راجو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے لیے تم اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میں ایک جوان تمہارے ساتھ کر دیتا ہوں۔ تم اِدھر سے بھاگ کر چلے جاؤ" یہ کہہ کر اُس نے زور سے تالی بجائی اور کسی کو پکارا۔ ایک جنگلی اندر داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں تیز دھار والا بھالا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

تیر کمان اُس کے کندھے سے لٹک رہا تھا اور وہ بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سردار نے تیزی سے اسے کچھ ہدایات دیں جن کے جواب میں وہ سَر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میری طرف بڑھا اور میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔

"سردار یہ سب کیا تماشا ہے؟" مَیں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور سردار کی طرف بڑھا۔ "مجھے بتاتے کیوں نہیں یہ کیا گڑبڑ ہو رہی ہے۔ مجھے تم کہاں بھیجنا چاہتے ہو؟"

"بہت دُور جدھر تمہاری جان بچ جائے گی۔"

"مگر میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مَیں ایک فوجی سپاہی ہوں۔ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔ اپنے دُشمن سے لڑ سکتا ہوں۔"

"وہ دُشمن خونی ہیں راجو۔ وہ لوگ بھیڑیئے سے زیادہ ڈراؤنے ہیں۔"

میرے اصرار پر سردار نے مختصر طور پر مجھے بتایا کہ کافی فاصلے پر گھنے جنگلوں میں ایک قبیلہ تورائی رہتا ہے۔ یہ لوگ محض نام کے انسان ہیں۔ انسانوں والی کوئی عادت اور خصلت ان میں نہیں پائی جاتی۔ وہ جانوروں اور انسانوں سب کا شکار کرتے ہیں اور انہیں کھا جاتے ہیں۔ جب بھی اُنہیں موقع ملتا ہے وہ آس پاس کے جنگلوں میں رہنے والے قبائل پر حملہ کرتے ہیں۔ اُن کی بستیاں جلا دیتے ہیں۔ ان کا سامان لُوٹ لیتے ہیں۔ اُن کے مویشیوں اور تندرست جوان عورتوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ جوان مردوں، بچّوں اور بوڑھوں کو ہلاک کر دیتے ہیں اور پھر اُنہیں خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس بار کئی سال کے بعد اُنہوں نے اِدھر کا رُخ کیا ہے۔ ان سے محفوظ رہنے کیلئے جنگلیوں نے پہریداری کا نظام قائم کر رکھا ہے ساتھ ہی جنگلوں میں جگہ بہ جگہ ایسے مخبر بھی چھوڑ رکھے ہیں جو اُن کی آمد سے خبردار کر دیتے ہیں۔ اگر دن کی روشنی ہو تو وہ آگ جلا کر دھوئیں کے ذریعے خبردار کر دیتے ہیں اور اگر رات کا وقت ہو تو وہ ڈھول بجا کر اطلاع پہنچاتے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر موجود پہریدار جواب میں خود بھی ڈھول بجاتے ہیں اور اس طرح یہ خبر سارے جنگل میں بستی اور آبادی تک پہنچ جاتی ہے۔ مخبر کی زندگی ہردم خطرے میں رہتی ہے اور اکثر اوقات سب سے پہلے یہی لوگ ان آدم خوروں کا نشانہ بنتے ہیں۔

مَیں حیرت سے سردار لوگا کی بیان کی ہوئی داستان سُن رہا تھا اور مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دَور میں شہروں اور تہذیب یافتہ بستیوں اور آبادیوں سے کچھ فاصلے پر ایسے قبائل کی موجودگی ہی میرے لیے کم حیرت انگیز نہ تھی لیکن آدم خوروں کے بارے میں یہ داستان سُن کر تو مَیں ساکت ہی رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار سے کیا کہوں؟ اسے تسلّی دوں یا ان جنگلوں کو خیرباد کہہ کر کہیں اور جا کر آباد ہونے کا مشورہ دوں؟

بالآخر جب میری قوتِ گویائی بحال ہوئی تو مَیں نے پُوچھا۔ "سردار لوگا تم شہر میں رہ چکے ہو، وہاں آتے جاتے بھی رہتے ہو۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم اِس جنگل میں کیوں رہتے ہو؟ حیوانوں جیسی زندگی کیوں بسر کرتے ہو؟ شہر میں کیوں آباد نہیں ہو جاتے؟"

سردار کا جواب بہت مختصر تھا۔ "جوان تم بہادر ہو۔ اتنی بات کیوں نہیں سمجھتے۔ سردار لوگا اپنے قبیلے کے لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟"

"تم ان لوگوں کو بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے جو یہ لوگ بسر کر رہے ہیں۔ آج کے زمانے میں انسان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ انسان فلک اور چاند تک پہنچ گیا ہے۔ تم ان جنگلوں میں جانوروں کی طرح کیوں رہتے ہو۔ ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ شہروں میں یہ زیادہ اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

سردار لوگا سخت پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تھا مگر میری یہ بات سُن کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ "راجو۔ یہ سب جنگلی لوگ ہیں۔ اُنہوں نے تو شہر بھی نہیں دیکھا۔ یہ جنگل اور اِدھر کی زندگی ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ یہ اِس جنگل کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ تو اپنی جھونپڑی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ جنگل کو کیسے چھوڑیں گے؟ اور پھر شہر میں جا کر یہ کیا کریں گے؟ شہر والوں کے لیے تو یہ جانور ہیں۔ نا بابا۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ سردار لوگا ان کا سردار ہے۔ ان کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔ یہ میرے جیون مرن کے ساتھی ہیں۔"

جنگلی اور قبائلی رسم و رواج اور ذہنیت کا یہ رُخ میرے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ اتنی دیر میں باہر سے شور کی آوازیں زیادہ بلند ہو چکی تھیں۔ دو تین جنگلی جو مقامی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس اور چاق و چوبند تھے، جھونپڑی میں داخل ہوئے اور سردار سے مخاطب

ہو کر کچھ کہتے رہے، غالباً وہ اسے اپنی تیاریوں کی اطلاع دے رہے تھے اور اُس کی مزید ہدایات کے خواہاں تھے۔ سردار نے تیزی سے اُنہیں کچھ ہدایات دیں اور اُن کے رُخصت ہونے کے بعد خود بھی باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

"تم ابھی اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں بہت دُور لے جائے گا۔ تم آدم خوروں سے بچ جاؤ گے۔"

مَیں بڑھ کر جھونپڑی کے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور سردار کا راستہ روک لیا۔ اُس نے غصّے سے گھُور کر مجھے دیکھا۔

"دیکھو سردار لوگا۔ تم بہادر آدمی ہو۔ اپنے مہمان کی جان بچانا چاہتے ہو مگر مَیں بھی ایک سپاہی ہوں۔ ڈرپوک اور بھگوڑا نہیں ہوں تم نے میری مدد کی ہے تو مَیں تمہیں مصیبت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ مَیں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ میرا جینا مرنا بھی تمہارے ساتھ ہے۔"

سردار بھونچکا ہو کر میری بات سُن رہا تھا۔ "نا۔ راجو۔ نا۔ تمہیں جانا ہو گا۔ ہمارے لیے تم کو جان خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مگر مَیں نے ضد کی اور اپنی بات پر اَڑ گیا۔ سردار کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ جب مَیں اس کی بات ماننے پر رضامند نہ ہُوا تو اس نے بھی بے کار بحث میں وقت ضائع کرنا فضول جانا۔ "تمہاری مرضی" کہہ کر وہ بھونچال کی طرح جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ وہ جنگلی جو میری رہبری اور راہنمائی کے لیے آیا تھا۔ چند لمحے حیرت سے کھڑا میرا مُنہ تکتا رہا اور پھر جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ اب میرا جھونپڑی کے اندر رہنا بھی بے مقصد تھا اس لیے مَیں بھی اُن کے پیچھے پیچھے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر مَیں نے جو سماں دیکھا وہ اُس کے منظر سے یکسر مختلف تھا جو مَیں نے اِس بستی میں آ کر دیکھا تھا۔ اس وقت ہر طرف مشعلیں روشن تھیں۔ لوگ تیزی سے مختلف کاموں اور تیاریوں میں مصروف تھے۔ تیر کمان سنبھالے جا رہے تھے۔ نیزے اور بھالے تیز کیے جا رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ سردار لوگا اِن سب کے درمیان ہدایات دینے اور دوسرے انتظامات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور تیزی سے ایک طرف سے دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس وقت وہ جھونپڑی جس میں سے پہلی بار مَیں نے سردار لوگا کو برآمد ہوتے ہوئے دیکھا تھا تمام سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ نہ صرف سردار کی گیارہ بیویاں بلکہ بستی کی دوسری عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچّے بھی یہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور بے یقینی کے تاثرات نمایاں تھے مگر مَیں نے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہاں عورتوں اور بچّوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ ایک جنگلی ایک بوڑھی عورت کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ایک طرف سے نمودار ہُوا۔ شاید وہ اُس کی ماں تھی۔ بوڑھی عورت اپنی زبان میں نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا مگر اتنا ضرور اندازہ ہُوا کہ وہ بہت غصّے میں ہے اور ناراضگی کا اظہار کر رہی ہے۔ سردار نے چیخ کر کچھ پُوچھا اور ایک نوجوان کا جواب سُن کر چلّا چلّا کر عورتوں، بوڑھوں اور اُن کے اردگرد کھڑے چار جنگلیوں کو احکامات جاری کرنے لگا جیسا کہ بعد میں پتہ چلا وہ اُنہیں یہ بتا رہا تھا کہ اگر ان لوگوں کو حملہ آوروں کے مقابلے میں شکست ہو جائے تو وہ بلا تامّل بچّوں اور بوڑھوں کو ہلاک کر دیں اور تمام نوجوان عورتوں کو سردار کی بڑی جھونپڑی میں یکجا کر کے نذرِ آتش کر دیا جائے۔ اس اعلان کو سب نے خاموشی سے سُنا۔ وہ لوگ کسی بھی تاثر سے عاری نظر آ رہے تھے۔ البتہ سردار کی بیویوں میں سے نیرا اور چوگائی نے آگے بڑھ کر سردار کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر واپس جا کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں جہاں دوسری عورتیں بھی موجود تھیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ان لوگوں میں خوف و ہراس کے باوجود بدنظمی اور انتشار نہیں تھا۔ وہ سب خاموشی سے خُدا کی رضا پر راضی برضا اور اپنے سردار کی ہدایات پر سر جھکا کر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار تھے۔

ڈھولوں کی صدائیں اب اور زیادہ بُلند ہو چکی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر آتی جا رہی تھیں۔ اتنی دیر میں جنگجو اپنی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ سردار نے بُلند آواز سے کچھ کہا۔ وہ سب قطار در قطار اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور پھر عورتوں اور بچّوں کی طرف دیکھے بغیر چلّاتے اور نعرے لگاتے ہُوئے بستی سے باہر کی طرف چل پڑے۔ سردار لوگا ایک ہاتھ میں بھالا اور دوسرے میں کُلہاڑا لیے ہُوئے ان کے آگے آگے تھا۔ وہ جرأت مندی اور بہادری کا نشان نظر آ رہا تھا اور اُس کی بے خوفی کی وجہ سے دوسرے جنگلیوں کا حوصلہ بھی بُلند تھا۔ سردار غالباً مجھے بھول چکا تھا یا پھر اُسے مجھ سے مخاطب ہونے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اِس لیے وہ میری طرف نگاہ اُٹھائے بغیر مورچہ بندی کے لیے چل پڑا اور مَیں گومگو کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ مَیں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اِس نازک موقعے پر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یہاں سے فرار ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھالوں اور تیر کمان کے استعمال کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ میرے ریوالور میں چھ گولیاں موجود تھیں

www.pdfbooksfree.pk

اور تین درجن گولیاں میری کمر کی پیٹی میں بندھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ کُل ۴۲ گولیوں سے مَیں خونخوار آدم خوروں کی فوج کو نہیں روک سکتا تھا۔

اتنی دیر میں نیرا آگے بڑھ کر میرے پاس آئی اور اپنی زبان میں بُلند آواز سے کچھ کہنے لگی۔ سردار کی دوسری بیویاں بھی میرے نزدیک آگئیں اور مَیں ان کے نرغے میں پھنس گیا۔ وہ نہ جانے مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض عورتیں بار بار ہاتھوں سے سردار کی جھونپڑی اور عورتوں اور بچوں کے جمِ غفیر کی طرف اشارہ کر رہی تھیں جبکہ نیرا گفتگو کرتے ہوئے جنگل کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ وہ چار جنگجو عورتوں کی حفاظت پر مامور تھے خاموش بُت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے مجسمے ایستادہ ہیں۔ مَیں نے تنگ آکر بُلند آواز میں ان سب عورتوں کو خاموش ہونے کے لیے کہا اور دوسرے ہی لمحے وہ سب بالکل خاموش کھڑی ہو گئیں۔ مَیں ان کے گھیرے میں سے نکل کر اس طرف دوڑا جس طرف سردار اپنے جاں بازوں کو لے کر گیا تھا۔

سردار اور اس کے سُورماؤں کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ سردار نے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے اپنے جنگجوؤں کو جمع کر دیا تھا اور وہ سب تیر کمانیں اور دوسرے ہتھیار سنبھالے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل کمربستہ کھڑے تھے۔

سردار بوگا

شہر میں تھوڑے عرصے ضرور رہا ہوگا۔ یہ اُس کی باتوں اور طور طریق سے بھی ظاہر تھا۔ دوسرے جنگلیوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ عقلمند، ذہین اور تجربہ کار تھا۔ لیکن آخر کار جنگلی تھا اور اِس وقت بھی اُس نے حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے جو تیاری کی تھی اس میں حربی صلاحیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ دو تین ٹکڑیوں میں اس کے جاں باز تیر کمان، بھالے اور نیزے سنبھالے ہوئے کھڑے تھے تاکہ دشمن کے نمودار ہوتے ہی اُس پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ لوگ بستی سے زیادہ دُور بھی نہ تھے جو جنگی اصولوں کے اعتبار سے بالکل غلط اور نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ ایک ہی ہلّے میں دُشمن اُن کی بستی تک پہنچ سکتا تھا، چنانچہ مَیں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور سردار بوگا کے پاس گیا۔ "سردار! وقت بہت کم ہے اور مَیں تم سے ایک چھوٹی سی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو؟" اُس نے حیران ہو کر جواب دیا۔

"سردار! مَیں فوجی سپاہی ہوں، ساری زندگی جنگ لڑنے کی ترکیبیں سیکھی ہیں مَیں نے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو مَیں تمہیں ایک رائے دوں؟"

سردار نے گھور کر مجھے دیکھا "دیکھو جوان۔ مَیں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں سے دُور چلے جاؤ۔ اگر وہ راکھشس لڑائی میں جیت گئے تو پھر ہم سب کے ساتھ تمہاری بھی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ تم نے میری بات نہیں مانی اور اب مجھے مشورہ دینے آگئے ہو۔"

"سنو سردار۔ اب تو جو تمہارا حال ہوگا وہی میرا بھی ہوگا۔ ہماری تقدیر ایک ہو گئی ہے۔ اس لیے غصّہ تھوک دو۔ بولو۔ میری بات مانو گے؟"

"بولو۔ کیا کہتے ہو۔ وقت کم ہے۔ تم ڈھول کی آواز سُن رہے ہو کس قدر قریب آگئی ہے۔"

سردار کو رضامند پا کر مَیں نے فوراً اُسے میدانِ جنگ کی تربیت دینے کا منصوبہ بتانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو مَیں نے یہ کہا کہ ان لوگوں کو اپنے دفاعی مورچے بستی سے دُور بنانے چاہئیں۔ بستی کی حفاظت کے لیے دو چار اور لڑاکے بھی چھوڑے جا سکتے ہیں۔ ہمیں جلد سے جلد بستی سے بہت آگے اور دُور جا کر دُشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ سردار ایک لمحہ سوچنے کے بعد راضی ہو گیا۔ اُس نے چار اور جنگلیوں کو بستی کی حفاظت پر مامور کیا اور پھر میری ہدایت کے مطابق سب لوگ قریباً ایک فرلانگ آگے بڑھ گئے۔ ہمارے پیچھے بستی تھی اور بہت گھنے جنگل تھے۔ میرے کہنے کے مطابق جنگل میں درختوں پر تیر انداز بٹھا دیئے گئے۔ اِن لوگوں کے نشانے بہت اچھے تھے اور اُن کے تیر زہر میں بُجھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر تیر انداز کے پاس چھ تیروں کا ذخیرہ تھا۔ وہ کُل تعداد میں سات تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گھنے درختوں کے پتّوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ گویا ضرورت پڑنے پر وہ چالیس بیالیس دُشمنوں کو ہلاک کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم نے کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے ساتھیوں کو تین اطراف میں بکھیر دیا۔ وہ درختوں اور پتّوں کی آڑ لے کر خاموش، سانس روک کر کھڑے ہو گئے۔ سردار نے میرے کہنے کے مطابق اُنہیں تاکید کر دی تھی کہ جب تک حملہ آور اُن کے بالکل نزدیک نہ آجائیں وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ پہلے تیروں کا اور پھر بھالوں کا استعمال کریں اور جب وہ بالکل اُن کے نزدیک پہنچ جائیں تو دست بدست لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔

جنگلیوں کے لیے یہ اندازِ جنگ بالکل انوکھا تھا۔ اُن کی لڑائی کا طریقہ بالکل سادہ تھا۔ جب وہ دُشمن کو سامنے دیکھتے تھے تو تیر کمان بھالے سنبھال

کر شور مچاتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اُدھر دُشمن بھی تیزی سے اُن کی طرف بڑھتا تھا اور بہت جلد وہ دست بدست لڑائی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ شور مچانے کا ایک نقصان یہ بھی تھا کہ دُشمن کو ان کے آنے کی پوزیشن کا صحیح علم ہو جاتا تھا۔ اس طریقہ جنگ میں جس کی تعداد زیادہ ہوتی تھی وہ جیت جاتا تھا مگر مَیں نے اُنہیں جو طریقہ بتایا تھا اُس کے مطابق اُنہیں دُور ہی اپنی جگہ چُھپ کر دُشمن کو تیروں کا اور پھر بھالوں کا نشانہ بنانا تھا اور جب تک وہ بالکل سامنے نہ پہنچ جائے نہ تو مُنہ سے آواز نکالنی تھی اور نہ ہی اُس پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنا تھا۔ سردار بوگا نے تو زیادہ لیت و لعل نہیں کیا مگر دوسرے جنگلی یہ ہدایات سُن کر حیران رہ گئے مگر سردار کے حُکم کے آگے لاچار تھے۔ اس طرح بہت جلد وہ تین ٹولیوں میں بٹ کر تین اطراف میں درختوں کے پیچھے چُھپ کر بیٹھ گئے۔ سردار کی حُکم عدولی اُن کے لیے گُناہ کی حیثیت رکھتی تھی اور یوں بھی حُکم عدولی کی سزا موت تھی۔ اس لیے اِن احکامات کو ماننے کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔

مَیں اور بوگا ایک درخت کے موٹے سے تنے پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور حملہ آوروں کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ ڈھولوں کی آوازیں اب جنگل میں ہمارے بالکل نزدیک سے گُونج رہی تھیں۔ بعض ڈھول خاموش بھی ہو گئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ دُشمنوں نے اُن کا کھوج لگا کر اُنہیں ہلاک کر دیا تھا۔ جنگلی دستور کے مطابق ڈھول بجانے والے مُخبر کی ڈیوٹی جدید فوج کے اوپی کی طرح تھی اور ان کا فرض تھا کہ آخر وقت تک اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھول کی آواز کی وجہ سے حملہ آوروں کو اُن کے نزدیک پہنچ کر انہیں تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ ڈھول کی آواز ہی اِن کی نشان دہی کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ اکثر حالات میں یہ ڈھول بجانے والے ہی سب سے پہلے دُشمن کی ہلاکت خیزی کا نشانہ بنا کرتے تھے۔

اَب ہمیں حملہ آور جنگلیوں کے شور کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جنگلی آدابِ جنگ کے مطابق وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچاتے ہُوئے اپنے شکار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سردار بوگا نے ایک جھنجنا نما چیز نکال کر مُنہ سے بجائی۔ اس کی آواز کسی جنگلی پرندے کے مشابہ تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی جگہ بالکل تیار رہو اور جیسی ہدایات دی گئی ہیں ان کے مطابق عمل کرو۔

زیادہ دیر نہیں گزری کہ ہمیں حملہ آوروں کا جتھا نظر آگیا وہ جسیم اور قدآور لوگ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے، بھالے اور نوکدار گُرز قسم کے ہتھیار تھے۔ اُن کے جسم رنگ برنگے تھے اور لباس کے نام پر ایک بڑی دھجّی کے سوا کوئی اور لباس ان کے جسم پر نہ تھا۔ وہ دیکھنے میں ہی خونخوار اور بے رحم نظر آرہے تھے۔ اِن کے آگے آگے ایک بہت اُونچا، لمبا تڑنگا شخص تھا جس کے سر پر ایک اونچی سی ٹوپی تھی، جس میں پرندوں کے رنگین پَر سجے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُن کا سردار تھا۔ جنگلیوں کی یہ ادا مجھے پسند آئی کہ جنگ کے دوران میں جان جوکھوں کے وقت سردار سب سے آگے ہُوا کرتا ہے۔ پُرانے زمانے کی جنگوں میں بھی بادشاہ یا سپہ سالار فوج میں سب سے آگے کی صف میں ہُوا کرتا تھا اور جنگ میں باقاعدہ شامل بھی ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شجاعت اور جنگی مہارت ہی بادشاہت یا قیادت کے لیے ایک لازمی صلاحیت سمجھی جاتی تھی۔ آجکل کی جنگوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔ سپہ سالار یا افسر دُور بیٹھ کر فوج کو جنگ کرنے کے لیے ضروری ہدایات جاری کرتا ہے۔ فوجی ہلاک ہوتے ہیں مگر سپہ سالار ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ آدم خوروں کے سردار کو یوں بے محابا اور بے جگری سے بڑھتے ہُوئے دیکھا تو سردار بوگا کے بازوؤں کی مچھلیاں بھی پھڑکنے لگیں۔ اگر مَیں بازو پہ ہاتھ رکھ کر اسے نہ روکتا تو وہ بھی نعرے لگاتا ہُوا کُود کر آگے بڑھ جاتا۔ اس نے مُنہ سے ہلکی سی آواز نکالی جو کسی پرندے کی آواز کے مُشابہ تھی اور پھر تین اطراف سے زہر بھرے تیروں کی بارش ہو گئی۔ پہلے ہی وار میں کم از کم تیس حملہ آور زخمی ہو کر گر پڑے۔ خوش قسمتی سے کوئی تیر اُن کے سردار کو نہ لگا مگر بعد میں مجھے سردار بوگا نے بتایا کہ جنگلی لوگ سرداروں کو نشانہ بنانے سے احتراز کرتے ہیں اور اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سردار کو آخری وقت تک ہلاک نہ کیا جائے بلکہ زندہ گرفتار کیا جائے ہاں اگر سردار دست بدست لڑائی کے دوران میں کسی پر حملہ کرے تو ایسی صورت میں وہ جوابی حملہ کر سکتا ہے اور آمنے سامنے کی لڑائی میں سردار پر حملہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتا مگر اس ضمن میں بھی یہ اصول مدِّنظر رکھا جاتا ہے کہ سردار سے ایک وقت میں ایک ہی جنگجو نبرد آزما ہو اس پر پُشت کی جانب سے حملہ کرنے کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ عام طور پر دونوں لشکروں کے لوگ یہ موقعہ دیتے ہیں کہ دونوں سردار ایک دوسرے کے مدِمقابل بنیں۔

کسی آواز کے بغیر نہایت خاموشی سے تیروں نے تیس دُشمنوں کو شکار کر لیا تھا اور یہ بات حملہ آوروں کے لیے حیرت ناک تھی کہ مقابل

www.pdfbooksfree.pk

نے نہ تو جنگی نعرے لگائے، نہ شور مچایا اور نہ حملہ آور سامنے نمودار ہوئے۔ گرنے والوں کی جگہ لینے کے لیے اتنے جنگلی اور آگے بڑھے مگر اس بار پھر وہ تیروں کا نشانہ بن گئے، لیکن وہ کم بخت ہر قسم کے خوف سے بالاتر تھے۔ مرنے والوں کی جگہ لینے کے لیے ایک دوسرا ہجوم موجود تھا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سردار لوگا کا اندازہ دُرست تھا۔ اس کے جاں باز حملہ آوروں کو مارتے مارتے تھک جاتے مگر ان کی تعداد میں کمی نہ آتی۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں آئے تھے اور جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلے تھے۔ اُنہیں مرنے یا زخمی ہونے کا کوئی خوف نہ تھا۔ نئے حملہ آوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور وہ تیروں کی بارش کے باوجود آگے بڑھ رہے تھے۔ مرنے یا زخمی ہونے والوں کے انجام سے بے خبر انہیں صرف ایک ہی دُھن تھی کہ آگے بڑھ کر دُشمن پر قبضہ کر لیا جائے مگر ان کی بڑھتی ہوئی تعداد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سردار لوگا کے خفیہ ٹھکانوں پر محفوظ جاں باز موجود تھے۔ اب اُن پر تین سمتوں سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی جس سے وہ بوکھلا گئے تھے، پھر اُن کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ رات کی تاریکی میں نہایت خاموشی سے کس طرف سے تیر آ رہے تھے۔ دُشمنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہلاک کرنے اور اپنا مطلق جانی نقصان نہ ہونے کی بنا پر سردار لوگا اور اُس کے قبیلے والوں کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں۔ جنگل میں ایک عجیب ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں کے پُرجوش جنگی نعروں اور زخمیوں اور مرنے والوں کی چیخ وپکار نے مل جُل کر رات کے سناٹے میں بڑی بھیانک فضا قائم کر دی تھی۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ حملہ آور اپنے ساتھ مشعلیں بھی لے کر آئے تھے جس کی وجہ سے اُنہیں نشانہ بنانا انتہائی آسان تھا۔ ان کی بہت بڑی تعداد زہریلے تیروں کا نشانہ بن چکی تھی اور یہ امر بھی یقینی ہے کہ جن لوگوں کے جسموں میں تیر پیوست ہوئے تھے ان کا جاں بر ہونا ممکن نہ تھا۔ زہر میں بجھے ہوئے یہ تیر سُرعت سے اثر کرتے تھے اور زخم چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو، چند منٹوں کے اندر زخمی موت کے گھاٹ اُتر جاتا تھا۔

حملہ آور اپنے انجام سے بے خبر دیوانہ وار بڑھتے رہے۔ گرتے رہے، مرتے رہے مگر ان کے قدم آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ درختوں میں چھپے ہوئے سردار لوگا کے سورماؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ اب بھالوں اور نیزوں سے دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ حملہ آوروں کا سردار بدستور ان کی قیادت کر رہا تھا اور وہ اپنے چوڑے تیر نما بھالے سے کئی جنگلیوں کو ہلاک بھی کر چکا تھا۔ سردار لوگا بے تابی اور بے چینی سے بَل کھا رہا تھا مگر میں نے اسے اپنی پناہ گاہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"یہ بہادری نہیں ہے وہ لوگ یہ سوچیں گے کہ سردار لوگا ڈر کر چھپ گیا ہے۔"

"سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا سردار۔" میں نے اسے سمجھایا: "اصل چیز جیت ہار ہوتی ہے۔ چپ چاپ دیکھتے رہو۔ وہ تعداد میں تم سے بہت زیادہ ہیں۔ کھلی جنگ میں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔"

جنگ کا ہنگامہ اور شور اب حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ تیر انداز اپنی کمین گاہوں سے نکل کر دوبدو لڑائی میں شامل ہو چکے تھے اور ہر طرف قیامت کا سماں تھا۔ یکایک میں نے دُشمنوں کے سردار کو چند گز کے فاصلے پر دیکھا۔ وہ سر سے پیر تک خون میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود تیر تھا اور وہ چیخ چیخ کر جنگلی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس کی بے خوفی اور نڈرپن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری توجہ دوسری طرف منعطف ہوئی تو اُس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر سردار لوگا پھُرتی سے درخت سے کُودا اور مخالف سردار کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے گھُور رہے تھے اور للکار رہے تھے۔ لوگا کا جسم صاف اور بے داغ تھا۔ وہ حریف کے مقابلے میں تازہ دم بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ سردار لوگا کی قوت اور توانائی بھی بے مثال تھی اور پھر وہ تھکا ہُوا بھی نہیں تھا۔ فتح کی اُمید نے بھی اسے حوصلہ دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ اپنے حریف پر بھاری پڑنے لگا۔ اُس نے مقابل کو زخمی کر دیا تھا مگر پھر بھی اُس کی توانائی اور شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ حریف نے اس کے سر کا نشانہ لیا مگر پھر اس کی کمر پر وار کیا۔ لوگا نے بچنے کی کوشش کی مگر پھر بھی دھار دار تیر نے اس کی کمر میں گھاؤ ڈال دیا۔ لوگا غضب ناک ہو کر پلٹا اور مخالف پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے تابڑ توڑ حملوں نے چند لمحوں میں فیصلہ کر دیا اور پھر اس کا نیزہ دُشمن کی گردن کے پار ہو گیا ـــ مخالف سردار کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ آس پاس کے جنگلی حملہ آور جو اس لڑائی کا نظارہ کر رہے تھے ایک لمحہ رُکے بغیر چیختے اور شور مچاتے ہوئے مُڑے اور واپس بھاگنے لگے۔ سردار لوگا نے چلّا کر کوئی ہدایت

دی اور اُس کے جاں باز ان کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ چند لاشوں کے سوا وہاں کچھ اور موجود نہ تھا۔ یا پھر آدم خوروں کے سردار کی لاش تھی۔ سردار لوگا لاش کی طرف بڑھا اور انتہائی نفرت اور حقارت سے اس کو دیکھ کر اُس پر تھوک دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہُوا: "دوست۔ تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ ہماری جیت تمہاری وجہ سے ہُوئی ہے۔"

میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ میری طرف بڑھا اور میرا بازو تھام کر بولا: "لوگا تمہارا دوست رہے گا جیون بھر تمہارا دوست رہے گا۔ تمہارے کارن ساری دُنیا سے لڑے گا۔"

میں نے گرمجوشی سے سردار کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلوص، احسان مندی اور دوستی کے جذبات دیکھ کر میرے دل کو ڈھارس بندھی۔ اس دُور دراز ویران جنگل میں سردار لوگا جیسے بہادر، مُخلص اور جاں باز دوست کا مل جانا میرے لیے خوش قسمتی کی علامت تھی۔ وہ اَب دُشمنوں کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا۔ اس لیے میرا ہاتھ تھامے ہوئے بستی کی طرف چل پڑا۔ دراصل یہ لڑائی سردار لوگا اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک عجیب وغریب تجربہ تھا۔ اس بار ان کا ایک بھی جانی نقصان نہیں ہُوا تھا۔ نہ ہی ان کی بستی جلائی گئی تھی۔ ان کے قبیلے کی کوئی عورت بھی دُشمنوں کے قبضے میں نہیں آئی تھی جبکہ دُشمنوں کے اتنے سُورما ہلاک ہوئے تھے کہ کوئی گنتی نہ تھی۔ اس بار وہ لوگ بیشتر لاشوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ انہیں جانیں بچانے کی اتنی فکر تھی کہ وہ اپنی لاشوں کو اُٹھانے کی مہلت نہ پا سکے۔ سردار نے بستی کی طرف لوٹتے ہُوئے مجھے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ آدم خور اُنہیں بھاری نقصان پہنچائے بغیر واپس لوٹے ہوں۔ وہ بے شمار لاشیں اور زخمی اُٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے جو اُن کی خوراک کے کام آتے تھے۔ بے شمار نوجوان لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں۔ بستی کو وہ جلا کر راکھ کر دیا کرتے تھے اور بچے کھُچے مفرور جو کسی طرح جنگل میں بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے بڑی مُشکل سے اکٹھے ہو کر ایک ایک تنکا اکٹھا کر کے دوبارہ بستی بساتے اور پھر کچھ عرصے بعد آدم خوروں کے حملے کا انتظار کرنے بیٹھ جاتے۔ یہ ان لوگوں کی زندگی کا چلن اور معمول تھا مگر اس بار صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ دُشمن بھاری نقصان اُٹھا کر بھاگا تھا۔ اُن کا سردار بھی مارا جا چُکا تھا اور اب عرصہ دراز تک اس بات کا امکان نہ تھا کہ وہ اِدھر رُخ کریں گے۔

"دوست۔ تمہارے وِچار میں کتنے دُشمن مَرے ہوں گے؟" سردار نے پُوچھا۔

میں نے کہا: "سینکڑوں۔" پھر میں مُسکرایا: "مگر سردار لوگا ابھی ان میں سے بہت سے جنگلی اپنے ٹھکانے پر جا کر بھی مر جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

میں نے اُسے سمجھایا: "ان کے جو لوگ مارے گئے ہیں ان میں سے اکثر زہریلے تیروں کا نشانہ بنے ہیں اور جب وہ ان کی لاشوں کو کھائیں گے تو یہ زہر اُنہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

سردار لوگا ایک لمحے تو حیرت اور بے یقینی سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر بے اختیار بُلند آواز میں قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ وہ بار بار خوشی سے اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور کلکاریاں مارتا۔ پھر وہ مجھے محبت سے اپنے گلے لگاتا اور میرا ہاتھ چُومتا۔

"راجو۔ راجو۔ تم سردار لوگا کا پکا دوست ہو گیا۔ جنم جنم کا ساتھی۔ اب ہم تمہیں کبھی واپس نہیں جانے دے گا۔"

اس اثناء میں ہم بستی میں پہنچ گئے تھے جہاں مُحافظ چاق وچوبند اور کمر بستہ تھے۔ بُوڑھے۔ عورتیں اور بچے جھونپڑی کے اندر دبکے بیٹھے تھے مگر سردار کی آواز سُن کر وہ سب باہر نکل آئے اور اُس کے آس پاس جمع ہو گئے۔ اس نے مختصراً اُنہیں فتح کی داستان سنائی اور وہ خوشی سے ناچنے لگے۔ عورتوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور بے اختیار شور مچانے اور گانے لگیں۔ ان میں سے ہر ایک میرا جسم چھُو کر اظہارِ تشکّر کرنا چاہتی تھی مگر سردار نے ہاتھ بُلند کر کے اُنہیں روک دیا۔ پھر اُس نے اُنہیں بتایا کہ جب پیچھا کرنے والے سُورما واپس آ جائیں گے تو جیت کی خوشی میں بہت بڑا جشن منایا جائے گا۔ سب لوگ اس جشن کی تیاریاں کریں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے بازو سے تھام کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ وہ عقیدت، احترام اور محبت کی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور بار بار میرا ماتھا چُوم رہا تھا۔

جھونپڑی کے اندر جاتے ہی اس نے مجھے ایک برتن میں سے کوئی مشروب نکال کر پیش کیا۔ مجھے متامل دیکھ کر اُس نے بتایا کہ یہ جڑی بوٹیوں کا رس ہے اور ہر قسم کی تھکان دُور کر دیتا ہے۔ پھر وہ شوخی سے ہنسا اور بولا: "ابھی ہم تمہیں ایک اور رس پلائے گا۔ سوم رس۔"

www.pdfbooksfree.pk

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کوئی نشہ تو نہیں ہے؟"

"دارُو نہیں ہوتا" وہ ہنس کر بولا۔ "یہ دارُو کا بھی باپ ہوتا ہے۔ اُدھر شہر کا لوگ اِس کو بالکل نہیں جانتا مگر ہم تم کو بہت ڈھیر سارا دے گا۔

اچھا اب تم آرام کرو۔ ہم ابھی تمہیں جشن کے لیے لینے آئے گا"

وہ ہنستا ہُوا چلا گیا۔ میں نے اس کا پیالہ مُنہ سے لگایا۔ اُس کا ذائقہ کھٹ میٹھا تھا۔ کسی قسم کی خوشبو یا بدبُو اس میں نہیں تھی۔ پھر میں چٹائی پر لیٹ کر آئندہ کے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ سردار اب میرا بندۂ بے دام بن چکا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اس کے قبیلے کے لوگ بھی میرے پرستار ہو گئے ہیں اگر میں اشارہ کرتا تو وہ سب سردار کی جگہ مجھے اپنا سردار بنانے پر ایک منٹ کی دیر بھی نہ کرتے مگر میرا مدعا یہ نہیں تھا۔ میں عارضی طور پر اس جنگل میں آ پھنسا تھا اور یہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو مجھے رخصت ہو جانا چاہیے تھا، لیکن جنگلیوں کی اس احسان شناسی اور مہمانداری کی روایات کے تحت مجھے یہ بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر اب جبکہ میں اِن کا نجات دہندہ بھی بن چکا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر میں اِن خیالوں میں کھویا رہا۔ میں سمجھتا تھا رات کافی گزر چکی ہے اور میں کچھ دیر بعد سو جاؤں گا مگر نیند کا کوسوں نشان نہ تھا۔ میں بالکل تازہ دم تھا یوں لگتا تھا جیسے میں ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہُوں۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور سردار اندر داخل ہُوا۔ اس کا لباس تبدیل ہو چکا تھا۔ کمر میں اِس نے چیتے کی کھال لپیٹ رکھی تھی اور اس کے گلے اور بازوؤں میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں پڑی ہُوئی تھیں۔ خدا جانے یہ موتی یا جواہرات تھے یا کچھ اور، اُس کا چہرہ بھی رنگا ہُوا تھا اور سر پر رنگ برنگے پَروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شاہانہ رسمی لباس میں تھا۔ گویا جشن کا آغاز ہونے والا تھا۔

"راجو۔ میرے دوست۔ آؤ میرے ساتھ" اُس نے میری طرف ہاتھ پھیلائے۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے بازو تھام کر باہر لے گیا مگر ہمارا رُخ بڑے میدان کی طرف نہیں تھا۔ وہ مجھے ایک قریبی جھونپڑی میں لے گیا جو خوشبو سے مہک رہی تھی۔ میں نہیں جان سکا کہ یہ خوشبو عود و لوبان کی تھی یا پھولوں کی۔ جھونپڑی میں ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی اور اس کے نزدیک ایک بڑے مُنہ کا گھڑے نما بڑا سا برتن رکھا ہُوا تھا۔ سردار نے جھونپڑی کے اندر پہنچ کر تالی بجائی اور پچھلے دروازے سے چھ سات نوجوان لڑکیاں اندر آ گئیں۔ وہ سب صحت مند اور مضبوط جسم کی تھیں۔ لباس اِن کا حسبِ معمول ہی دو ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ سردار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"راجو۔ بہت بڑا جشن ہو گا۔ یہ تمہیں جشن کے لیے تیار کریں گی" اتنا کہہ کر اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلا گیا۔ لڑکیاں میری طرف بڑھیں اور میرا لباس اُتارنے لگیں۔ میں نے پریشان ہو کر اُنہیں دیکھا اور پھر سردار کو پکارا۔

"سردار لوگا۔ اِنہیں روکو"

مگر سردار جا چکا تھا۔ میں نے لڑکیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ اُنہیں منع کیا۔ ڈانٹا۔ بُرا بھلا کہا مگر اِن پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ میری تمام کشمکش رائیگاں چلی گئی اور اُنہوں نے میرا لباس جسم سے علیحدہ کر دیا مگر زیرِ جامہ ابھی تک میرے جسم پر تھا۔ میں سچ مچ غصے سے چلایا "خبردار رُک جاؤ ورنہ بہت بُرا ہو گا" وہ میری ڈانٹ سے سہم کر رہ گئیں۔ لڑکی نے دبی زبان میں کچھ کہا مگر میں نے گھونسہ تان لیا اور چلّا کر کہا "میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یہ کیا بے حیائی ہے؟"

اُنھوں نے بے بسی اور مجبوری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میرا انداز انتہائی جارحانہ تھا اور اُنہیں یہ اندازہ ہو چُکا تھا کہ میں کسی قیمت پر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر سر ہلا کر کسی بات پر متفق ہو گئیں۔ سانولے رنگ اور بھرے بھرے جسم کی ایک لڑکی آگے بڑھی اور اُس نے مجھے چٹائی پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا میں چٹائی پر لیٹ گیا۔ لڑکیوں نے برتن میں سے بھیگے ہُوئے نرم پتے نکالے اور میرے جسم پر پھیرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ میرے جسم کا کھچاؤ دُور ہونے لگا اور میں سکون اور راحت محسوس کرنے لگا۔ سارے جسم کو پتّوں سے دھونے کے بعد اُنہوں نے ایک اور چھوٹے برتن کا ڈھکنا کھولا اور ساری جھونپڑی خوشبو میں نہا گئی۔ یہ مرہم یا کریم جیسی کوئی شے تھی۔ اُنہوں نے میرے جسم پر اس کی مالش شروع کر دی۔

یہاں تک کہ وہ میرے جسم میں جذب ہو گئی۔ میرے انگ انگ سے خوشبو پھوٹنے لگی۔ یہ انتہائی دلآویز اور مسحور کُن خوشبو تھی۔ میں اس خوشبو کے سمندر میں ڈُوب گیا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ چند لمحے بعد اُنہوں نے میرا جسم تھپ تھپایا تو میں گڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ سب

میری گھبراہٹ پر ہنسنے لگیں۔ ایک لڑکی آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں جانور کی کھال تھی اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے لباس کے طور پر یہ کھال اپنی کمر کے گرد باندھنی ہو گی۔ میں نے کھال کا ٹکڑا اُس کے ہاتھ سے چھین لیا اور اِن سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اُنہوں نے پہلے تو توقف کیا مگر پھر جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ میں نے زیرِ جامہ کے اُوپر ہی وہ کھال جسم پر لپیٹ لی اور اس میں لگے ہُوئے تسموں کی مدد سے مضبوطی سے کمر میں باندھ لی۔ اتنی دیر میں لڑکیاں پھر اندر آ گئی تھیں۔ اِن کے ہاتھ میں رسّی کی بُنی ہُوئی ایک پگڑی نما چیز تھی جس میں بہت سے رنگین پَر لگے ہُوئے تھے یہ میرا آرائشی لباس یا تاج تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی نے آگے بڑھ کر وہ تاج نما چیز میرے سر پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ باقی لڑکیاں بھی ہاتھ باندھ کر جُھک گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُنہیں کیسے منع کروں۔ یہ مشکل سردار لوگا کی آمد کی وجہ سے آسان ہو گئی۔ اُس نے تعریفی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا اور پھر بڑھ کر مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوم لیا۔ لڑکیاں اس کی ہدایت پر باہر جا چکی تھیں۔

"راجو میرے دوست۔ تم تو بالکل سردار لگ رہے ہو۔ بولو سردار بنو گے؟ میری جگہ تم سردار بن جاؤ مجھے بہت خوشی ہو گی"

میں ہنس پڑا "سردار لوگا۔ تمہاری بہت مہربانی۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ مجھے واپس جانا ہے"

"اچھا یہ باتیں پھر ہوں گی۔ آؤ باہر جشن کے لیے سب تمہارا باہٹ (انتظار) تک رہے ہیں"

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باہر نکلے تو کھلے میدان میں بستی کی ساری آبادی اکٹھی تھی۔ بُوڑھے، بچے، عورت، مرد غرضیکہ قبیلے کا کوئی ایسا فرد نہ ہو گا جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی اُنہوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور پھر سجدے میں گر گئے۔ میں گھبرا گیا "سردار۔ اِنہیں روکو۔ یہ مجھے سجدہ نہ کریں"

"ارے یہ تو پراتھنا کر رہے ہیں"

میری زبان پر یہ الفاظ آتے آتے رہ گئے کہ ہمارے مذہب میں انسانوں کے لیے انسانوں کو سجدہ کرنا گناہ ہے مگر پھر مصلحتاً خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ہم میدان کے درمیان میں ایک اُونچے چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہر طرف مشعلیں روشن تھیں جن کی وجہ سے سارا میدان روشن ہو رہا تھا۔ ایک دلکش لڑکی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھی اور اُس نے ایک مٹی کا برتن ہم دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ سردار نے برتن اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "تم ہمارے مہمان ہو۔ ہمارے رکھوالے ہو۔ پہلے تم پیو۔"

میں برتن اٹھا کر مُنہ کی طرف لے گیا مگر اس کی بدبُو سے اندازہ لگا لیا کہ وہ شراب یا اسی قسم کی کوئی شے ہے۔ میں نے برتن سردار کو واپس لوٹا دیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "سردار۔ میں دارُو نہیں پیتا۔"

"دارُو نہیں پیتے" وہ یوں حیرت سے مجھے تکنے لگا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہے "پر کس لیے۔ کیا کارن ہے؟"

میں اتنی دیر میں جواب سوچ چکا تھا "سردار۔ میں نے اپنی ماں کو وچن دیا تھا کہ کبھی دارُو نہیں پیوں گا"

سردار کے چہرے پر حیرانی کے آثار نمودار ہُوئے۔ پھر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اس کو ہنستا ہُوا دیکھ کر سارے لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا، وہ سمجھے کہ شاید میں نے سردار کو کوئی لطیفہ سُنایا ہے۔ سارا میدان قہقہوں کے شور سے گُونج اُٹھا۔ سردار نے کہا "تم اچھے آدمی ہو۔ اپنا وچن نبھاتے ہو۔ بہادر ہو" یہ کہہ کر اس نے برتن کو مُنہ لگایا اور غٹ غٹ کر کے سارا برتن خالی کر دیا۔ حاضرین نے بھی اس کی پیروی کی۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے برتن دھرے ہُوئے تھے۔ اِن سب نے اپنے اپنے برتن اُٹھا کر مُنہ سے لگا لیے اور اس طرح فتح کے اس جشن کا آغاز ہُوا۔

ڈھول بجنے لگے اور ڈھول کی تھاپ پر ناچتی ہُوئی چند لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ وہ دیوانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ڈھول کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اسی رفتار سے لڑکیوں کے رقص میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ جس سے میں بہت زیادہ محظوظ ہوا۔ اِن کے رقص میں ایک عجیب طرح کی حیوانیت، دیوانگی اور والہانہ پن تھا۔ وہ رقص کے ساتھ ساتھ گلے سے چیخ چیخ کر آوازیں بھی نکالتی جا رہی تھیں جسے گانا تو نہیں کہا جا سکتا۔ شاید وہ خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ایسا کر رہی تھیں۔ حاضرین بھی اِن کی آوازوں میں آوازیں ملا کر چیخ رہے تھے اور اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کچھ اور لڑکیاں اور مرد بھی رقص میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ سردار لوگا کی بیویوں نے

www.pdfbooksfree.pk

بھی اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ جو لوگ ناچ نہیں رہے تھے وہ دارُو پی پی کر شور مچا رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ناچنے والے تھک گئے۔ سردار نے تالی بجائی اور ناچ گانا بند ہو گیا۔ سردار میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوا اور اس نے میرا ہاتھ اُونچا کر دیا۔ سب لوگوں نے شور مچا کر میری عزت افزائی کی۔ جس کے بعد سردار نے جنگلی زبان میں ایک مختصر سی تقریر کی۔ جواب میں پھر ویسا ہی شور مچا۔ سردار میرا ہاتھ تھام کر اپنی جھونپڑی میں لے گیا اور کہنے لگا: "دیکھو راجو۔ یہ ہمارے جیون کا بہت بڑا دن ہے۔ اس سے بڑی خوشی ان لوگوں کو کبھی نہیں ملی ہے۔ آج یہ سب خوشی منائیں گے۔ ناچیں گے۔ گائیں گے۔ مزے کریں گے۔ ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند کے ساتھی کے ساتھ موج منائے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"مطلب یہ کہ آج کسی پر کوئی رُوک ٹوک نہیں ہے۔ کوئی جس طرح چاہے موج منائے۔"

میں نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پوچھا: "ہر عورت کسی نہ کسی کی بیوی یا رشتے دار ہوتی ہے سردار لوگا۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو یہ اجازت کیسے دے سکتا ہے؟"

سردار لوگا نے سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور پھر بولا: "سنو راجو! یہ شہر نہیں ہے، جنگل ہے۔ ہم جنگلیوں کے رواج تم لوگوں سے الگ ہوتے ہیں۔ ہمارے لوگوں میں میاں بیوی کا سمبندھ کوئی مُشکل بات نہیں ہے۔ جس کے بازو میں طاقت ہے اور شکار مار سکتا ہے وہ من پسند لڑکی سے بیاہ کر سکتا ہے۔ اس کی بیوی کو اگر کوئی دوسرا مرد پسند آ جائے تو وہ اپنے گھر والے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بیاہ کر لیتی ہے۔ جب کبھی جشن یا تہوار ہوتا ہے تو سب لوگ دارُو پی کر ناچتے ہیں اور موج اُڑاتے ہیں۔ اس روز کسی مرد اور عورت پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ تمہارے لوگوں میں مرد بہت سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے جنگل میں عورت بھی ایک بار میں کئی بیاہ کر سکتی ہے۔ اگر اُس کا اپنے مرد کی آ گیا ہو تو پھر اُسے کوئی روک نہیں سکتا اور پھر آج کا دن تو بہت شُبھ دن ہے راجو۔ ایسی جیت تو ہمارے قبیلے کو کبھی نہیں ملی۔ جنم جنم تک ہم سب اسے یاد رکھیں گے۔ تم نے ہماری رکھشا کی ہے۔ تم ہمارے لیے دیوتا بن کر آئے ہو۔ تمہارے لیے تو ہم ہر طرح کی بھینٹ دے سکتے ہیں۔"

میرے لیے سردار کا تشکر اور احسان مندی کا جذبہ بجا تھا۔ مگر اس نے اپنے قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ ایک انوکھی اور تعجب انگیز بات تھی مگر ہر مُلک، شہر اور سماج کے اپنے اپنے دستور ہوتے ہیں۔ سب اپنے قاعدوں اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ سب باتیں کتنی ہی انوکھی سہی، ان لوگوں کے لیے بالکل نارمل اور قدرتی تھیں۔ خدایا! میں نے سوچا میں کہاں پھنس گیا؟ اس مُشکل سے کب اور کیسے نجات ملے گی۔

سردار نے مجھے سوچ میں گُم دیکھا تو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: "راجو دوست۔ تم تو ہماری جان بھی مانگو گے تو کوئی نا نہیں کرے گا۔ جس کی طرف اشارہ کر دو وہ اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹ کر دیدے گا تمہیں، کہو تو ابھی آزما لو۔"

"ارے نہیں سردار۔ مجھے کسی بدلے یا قربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے جذبات کے لیے میں تمہارا بہت شکریہ ادا کرتا ہُوں۔"

"تمہیں بھُوک تو نہیں لگی ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"بالکل نہیں۔ بس اب میں سونا چاہتا ہُوں۔ تم لوگ جشن مناؤ۔ عیش کرو۔"

سردار ہنس پڑا: "یہ سونے کا سمے نہیں ہے راجو۔ یہ تو جاگنے کی گھڑی ہے۔ تم نے ہم پر جو کرپا کی ہے اس کا بدلا ایسے تو نہیں اُترے گا۔ ہمیں بھی سیوا کی آگیا دو۔"

"مگر سردار......"

"دیکھو اب تم کچھ نہیں بولو گے۔ پورن ماشی کی رات آنے تک ہم سب جشن منائیں گے اور تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ اُن ہتھیاروں کے آجانے کے کارن ہم تمہاری سپھل سیوا ابھی نہیں کر سکے۔ اب تم ہمارے مہمان بنو گے۔ جب تک پوریمانہ ہو گی۔ اب مجھے آگیا دو۔"

"مگر میں سوؤں گا کیسے؟"

وہ ہنس پڑا: "تمہیں نیند نہیں آئے گی دوست۔ تمہیں سوم رَس پلائیں گے جس سے تم کو سونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ نہ تم تھکو گے۔ نہ تمہاری شکتی کم ہو گی۔ یہ سوم رَس دیوتاؤں کی دین ہے۔ ہم جب کبھی بہت بڑا جشن مناتے ہیں تو سردار کو یا اس کے مہمان کو یہ رَس پلاتے ہیں۔

پر تم تو خود دیوتا بن کر آئے ہو ہمارے لیے۔"

ابھی میں جواب بھی نہیں دینے پایا تھا کہ وہ جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ باہر سے شور و غل، ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ لوگ کس طرح زندگی کی خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہوں گے مگر سردار کی باتوں نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ سوم رَس کیا بلا ہے اور اس کے پینے سے کیا ہوتا ہے؟ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ بہت خاص مواقع پر اپنے خاص مہمانوں کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیا جاتا ہے مگر میں دیوتاؤں کی بخشی ہُوئی اس نعمت کو قبول کروں یا نہ کروں؟

شور و غل کے ساتھ ساتھ ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں اور وحشیانہ نعروں کی آوازیں بدستور جاری تھیں۔ اِن میں عورت اور مرد دونوں کی آوازیں شامل تھیں۔ چند لمحے بعد آہٹ ہُوئی اور جھونپڑی میں دو لڑکیاں داخل ہُوئیں۔ اُن کے ہاتھ میں نرم کھالوں سے بنا ہُوا ایک بستر تھا جو اُنہوں نے خاموشی سے جھونپڑی کے بیچوں بیچ بچھا دیا۔ پھر اُنہوں نے جُھک کر مجھے تعظیم دی اور باہر چلی گئیں۔ گویا سردار مجھے دی۔ آئی۔ پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ باہر سے پھر لڑکیوں کی کھنکتی ہُوئی آوازیں سُنائی دیں اور پھر ساری جھونپڑی اُن سے بھر گئی۔ یہ سب سردار لوگا کی بیویاں تھیں۔ وہ سب بناؤ سنگھار کیے ہُوئے تھیں۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اُنہوں نے ڈنڈوت کے انداز میں جُھک کر مجھے تعظیم دی اور پھر رقص کے انداز میں میرے اِرد گرد حرکت کرنے لگیں۔ نیرا ان میں پیش پیش تھی۔ اس کے سر پر ایک تھالی تھی جس میں مٹی کا ایک برتن رکھا ہُوا تھا۔ وہ ایک ماہر رقاصہ کے انداز میں جسم کو ہلکورے دے رہی تھی مگر تھالی میں رکھے ہُوئے برتن کا رَس ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔ اتنا تو میں جان گیا تھا کہ وہ سردار کے کہنے کے مطابق سوم رَس ہے مگر یہ ہے کیا بلا؟ سردار نے بتایا تھا کہ یہ دیوتاؤں کا تحفہ ہے اور یہ دارُو نہیں ہے۔ نیرا جسم کو بل دیتی ہُوئی آگے بڑھی اور میرے سامنے دلنواز انداز میں سر جُھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی سی کیفیت تھی اور ایک التجا بھی۔ سردار کی دوسری بیوی آگے بڑھی اور میرے آگے دونوں ہاتھ جوڑ کر رقص کے انداز میں کھڑی ہو گئی پھر اُس نے تھالی میں رکھا ہوا برتن اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ میں ابھی تک لیس و پیش میں تھا۔ جب کافی دیر تک میں نے پیالہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی تو ان میں آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ایک پری نقش و نگار اور گداز جسم کی عورت نے آگے بڑھ کر اپنی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلّے نہیں پڑا۔ میں بدستور خاموش تھا۔ آخر ان میں سے ایک تیزی سے دوڑ کر باہر چلی گئی۔ وہ سب تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگلی ہونے کے باوجود وہ سب رعنائی اور دلکشی میں کم نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ قبیلے کے سردار کے لیے جنگل کی مُنتخب لڑکیاں ہی چُنی جاتی ہوں گی یا پھر لڑائیوں میں ہار جانے والے قبیلوں کی خوبصورت ترین لڑکیاں سردار کے حصّے میں آتی ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ اُن کی ملاحتوں نے جھونپڑی میں ایک چمن سا کھلا دیا تھا۔

یکایک تیز تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر سردار لوگا اندر داخل ہُوا۔ وہ عورت جو اُسے بُلا کر لائی تھی، اس کے پیچھے تھی۔ سردار کے چہرے پر پریشانی اور اُلجھن کے آثار تھے۔

"راجو دوست۔ کوئی دوش ہو گیا ہے ہم سے؟"

"نہیں تو سردار۔ یہ تم نے کیسے سوچا؟"

"تو پھر سیوا کو سویکار کیوں نہیں کر رہے ہو؟ سوم رَس تو ہر منش کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ یہ دیوتاؤں کے لیے ہوتا ہے یا پھر کوئی قسمت والا مہمان سردار ہوتا ہے جسے یہ ملتا ہے۔ پر تم کیوں نہیں پی رہے؟"

میں نے کہا: "میں نے تو تمہیں بتایا ہے نا کہ دارُو نہیں پیوں گا؟"

"یہ دارُو نہیں ہے دوست۔ تم نے اپنی ماں کو جو وچن دیا ہے میں اُسے نہیں تُڑواؤں گا۔"

"تو پھر یہ کیا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں مستی اور خمار کے سائے لہرا گئے۔ آواز میں ایک نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی: "سنو راجو۔ آکاش کے دیوتا جب جشن مناتے ہیں تو انہیں یہ سوم رَس پینا ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کا جشن جلدی تو ختم نہیں ہوتا۔ ان کا سمے تو گزرتا ہی نہیں۔ ان کا ایک دن ہمارے ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ وہ کئی کئی دن اپنی گپھا سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کارن وہ سوم رَس پیتے ہیں، اس کے پینے سے ان کی شکتی بڑھ

www.pdfbooksfree.pk

جاتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا: "راجو۔ تم نے ہم پر بہت کرپا کی ہے۔ تم نے وہ کام کیا ہے جو دیوتا ہی کر سکتے ہیں ہم تو تمہارا دینا نہیں دے سکتے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان بھی تمہیں بھینٹ دے دوں۔ من چاہتا ہے تمہیں آکاش پہ بٹھا دوں۔ باہر سب بستی والے جشن منا رہے ہیں۔ تمہارے کارن اُنہیں یہ جیت ملی ہے۔ تم بھی جشن مناؤ۔ دیوتاؤں کی طرح اپنی منوکا مناؤں کو پورا کرو۔ یہ سب تمہاری دیوداسیاں ہیں۔ یہ تمہاری سیوا میں رہیں گی۔ تمہیں خوشی سے مالا مال کر دیں گی۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے لیے یہ بالکل انوکھی صورتحال تھی۔ "سردار تم نے ٹھیک کہا۔ ہر جگہ کا رواج الگ ہے۔ پر تم مجھے اپنا رواج اپنانے کے لیے کیوں مجبور کرتے ہو۔"

سردار حیرت اور بے یقینی سے میری صورت تک رہا تھا: "دیکھو راجو دوست۔ تم سردار بوگا کا اپمان مت کرو۔ ہم جنگلی لوگ اپنی آن پر جان دینا بھی جانتے ہیں۔ کوئی ہماری بے عزتی نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے ہم پر اتنا بڑا احسان نہ کیا ہوتا تو اب تک سردار بوگا تمہاری طرف سے اتنی بڑی بے عزتی برداشت نہیں کرتا۔"

"بے عزتی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ بے عزتی نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر تم نے ان کی سیوا کو سویکار نہیں کیا تو یہ جنگلی تمہاری جان لے لیں گے۔"

میں بوکھلا گیا: "مگر سردار بوگا......."

"راجو۔" وہ میری بات کاٹ کر نرم لہجے میں بولا: "کیا ان کی سُندرتا میں کھوٹ ہے؟ ان کی طرف دیکھو۔ یہ آکاش کی اپسراؤں سے کم نہیں ہیں۔ کوئی سادھو، سنت، جوگی بھی ہو تو ان کو دیکھ کر پاگل ہو جائے۔ پر تم کیسے آدمی ہو؟"

"تم تو شہر میں رہ چکے ہو سردار بوگا۔ ہمارے سماج میں یہ پاپ ہے۔"

"پر ہمارے سماج میں یہ پُن ہے۔ ثواب ہے۔ اس سمے تم اپنے شہر میں نہیں ہمارے جنگل میں ہو۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو اِدھر کا رواج ہے۔"

پھر اُس نے ایک نگاہ اپنی بیویوں کی قطار پر ڈالی جو خاموش کھڑی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی ان کے پلّے نہیں پڑ رہا تھا مگر وہ اتنا ضرور جان گئی تھیں کہ میں ان کی خدمات کو قبول کرنے سے انکار کر رہا ہوں۔ ان کے چہروں کی مایوسی اور اُداسی اس بات کا مظہر تھی۔ وہ التجا آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت وہ پوری طرح بن سنور کر آئی تھیں۔ ہر ایک نے ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر بناؤ سنگھار کیا تھا۔ ان کے جسموں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں تیل لگا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اور گلوں میں پھولوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے گجرے اور ہار پہن رکھے تھے۔ لباس بھی ان کے فوق البھڑک تھے۔ شاید شادی کے موقعے پر یہاں کی دُلہنیں اسی طرح سجتی اور سنورتی ہوں گی اور پھر وہ سب تو سردار کی بیویاں تھیں۔ جو سارے علاقے کا انتخاب تھیں، جنہیں اپنی حیثیت اور شکل و صورت پر ناز تھا۔ شاید جنگل کا ہر شخص دِل ہی دِل میں اُنہیں اپنانے کی حسرت رکھتا ہوگا مگر وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر تھیں، اس لیے کہ وہ سردار بوگا کی بیویاں تھیں مگر ان کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا ہوا تھا جو اُن کی جانب ذرا بھی ملتفت نہ تھا اور جو اُن کی خدمات کو قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ عورتیں بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں وہ حالات اور معاملات کو بہت جلد بھانپ لیتی ہیں اور حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ غصّے اور مایوسی سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر ٹھکرائے جانے کا صدمہ صاف پڑھا جا سکتا تھا۔

سردار بوگا اِس اثنا میں اپنا فیصلہ سُنا چکا تھا اور مجھ پر یہ واضح ہو چکا تھا کہ میں کسی صورت بھی جنگل کے قانون کو نہیں توڑ سکتا۔ اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اگر مدہوش جنگلیوں کے کانوں میں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے سردار کی بیویوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ سب کچھ بھول کر میری تکا بوٹی کر دیں گے۔

میں نے ایک لمبی آہ بھری اور مایوسی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی: "سردار بوگا۔ تم کہتے ہو تو میں تمہاری خواہش پوری کرنے سے انکار نہیں کروں گا مگر میری خدمت کے لیے ایک ہی کافی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے راجو۔" سردار نے پریشانی سے کہا: "اپنی بے عزتی تو ان میں سے کوئی بھی سہ نہیں سکے گی اور پھر جشن تو بہت دن تک جاری رہے گا۔"

مجھے تاریکی میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی: "ٹھیک ہے جشن تو پورن ماشی تک جاری رہے گا۔ مجھے تمہاری یہ بات بھی منظور ہے مگر تم جانتے ہو کہ ہم شہر کے لوگ ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیوی کی موجودگی گوارا نہیں کرتے۔ میں نے تمہاری آگیا کا پالن کیا ہے اب تم بھی میری ایک بات مان لو۔ ان میں سے ایک کو یہاں رہنے دیں۔ صبح دوسری اُس کی جگہ لے لے گی اور اس طرح تمہاری مرضی بھی پوری ہو جائے گی اور کسی کو ناراضگی کا موقعہ بھی نہیں ملے گا۔"

سردار نے مایوس اور جھلاّہٹ سے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے جیسے کہہ رہا ہو کہ بھگوان ہم تم سے سمجھے مگر اسے بھی یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اُس کے ہر حکم اور ہر خواہش کی تکمیل نہیں کروں گا۔ مجبوری سے اُس نے اپنی بیویوں کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے اور جانے کیا بڑبڑایا۔

میں نے کہا: "سردار تمہیں بھی جشن میں حصّہ لینا ہے۔ ان کو تم اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟"

"تمہارے جیسے مہمان کے ہوتے ہوئے ان پر میرا حق نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ پھر اُس نے اپنی بیویوں سے مخاطب ہو کر جنگلی زبان میں کچھ کہنا شروع کر دیا۔ ان سب کے چہروں پر غصّے اور مایوسی کے جذبات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے کچا ہی چبا ڈالیں گی۔ ان کی اس سے بڑی توہین شاید کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔ سردار نے سمجھانے کے انداز میں ان سے کچھ کہا اور ان کے چہروں سے ناراضگی کے تاثرات رفتہ رفتہ کم ہونے لگے۔

سردار نے نیرا کی طرف اُنگلی اُٹھائی اور چند الفاظ کہے۔ اس کے اشارے اور ہدایت پر نیرا کے سوا تمام دوسری بیویاں جھونپڑی سے باہر چلی گئیں۔ نیرا کے چہرے پر خوشیوں کے پھُول کھل رہے تھے۔ سردار نے درُست کہا تھا۔ اس وقت میری حیثیت ایک دیوتا جیسی تھی اور دیوتا کی خدمت کا موقع ملنے کی سعادت حاصل کرنا ان عورتوں کے لیے کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سردار نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور پھر منہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتا ہُوا جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔

اب میں اور نیرا جھونپڑی میں بالکل تنہا تھے۔ وہ دوسرے کونے میں خاموش کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس بات کی منتظر تھی کہ میں اسے کوئی ہدایات دوں۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ میں اضطراب اور غصّے کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کو کیوں حل کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اچانک اُفتاد نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ سردار کی بیگمات کی فوج جھونپڑی سے رُخصت ہو چکی تھی اور اب مجھے صرف ایک عورت سے نمٹنا تھا۔ میں سوچتا رہا اور جھونپڑی میں ٹہلتا رہا۔ نیرا کچھ دیر تو خاموش کھڑی مجھے تکتی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جھونپڑی کے وسط میں پہنچ گئی۔ وہ بار بار مٹی کے اُس برتن کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں سردار کے بیان کے مطابق مقدس سوم رَس تھا۔ میں نے بے دھیانی سے سر کھُجایا اور پھر نرم کھال کے بستر پر بیٹھ گیا۔ نیرا مُسکرائی اور مٹی کا برتن اُٹھا کر میرے نزدیک آ گئی۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ پُوچھا اور پھر مٹی کے برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ وہ اُلجھی اُلجھی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ باہر شور و غل اور ہنسنے بولنے کی آوازوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ساری بستی اس رنگ رلیے میں شریک تھی مگر افسوس کہ سردار کی بیویاں اس خوشی سے محروم تھیں۔ وہ سب سردار کی جھونپڑی میں میرے حکم کی منتظر بیٹھی ہوئی تھیں۔

نیرا نے مجھے سوچ میں ڈوبا ہُوا دیکھ کر کہنی سے ٹھوکا دیا اور میں چونک پڑا۔ میرا ذہن کوئی کارگر ترکیب نہیں سوچ سکا تھا مگر اب میں نسبتاً زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ وقتی طور پر میں نے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے کچھ مہلت حاصل کر لی تھی۔ وہ تیز تیز آوازوں میں مجھ سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بار بار سوم رَس کے برتن کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے

www.pdfbooksfree.pk

خاموش کر دیا۔

"دیکھو نیرا!" میں اس سے مخاطب ہوا۔ "نہ تم میری زبان سمجھتی ہو نہ میں تمہاری بولی جانتا ہوں۔ اس لیے اپنی پرابلم تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔ جب تمہارا شوہر نامدار ہی میری بات نہ سمجھ سکا تو تم کیا خاک سمجھو گی؟"

وہ حیرانی سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم میرے لیے قابلِ احترام ہو۔ سردار نے مجھ پر مہربانی کی ہے۔ مجھے پناہ دی ہے ساپنے محسن کی بیوی میرے لیے تعظیم کی مستحق ہے مگر بابا تمہارے جنگل کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ تم اُلٹی کھوپڑی کے لوگ ہو۔ تمہارے دستور بھی اُلٹے ہیں کیوں ہے نا؟" یہ کہہ کر میں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بھی مسکرائی اور میرے قریب کھسک آئی۔ پھر اُس نے اپنی نرم اور ملائم آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا مگر اس کے لہجے کی مٹھاس نے مجھے حیران کر دیا۔ جنگلی لوگوں کی زبان اور لہجہ اتنا نرم اور میٹھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم بھی شاید ٹھیک ہی کہتی ہو مگر مشکل یہ ہے کہ میں تمہاری بات نہ سمجھ سکتا ہوں اور نہ بول سکتا ہوں۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بے تکلفی سے میرے سامنے کھال پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دلکش باذوق، خوش مزاج اور ہنس مکھ عورت بھی تھی۔ وہ ہنستی رہی اور اپنی زبان میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ پھر اُس نے جھک کر میرے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ میں نے تیزی سے اپنے پیر کھینچ لیے۔ "نہ بابا۔ قدم چھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ٹانگ کھینچنے کی کوشش مت کرو۔"

جواب میں اس نے اپنی بڑی بڑی حیران سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے وہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ اور اپنے بارے میں سب کچھ مجھے بتا دو۔ یہ بتاؤ کہ اپنی سوکنوں کے ساتھ تمہاری کیسی نبھ رہی ہے۔ سردار لوگا کی لاڈلی بیوی کون ہے۔ تم لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا تو نہیں کرتی ہو؟ کھانا وانا کون پکاتا ہے؟"

میں نے آرام سے نیم دراز ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سر کے پیچھے رکھ لیے اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک بار پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ غالباً اب اس کو بھی اس تماشے میں لُطف آنے لگا تھا۔ جواب میں اس نے ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔ وہ تیزی سے اپنے دونوں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس کی گردن اور آنکھیں بھی حرکت میں تھیں۔ کبھی وہ جوش میں آکر دو زانو کھڑی ہو جاتی، کبھی بیٹھ کر نرم لہجے میں کچھ کہتے ہوئے آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ میں بظاہر اس کی گفتگو پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سُن رہا تھا مگر میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے شاید اب اس جنگل سے بھاگ نکلنے کا کوئی موقعہ نہیں ملے گا۔ نیرا کو بہلا پھسلا کر جھونپڑی سے باہر نکل جانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ سارا قبیلہ جشن منا رہا تھا اور مدہوشی کے طلسم میں گرفتار تھا۔ فرار ہونے کا اس سے بہتر موقعہ بھلا کیا ہو سکتا تھا مگر بھاگ کر جاؤں گا کہاں؟ اس گھنے اور انجان جنگل کے بارے میں مجھے کچھ بھی پتہ نہیں تھا اور میں اس پناہ گاہ کو چھوڑ کر جنگلی درندوں یا آدم خوروں کا شکار ہونے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ نیرا کی باتوں کا سلسلہ جو ایک بار شروع ہوا تو رُکے بنا جاری رہا۔ وہ نہ جانے کیا کیا قصے سنا رہی تھی۔ کبھی ہنستی تھی کبھی منہ بناتی تھی۔ کبھی اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات نمودار ہو جاتے تھے۔ میرا دل گھبرا گیا۔ میں ایک دم کھڑا ہوا تو وہ یک لخت خاموش ہو گئی۔ حیرت سے اس نے میری طرف دیکھا اور پھر خود بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ سہم گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں کسی بات سے ناراض ہو گیا ہوں۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"پریشانی کی بات نہیں۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ بس دل گھبرا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر تازہ ہوا کھانے کے لیے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں جھونپڑی سے باہر چلا گیا۔ باہر فضا میں ایک عجیب مستی اور مدہوشی کا عالم تھا۔ سارا جنگل اَن جانی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ جشن منانے والوں کے شور و غل اور چہل پہل نے جنگل میں منگل کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ سب خوشیاں منا رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ رقص کر رہے تھے۔ ڈھول کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کبھی کسی نغمے کی تان بھی سنائی دیتی تھی مگر میں ان سب سے بے پروا اپنے خیالات میں گم تھا۔ نہ جانے سوچوں میں کھویا ہوا میں کتنی دُور چلا گیا یہاں تک کہ شور و غل کی آوازیں بہت مدھم ہو گئیں۔ یکایک مجھے اپنے پیچھے کوئی آہٹ سنائی دی۔ چونک کر پلٹا اور میرا ہاتھ بے اختیار ریوالور پر پہنچ گیا مگر پھر میری بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر نیرا کھڑی ہوئی تھی۔ سوم رس کا برتن اُس نے گھڑے کے انداز میں اپنے سر پر اُٹھایا ہوا تھا اور وہ نہ جانے کب سے نہایت خاموشی اور سعادت مندی کے ساتھ دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ میرے یکدم پلٹنے سے وہ ٹھٹھک کر رُک گئی تھی مگر میری ہنسی نے اُس کا خوف دُور کر دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے نزدیک آ گئی۔ اس کا یہ انداز دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کی ٹیاریں یاد آ گئیں۔ کنوئیں یا پن گھٹ سے پانی بھرنے کے لیے جب وہ مٹی کے گھڑے اپنے سروں پر اُٹھا کر چلتی ہیں تو یہی منظر پیش کرتی ہیں۔ فرق صرف لباس کا تھا یا پھر ماحول کا۔

"بھئی تم کس خوشی میں میرا پیچھا کر رہی ہو اور یہ گھڑا تم نے کیوں اُٹھا رکھا ہے۔ بابا میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا ہوں!"

وہ پھر ہنس پڑی اور جواب میں اپنے نرم و ملائم لہجے میں اُس نے مجھ سے کہا اور سر پر دھرا ہوا برتن اُتارنے کا ارادہ کیا۔

"ارے ارے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ وہ پھر سہم کر رہ گئی۔ "تم تو ذرا ذرا سی بات پر سہمی ہوئی فاختہ کی طرح ڈر جاتی ہو۔ تم کیسی جنگلی عورت ہو۔ تم نے تو شہر کی نرم و نازک عورتوں کو بھی مات کر دیا ہے۔ اچھا۔ اب آ ہی گئی ہو تو چپ چاپ چلتی رہو۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالنا۔ میں سوچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر تعمیل کی اور خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اس طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم دونوں کافی دُور نکل گئے۔ اب گھنے جنگل کا سلسلہ کم ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ کچھ فاصلے پر کھلی جگہ موجود ہے۔ موسیقی اور شور و غل کی آوازیں قریب قریب معدوم ہو چکی تھیں اور جنگل کا سناٹا دل کو لبھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اب میں پرندوں اور جنگلی جانوروں اور جھینگروں کی ہلکی اور نازک آوازیں بھی سُن سکتا تھا۔ پھر میں نے کچھ فاصلے پر آبشار کے گرنے کی آواز سُنی۔ اس جنگل میں آبشاروں اور ندیوں کی کمی نہیں تھی۔ یہ میں اپنی گرفتاری کے بعد سردار کی بستی تک پہنچتے وقت ہی دیکھ چکا تھا۔ چند قدم اور آگے بڑھ کر دیکھا تو مجھے آبشار کا سفید چمکدار پانی چاندی کی دھار کی طرح گرتا ہوا نظر آ گیا۔ آبشار زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے باوجود یہ منظر اتنا دلکش اور سحر آفریں تھا کہ میں اس میں کھو گیا۔ یکایک میں نے اپنے پیچھے ایک آہٹ سُنی اور پھر چیخ کی آواز۔ تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو نیم تاریکی میں ایک جنگلی کا ہیولا نظر آیا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اس نے نیرا کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلایا ہوا تھا اور مجھ پر بھالا پھینکنے کے لیے اس کا بازو بلند ہو چکا تھا۔ ایک لمحے کی اور تاخیر ہو جاتی تو اس کا زہر آلود بھالا میرے جسم میں پیوست ہو چکا ہوتا مگر نیرا کی چیخ نے مجھے بروقت خبردار کر دیا۔ میرے پاس جوابی کارروائی کرنے کا وقت نہ تھا اس لیے میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔ بھالا سنسناتا ہوا تیزی سے میرے سر کے اُوپر سے گزر گیا۔ میں نے حملہ آور کو سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر زمین پر بیٹھے بیٹھے کمر سے خنجر نکال کر پھینکا جو اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ یہ خنجر جنگلی لباس کے ساتھ مجھے ملا تھا اور اس وقت بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اگرچہ ریوالور بھی میرے پاس موجود تھا مگر ریوالور سے نشانہ لینے کا وقت نہ تھا۔ اس کے علاوہ ریوالور کی آواز جنگل کے سناٹے میں بہت دُور تک گونج سکتی تھی اور اس طرح حملہ آور کے دوسرے ساتھیوں کو بھی یہ علم ہو جاتا کہ میں کس جگہ موجود ہوں۔ اپنی فوجی تربیت کو کام میں لاتے ہوئے میں نے تیزی سے زمین پر لوٹ لگائی اور چشم زدن میں جنگلی اور نیرا کے پاس پہنچ گیا۔ میں اسپرنگ کی طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے ذرا بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ کیونکہ قوی ہیکل جنگلی کا مضبوط بازو نیرا کی نرم و نازک گردن کے گرد پھانسی کا پھندا بن گیا تھا۔ وہ عالمِ سکرات میں تھا اور اس وجہ سے نیرا کی گردن کے گرد اس کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ نیرا کی دونوں آنکھیں اُبل پڑی تھیں اور منہ کھل گیا تھا، چند اور سیکنڈ کے بعد وہ مر جاتی۔ میں نے ایک جھٹکے سے جنگلی کا دوسرا ہاتھ مروڑا اور نیرا کی گردن کے گرد لپٹے ہوئے ہاتھ کو تھام کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ غالباً زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی طاقت بے پناہ تھی۔ چند لمحے کی کشمکش کے بعد اس کا جسم بے جان ہو گیا اور جب وہ زمین پر گرا تو نیرا اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے نیرا کو کھینچ کر زمین پر بٹھا دیا اور خود درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر چاروں طرف کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ کسی قسم کی آہٹ یا آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے احتیاطاً ریوالور اپنے ہاتھ میں تھاما اور دوبارہ نیرا کی طرف بڑھا۔ وہ ایک مضبوط اور توانا جنگلی عورت تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس حملے کو برداشت کر گئی ورنہ کوئی اور عورت ہوتی تو کبھی کی گردن ٹوٹنے کے باعث مر چکی ہوتی۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں

www.pdfbooksfree.pk

تھیں مگر وہ آرام سے سانس لے رہی تھی۔ وہ زمین پر پیر پھیلائے بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن سہلانے میں مصروف تھی۔ مگر یہ دیکھ کر میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا کہ سوم رس کا برتن ابھی تک اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ شاید یہ کسی تربیت کا نتیجہ تھا ورنہ اس تمام جدوجہد اور کشمکش کے دوران میں برتن کا اس کے سر پر برقرار رہنا ایک حیرت انگیز بات تھی جس کی توقع کسی شعبدہ باز ہی سے کی جا سکتی ہے۔ نیرا کو محفوظ و مامون پانے کے بعد میں نے جنگلی کی لاش کا جائزہ لیا۔ وہ خوفناک شکل کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر رنگین لکیروں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ تیر کمان اس کے کاندھے سے نکل کر زمین پر گر گیا تھا۔ اس کو بغور دیکھنے کے بعد مجھے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ اس آدم خور جنگلی قبیلے کا ایک فرد تھا جنہوں نے سردار لوگا کی بستی پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ سردار لوگا کے ساتھیوں نے جنگل میں بہت دور تک پسپا ہونے والوں کا پیچھا کیا تھا اور بے شمار دشمنوں کو ہلاک بھی کر دیا تھا مگر یہ جان باز اور بے خوف شخص کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اپنی جان پر کھیل کر مقابلے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس کی جرأت اور بہادری بلاشبہ قابل تعریف تھی اگر مجھے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو نہ صرف نیرا بلکہ خود میں بھی ہلاکت کا نشانہ بن جاتا اور شاید اس آدم خور جنگلی کی خوراک بھی۔

نیرا بدستور زمین پر پھسکڑا مارے یوں اطمینان سے بیٹھی تھی جیسے اپنے گھر میں بیٹھی ہو۔ اب اس کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش تھی اور وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا "شکر ہے جان بچ گئی۔ یہ بتاؤ تمہاری گردن کا کیا حال ہے؟" میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا تو اس نے اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے کچھ کہا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ اب وہ ٹھیک ہے پھر اس نے سوم رس کا برتن اپنے سر پر سے اتارنے کی کوشش کی۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں خوشامد اور التجا تھی۔ شاید وہ مجھ سے درخواست کر رہی تھی کہ وہ جس بوجھ کو اٹھائے پھر رہی ہے مجھے اب اسے ہلکا کر دینا چاہیے۔

"دیکھو۔ اگر یہ بہت اچھی چیز ہے تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ اس کو تم پی لو۔" ساتھ ہی میں نے اسے اشارے سے پینے کے لیے کہا۔

وہ مسکرانے لگی اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ پھر مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بار بار خود اپنی طرف اشارہ کر کے انکار میں سر ہلا رہی تھی اور بار بار مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر شاید مجھے یہ بتانا چاہتی تھی کہ یہ رس محض مرد ہی پی سکتے ہیں۔ پھر وہ کھسک کر میرے اور نزدیک آ گئی۔ وہ ایک بے تکلف، خوش مزاج اور خوش شکل عورت تھی اور ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک قسم کی یگانگت اور اپنائیت پیدا ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

اس نے سوم رس کا برتن سر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھ سے گھاس کے فرش کو صاف کرنے لگی۔ جھاڑ جھنکار کو ہٹا کر وہ بیٹھنے کی جگہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام کر اس نے زمین پر لٹا دیا۔ اس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ جب میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ چاپ لیٹے رہنے کی ہدایت کی۔ وہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی تھی جیسے کہ میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اس نے اپنا گھٹنا ہلانا اور گنگنانا شروع کر دیا۔ یہ کوئی رومانی نغمہ تھا یا ہو سکتا ہے لوری قسم کی کوئی چیز ہو۔ اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ مجھے تھوڑا سا رس پلانا چاہتی ہے مگر میرے انکار پر مسکرانے لگی اور سر ہلا کر رہ گئی۔ اس نے میرا سر دبانا شروع کر دیا۔ ایک جنگلی عورت ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ حیرت انگیز حد تک نرم و ملائم تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سردار کی لاڈلی بیوی ہونے کی وجہ سے اسے کوئی کام کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔

سارے دن کی بھاگ دوڑ اور تھکان کے بعد مجھے اس لمحہ بہت آرام محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ جنگل کی پراسرار تنہائی، رات کی تاریکی اور نیرا جیسی دلکش عورت کی موجودگی کے باوجود میرے دل میں کوئی جنسی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو نیرا بدستور کوئی گیت گنگنا رہی تھی اور میرا سر سہلا رہی تھی۔ اس کی گرم اور نرم انگلیاں میرے تھکے ہوئے دماغ کو فرحت اور سکون پہنچا رہی تھیں۔ مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو وہ مسکرائی اور جھک کر نرم آواز میں کچھ کہا۔

نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

میں بھی خوابیدہ آنکھوں سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر میں نے کہا: "نیرا کتنی عجیب بات ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود نہ جانے کتنی دیر سے معروفِ گفتگو ہیں۔ تم اپنی ہانکے جا رہی ہو۔ میں اپنی سنائے جا رہا ہوں مگر وقت بہت اچھا گزر رہا ہے۔"

جواب میں اس نے کچھ کہا اور ہنسنے لگی۔ وہ تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جن میں شوخی بھی تھی اور اپنائیت بھی۔

اس وقت میرے کانوں نے ایک آواز سنی اور میں تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے کان اور تمام تر توجہ اس موہوم سی آواز کی طرف تھی جو کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحے میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اچانک کھڑا ہو گیا۔ نیرا بھی حیرانی سے مجھے دیکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ شاید اس کے کانوں نے وہ آواز نہیں سُنی تھی مگر مجھے چوکنا پا کر اُس نے خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال دُرست تھا۔ یہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میری سماعت اس کو سُننے اور جانچنے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ شروع میں یہ بھنبھناہٹ کی طرح تھی مگر پھر رفتہ رفتہ آواز واضح ہوتی چلی گئی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں سے نکلنے والی آواز کو شناخت کرنے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ میں نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھا اور پھر نیرا کو قریبی درختوں کے سائے میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ "دیکھو نیرا۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم یہیں بیٹھو گی۔ بالکل حرکت نہ کرنا۔ سُن لیا نا؟"

وہ شاید میری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی اور سر ہلا کر اُس نے اس کی تصدیق کر دی کہ وہ میری ہدایات کے مطابق ہی عمل کرے گی۔ میں تیزی سے دبے پاؤں آگے کی طرف بھاگا۔ مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کھلا میدان ہم سے زیادہ دُور نہیں ہے اور میرا خیال صحیح نکلا۔ جنگلوں کا سلسلہ تھوڑے فاصلے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا اور میرے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ یہ کافی وسیع میدان تھا جس کے ایک طرف جنگل تھا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ۔ ایک پہاڑی پر سے خوبصورت آبشار گرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے قریبی درخت کی آڑ لے لی اور ہیلی کاپٹر کی آمد کا انتظار کرنے لگا جو کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا تھا۔

قریباً ایک منٹ کے بعد مجھے ہیلی کاپٹر بھی نظر آ گیا۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے بھی غالباً کھلے میدان کو دیکھ لیا تھا اور تیزی سے پھٹ پھٹ کرتا ہوا میدان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر بنے ہوئے نشانات بالکل واضح تھے۔ یہ دُشمن کا ہیلی کاپٹر تھا اور اس بات میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرے ہی کھوج میں نکلا تھا اور سردار لوگا کے علاقے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے آیا تھا۔

میں نے پلٹ کر جنگل کی طرف دیکھا۔ میری ہدایت کے برعکس نیرا پوشیدہ ہونے کی بجائے ایک بڑے سے درخت کے تنے پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی اور اُسے دیکھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ میرا ذہن نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اس ہیلی کاپٹر کے پیچھے کچھ اور ہیلی کاپٹر بھی آنے والے ہوں یا اس کی اطلاع پر دُشمن اس سارے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ یہ بڑی خطرناک اور پریشان کن صورت حال تھی۔ میں نے فی الفور ایک فیصلہ کیا اور پلٹ کر نیرا کی طرف بھاگا جو حیرت اور دلچسپی سے آسمان پر پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو دیکھ رہی تھی جو نیم تاریکی میں ایک بڑے آسمانی پرندے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ نیرا کے پاس پہنچ کر ابھی میں اسے مخاطب کرنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے زنانہ آوازوں میں ہنسی کی بھنک سنائی دی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ سردار لوگا کی دوسری بیویاں بھی نیرا سے کچھ فاصلے پر درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھی ہنس رہی تھیں۔ وہ غالباً ہم دونوں کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں اور نہ جانے کب سے ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو سردار کی طرف سے میری سیوا کرنے کا حکم ملا تھا اور وہ ہر قیمت پر اس حکم کو بجا لانا چاہتی تھیں۔ ان سب کی نظریں بھی آسمان پر ہیلی کاپٹر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنگل کے خوبصورت اور پُرسکون ماحول میں یہ سجی بنی خوبصورت عورتیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتی تھیں۔ اگر میں اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا نہ ہوتا تو شاید اس دلکش منظر سے لطف اندوز ہوتا مگر میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ دُشمن سونگھتا ہوا اور کھوج لگاتا ہوا میری تلاش میں اس دُور دراز جنگلی علاقے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ میرے بارے میں کتنا جانتے ہوں گے؟ اس کا مجھے کچھ اندازہ نہ تھا مگر اس کی مستعدی اور مستقل مزاجی یقیناً قابلِ تعریف تھی۔

میں نیرا کے پاس پہنچا تو وہ ہنس رہی تھی اور ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ خدا جانے اس نے پہلے بھی

کبھی ہیلی کاپٹر دیکھا تھا یا یہ ان سب کی زندگی میں پہلا موقع تھا۔

"نیرا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ چھپ جاؤ۔ پھر تم یہاں آ کر کیوں بیٹھ گئیں؟" میں نے غصے سے پوچھا۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکی مگر آواز اور چہرے پر غصے کے آثار دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ میں کسی بات پر ناراض ہوں۔ جواب میں اُس نے کچھ کہا جو حسبِ معمول میرے پلے نہیں پڑا۔ "اور یہ سب یہاں کیا کر رہی ہیں؟" میں نے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سردار لوگا کی دوسری بیویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "انہیں بستی میں اپنی جھونپڑی میں رہنا چاہیے تھا۔"

نیرا میرے اشاروں کا مطلب کچھ اور سمجھی۔ نتیجہ یہ کہ اس نے پکار کر ان عورتوں کو آواز دی اور وہ سب ہنستی، ٹھٹھول کرتی ہوئی ہماری طرف بھاگی آئیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو گھیر لیا اور چُخ چُخ باتیں شروع کر دیں۔ وہ اس سارے واقعے کو ایک کھیل تماشا ہی سمجھ رہی تھیں اور بار بار نیرا کو چھیڑنے کے انداز میں مخاطب کر رہی تھیں۔ ایک عورت نے نیرا کو گدگدی شروع کر دی اور بڑے معنی خیز انداز میں دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ جواب میں نیرا کی شرمائی ہوئی نگاہیں جھک گئیں۔ اس نے زیرِ لب آہستگی سے کچھ کہا اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انہیں دل لگی سوجھ رہی تھی اور میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میرا دھیان ہیلی کاپٹر کی طرف تھا جو چند چکر لگانے کے بعد اب کھلی جگہ میں زمین پر اتر رہا تھا۔ اب میرے پاس ضائع کرنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں تھا۔ نیرا اور اس کی ہم جولیوں کو ایک بار پھر خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے میں ہیلی کاپٹر کی طرف بھاگا۔

اس اثنا میں ہیلی کاپٹر زمین پر لینڈ کر چکا تھا۔ آس پاس کے درخت اس کے پنکھوں سے پیدا ہونے والی ہواؤں سے جھوم رہے تھے اور شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اب نیرا اور دوسری عورتوں کی توجہ بھی ہیلی کاپٹر کی طرف تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں جیسے اچانک کسی غیر متوقع واقعے یا تماشے کے ظہور پذیر ہونے کے انتظار میں ہوں۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھتا رہا۔ میرے ہاتھوں میں سوم رس کا پیالہ تھا اور میں اپنے طریقِ کار کے بارے میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس "سوم رس" کو میں ایک مہلک اور پُراثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر کچھ دیر شور مچاتا اور آس پاس کی زمین کی خاک اُڑاتا رہا۔ ایک آندھی کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اس کا دروازہ کھلا اور اُس کے اندر سے یکے بعد دیگرے تین فوجی سٹین گنیں ہاتھوں میں تھامے ہوئے کُود کر باہر نکلے۔ وہ پورے جنگی لباس میں تھے اور پوری طرح چوکنے نظر آ رہے تھے۔ کسی بھی اچانک یا غیر متوقع دُشمن سے نمٹنے کے لیے وہ مستعد اور چوکس تھے۔ انہوں نے تین سمتوں میں اپنے رُخ کر لیے اور پوزیشنیں سنبھال لیں۔ چند لمحے وہ اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ اتنی دیر میں اُن کی نظریں مجھ پر پڑیں اور ان کے جسم تن گئے مگر پھر ایک نہتے جنگلی کو سامنے پا کر انہوں نے سٹین گنوں کی لبلبی پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور میری طرف بڑھے۔ وہ بوقتِ ضرورت اپنی سٹین گن کو استعمال کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں خاموشی اور معصومیت سے انہیں دیکھتا رہا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ کر وہ رُک گئے۔ گہری نظروں سے میرا سر سے پیر تک جائزہ لینے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کے لیے ایک بے ضرر انسان ہوں۔ ایک فوجی نے اکھڑ لہجے میں مجھے للکارا: "کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔

"شاید ہماری زبان نہیں سمجھتا۔" دوسرا فوجی بولا۔ وہ آگے بڑھا اور بالکل میرے نزدیک پہنچ کر رُک گیا۔ "سنو" وہ بولا۔ "تم ہمیں اپنے سردار کے پاس لے جا سکتے ہو؟"

میں پھر خاموش رہا اور اُن کے چہرے تکتا رہا۔

"یار اس سے اشاروں کی بات کرو۔" تیسرے فوجی نے مشورہ دیا۔ پھر وہ اپنی سٹین گن زمین پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور اشاروں میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میرا سردار کہاں ہے اور یہ کہ میں انہیں اپنے سردار کے پاس لے چلوں۔

میں نے یوں گردن ہلائی جیسے ان کی بات سمجھ گیا ہوں اور پھر اشارے سے انہیں بتایا کہ سردار بستی میں ہے۔

"ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" پہلے فوجی نے زبان کے ساتھ ساتھ اشاروں کی مدد لیتے ہوئے مجھے بتایا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر چومے اور پھر گلے لگانے کے انداز میں سینے سے لگا لیے۔ میں ایک دم مسکرایا اور خاموشی سے آگے

www.pdfbooksfree.pk

بڑھ کر مَیں نے اپنی دوستی کے ثبوت کے طور پر سوم رَس کا برتن اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" دوسرے فوجی نے بے صبری سے برتن میرے ہاتھ سے قریب قریب چھین لیا اور پھر اسے سُونگھا: "اوھو۔ بڑی مزیدار بُو معلوم ہوتی ہے۔" اُس نے اپنے نتھنے پھیلائے اور سُونگھنے کے بعد خوشبو کو پسند کرتے ہُوئے گردن ہلائی۔ پھر اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر برتن سے مُنہ لگا کر ایک گھونٹ بھرا اور خوشی سے جھُوم اُٹھا۔ "ٹیکر سنگھ۔ ارے یہ تو غضب کی چیز ہے پیارے!" اُس نے ایک اور گھونٹ بھرا اور پھر اسے مُنہ میں لیکر اس کا مزہ لینے کی کوشش کی۔ پھر وہ اپنے ہونٹ چُوستے ہُوئے کہنے لگا: "اوئے یارا، یہ تو بڑی سٹرانگ ہے!" میں ان لوگوں کی ذہنیت سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شراب اور نشہ ان لوگوں کی بہت بڑی کمزوری ہے جس کے آگے وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔

دوسرے فوجی نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے برتن چھین لیا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا، کچھ سوچ کر اُس نے ایک اور گھونٹ لیا اور خوش ہو کر شور مچانے لگا: "ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ نو میچ۔" ایک دو گھونٹ اس کے لیے کافی تھے۔ وہ شراب کے رسیا معلوم ہوتے تھے مگر غالباً یہ شراب بہت زیادہ تیز تھی۔ اِس لیے انہوں نے دو تین گھونٹ لینے کے بعد توقف کرنا ضروری سمجھا تھا ورنہ بہت ممکن تھا کہ پہلا فوجی ہی برتن کو خالی کر دیتا۔ تیسرے فوجی نے بھی کسی تامّل اور تکلف کے بغیر اپنا حصہ چکھا اور تینوں آپس میں اس شراب کی تیزی، نشے کی شدت اور مزیداری کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس وقت اپنا یہاں آنے کا مقصد ہی بھُول بیٹھے ہیں اور شاید شراب سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ہی یہاں آئے تھے۔ برتن خاصا بڑا تھا اور بھرا ہُوا تھا۔ ان تینوں نے تھوڑی ہی دیر میں اسے آدھا خالی کر دیا اور مَیں نے ان کی آوازوں میں لرزش محسوس کی۔ اِس دوران میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہیلی کاپٹر میں کم از کم ایک پائلٹ ضرور موجود ہے۔ اس کے ساتھ اور کتنے فوجی ہیں؟ یہ جاننا مُشکل تھا مگر یہ تینوں فوجی فی الوقت ہیلی کاپٹر کو اور اس میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کو مطلق فراموش کر بیٹھے تھے۔

تیز شراب اُن کے رگ و پے میں تیزی سے سرایت کر گئی تھی اور اِن پر خمار اور مدہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ گویا میری کارروائی کا مطلوبہ نتیجہ برآمد ہو رہا تھا۔ مَیں بظاہر خاموش اُنہیں دیکھ رہا تھا مگر دل ہی دل میں خُدا کا شُکر ادا کر رہا تھا کہ میری سکیم کامیاب ہوتی نظر آ رہی ہے۔ وہ ابھی شراب ہی کے لُطف میں ڈُوبے ہُوئے تھے کہ اچانک ان کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ انھوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ میری نگاہیں بھی پیچھے جنگل کی طرف اُٹھ گئیں۔ سردار لوگا کی بیویاں کھڑی ہنس رہی تھیں۔ اُنہیں یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ہیلی کاپٹر ان کے لیے بالکل انوکھی شے نہیں ہے اور اس سے پہلے بھی وہ ہیلی کاپٹر دیکھ چکی ہیں۔ تینوں فوجیوں نے دس حسین جنگلی عورتوں کو دیکھا تو ان کا سُرور دو چند ہو گیا مگر اتنی دیر میں نیرا جو تیزی سے بھاگی ہوئی آ رہی تھی ہمارے نزدیک آ گئی۔ وہ سخت برہم اور مشتعل نظر آتی تھی۔ پہلے تو اُس نے اُن فوجیوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا اور غصّے میں مجھے ڈانٹنے لگی۔ وہ تینوں ایک خوش جمال عورت کو اپنے نزدیک پا کر بھونچکے رہ گئے تھے اور حیرت سے کبھی اس کو اور کبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ نیرا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور فوجی کے ہاتھ سے سوم رس کا برتن چھین لیا۔ پھر اُس نے جنگلی زبان میں تیزی سے مجھ سے مخاطب ہو کر کچھ کہا اور برتن کو یوں سنبھال کر کھڑی ہو گئی جیسے اب کسی اور کو اس میں سے ایک بُوند بھی نہیں چکھنے دے گی۔ مَیں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہہ رہی تھی کہ "سوم رس" محض میرے پینے کے لیے مخصوص تھا کسی اور شخص کا اس پر کوئی حق نہیں تھا، بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ ان لوگوں کی دانست میں بہت بڑی گستاخی اور گناہ کے مترادف ہو۔ فوجیوں نے نیرا کی بات کی طرف توجہ نہیں دی۔ اِن کی گُستاخ نگاہیں اس کے سراپا کی طرف تھیں اور وہ معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نیرا نے "سوم رس" کا برتن بڑی حفاظت اور احتیاط سے سنبھالنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ واپس چلنے کا اشارہ کیا مگر مَیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ خفگی سے مجھے دیکھ کر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑائی اور برتن کو سر پر رکھ کر واپس لوٹ گئی۔ اس کی چال میں ایک عجیب دلنوازی اور بانکپن تھا۔ خصوصاً فوجیوں کے دلوں پر تو اُس نے قیامت ہی ڈھا دی ہو گی۔ ایک تو سوم رس جیسے مشروب کا سرور اور اس پر سے نیرا جیسی بیباک اور وحشی عورت کا نشہ۔ پھر اُنھوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کچھ فاصلے پر حسن و رعنائی کا ایک بڑا خزانہ بھی موجود ہے۔ نیرا نے ایک بار پلٹ کر غصّے سے میری طرف دیکھا اور کچھ کہا۔ شاید وہ کہہ رہی تھی: "اب وہاں جم کر کیوں رہ گئے۔ آتے کیوں نہیں ہو میرے

ساتھ؟"—

سردار لوگا کی باقی ماندہ دس بیویاں اب زور زور سے کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ جب نیرا ان کے پاس پہنچی تو وہ چُپ ہو گئیں، نیرا نے اُنہیں کچھ کہا اور وہ سب پلٹ کر بستی کی طرف چل پڑیں۔ فوجیوں نے سرمستی کے عالم میں نعرے لگائے اور ان کے پیچھے چل پڑے وہ ماحول، حالات اور موقع کی نزاکت کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ شراب و شباب کے دو آتشہ نشے نے انھیں مست و بے خود کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی سٹین گنیں اُٹھا کر کاندھوں پر رکھیں اور ٹیکر سنگھ نامی فوجی نے خالص فوجی انداز میں پکارا: "اٹین شن۔" وہ سب اٹین شن ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ٹیکر سنگھ کی مخمور آواز گونجی: "ڈبل مارچ۔" اور اُن تینوں نے تیزی سے عورتوں کے تعاقب میں دوڑنا شروع کر دیا۔ نیرا اور دوسری عورتوں نے اُن کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا تو اور تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ فوجیوں پر "سوم رس" کے اثرات اب مَیں نمایاں طور پر دیکھ رہا تھا۔ ان کے قدموں کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ اور آواز کی لرزش میرے لیے اطمینان بخش تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ عورتیں اور تینوں فوجی میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ بستی تک پہنچ کر ہی دم لیں گے کیونکہ جنگلی عورتیں وحشی ہرنیوں کی طرح تیز رفتار ہوتی ہیں اور اس عالم میں جب کہ مدہوشی اور خمار نے فوجیوں کی رفتار کو خاصا سُست کر دیا تھا۔ وہ عورتیں ان کی دسترس سے باہر تھیں اور پھر مَیں یہ اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا کہ جنگل میں پہنچنے کے بعد ان کی مدہوشی کے نتیجے میں سردار لوگا اور اس کے ساتھی اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ مگر فی الحال یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

میری تمام تر توجہ اب ہیلی کاپٹر کی طرف تھی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ مَیں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا لیکن چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے قدم خود بخود تھم گئے۔ ہیلی کاپٹر کے کھُلے ہُوئے دروازے میں سے ایک سٹین گن کی نالی جھانک رہی تھی۔ اس نالی کے پیچھے کھڑا ہوا فوجی پائلٹ بھی اب مجھے صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک قد آور اور مضبوط آدمی تھا جس کے چہرے پر گھنی اور موٹی مُونچھوں کی وجہ سے مزید رُعب داب پیدا ہو گیا تھا۔ میرا رُکنا قطعی غیر ارادی تھا۔ چند لمحے بعد مَیں نے پھر آگے قدم بڑھائے اور بے خوفی سے چلتا ہوا ہیلی کاپٹر کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ جُوں جُوں مَیں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ رہا تھا، دروازے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی سٹین گن کی نالی کا رُخ بھی میرے ساتھ ساتھ سمت بدل رہا تھا۔ یہ ایک احمقانہ اقدام تھا کیونکہ نروس ہو کر پائلٹ گولی بھی چلا سکتا تھا۔ لیکن میرے لیے یہ خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ اس کے سوا میری نجات کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

مَیں ہیلی کاپٹر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ اب مَیں فوجی کو اور وہ مجھے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت اور کرختگی کے تاثرات تھے لیکن وہ مجھ سے خوف زدہ نہیں تھا۔ مَیں جنگلیوں کے لباسِ فاخرہ میں ملبوس تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، یہ خلعت سردار لوگا نے تحفے کے طور پر مجھے عطا کی تھی۔ میرا جسم ابھی تک اُن جڑی بُوٹیوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا، جن سے میری میزبان اور مہربان خواتین نے مجھے معطّر کر دیا تھا۔ میری کمر میں خنجر لٹک رہا تھا۔ سر اور پیروں سے مَیں ننگا تھا۔ یقیناً وہ فوجی مجھے ایک ٹھیٹ اور آدم بیزار جنگلی ہی سمجھ رہا ہو گا۔

چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھُورتے رہے۔ نہ مَیں نے آنکھ جھپکی اور نہ ہی اُس نے پلک جھپکائی۔ جس طرح دو شہ زور پہلوان مقابلہ شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو نگاہوں سے تولتے ہیں، وہی صورتِ حال اس وقت بھی کارفرما تھی۔ میرا چہرہ ہر طرح کے تاثرات سے قطعاً خالی تھا۔ جب کہ وہ قدرے دلچسپی اور تجسس کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی نگاہوں میں نرمی کی جھلک نمودار ہوئی اور اس کا تنا ہوا چہرہ ہلکی سی مُسکراہٹ سے ملائم اور شگفتہ ہو گیا۔ جواباً مَیں نے بھی اپنی بتیسی کھول دی۔ یہ گویا ایک طرح سے صُلح اور دوستی کا اعلان تھا۔

وہ مُسکرایا اور زور سے چیخ کر بولا: "اے جنگلی جناور! تم کو یہ شندر شندر کپڑا کدھر سے ملا؟"

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آپ ہی آپ کہنے لگا: "مگر تم میری بولی کیسے سمجھو گے۔ تمہیں تو گیدڑ اور بھیڑیوں کی زبان ہی آتی ہو گی۔" یہ کہکر وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

www.pdfbooksfree.pk

میں خاموش کھڑا اس کو تکتا رہا۔

وہ پھر ہنسا اور بولا: "ہمارے جوڑی داروں کو تم نے کدھر بھیج دیا اُستاد؟ یار تم نے تو اندر کا اکھاڑا بتایا ہوا ہے اِدھر۔ تھوڑی کرپا ہم پر بھی کرو۔ پریم کا کھیل ہم بھی کھیلنا جانتے ہیں۔"

میں پھر بھی خاموش رہا۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر ہیلی کاپٹر سے باہر آ گیا۔ تیشین گن کی نالی اُس نے میرے سینے میں چبھو دی اور کہنے لگا۔ "تم نے تو اُن کو سورگ کا راستہ دکھا دیا ہے اب اُنھیں اُدھر سے واپس کون لے کر آئے گا۔"

میں نے پہلی بار زبان کھولی۔ "آپ اُدھر جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو بھی لے چلوں گا۔"

اگر اس پر بم گر جاتا تو بھی شاید وہ اتنا حیران اور ہکا بکا نہ ہوتا۔ چند لمحے وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھتا رہا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جس شخص کو وہ نیرا جنگلی اور حیوان سمجھ رہا تھا اس کو صاف ستھری شہری زبان میں باتیں کرتے ہوئے سُن کر شاید اس کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ میں نے اُسے زیادہ حیران کرنا ضروری نہ سمجھا۔

"اچنبھے کی بات نہیں ہے دوست۔ میں جنگلی ہوں تو کیا ہوا؟ میں اُدھر شہر میں بھی رہتا تھا۔ میں نے سکول میں پڑھا ہے۔"

"آخر تم کون ہو؟ کیا اس جنگل کے سردار ہو؟ یا اس جنگل بیابان میں تم جیسے اور بھی لوگ رہتے ہیں۔"

میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ "اس جنگل میں انسان بھی رہتے ہیں مہاراج۔ بہت سے لوگ میری طرح شہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔"

"تم پھر بھی ان جنگلیوں کے ساتھ رہتے ہو؟" اس نے پُوچھا۔

"یہ اپنی برادری ہے۔ یہ سب اپنے لوگ ہیں۔ اپنوں کو چھوڑ کر کوئی کیسے جا سکتا ہے۔"

"ونڈرفل۔" وہ استعجاب سے کہنے لگا۔ "ہم کو تو کسی نے بتایا تھا کہ اِدھر سارے جنگلی اور آدم خور لوگ رہتے ہیں۔"

"آدم خور بھی رہتے ہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ اچانک دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے یُوں دیکھنے لگا جیسے میں ابھی جھپٹ کر اسے شکار کر لوں گا۔ سٹین گن کے ٹریگر پر اس کی اُنگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

"صاحب! آدم خور لوگ اِدھر سے بہت دُور ہیں پر جب داؤ لگتا ہے وہ ہماری بستی پر چڑھ آتے ہیں اور بڑی گڑبڑ کرتے ہیں۔ بچوں اور بُوڑھوں کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ جس پر دیوتا کرپا کرتا ہے بس وہی ان سے بچ سکتا ہے۔ آج رات کو بھی انھوں نے ہماری بستی پر چڑھائی کی تھی پر ہم سب مقابلے کے لیے تیار تھے۔ ہم نے انھیں مار کر بھگا دیا۔ بہت لوگ اور مُردے چھوڑ کر بھاگے ہیں وہ۔"

فوجی کسی قدر خوف سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر کہنے لگا: "تم سچ کہتے ہو؟"

"جھوٹ مارنے کی کیا ضرورت ہے مہاراج۔ ہم جنگلی لوگ شہر والوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے۔"

وہ ناراض ہونے کی بجائے ہنس پڑا۔ "تو تے کی طرح بولتے ہو۔ اس ویران جنگل میں تمہارے جیسے آدمی سے ملنے کی آشا نہیں تھی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ وہ فوجی جوان کدھر گئے ہیں؟"

"اُدھر بستی میں موج میلہ ہو رہا ہے صاحب۔ آدم خوروں کو ہرانے کی خوشی میں خوب ناچ گانا اور دارُو چل رہا ہے۔"

اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا: "اچھا! تو وہ لوگ موج منانے گئے ہیں اُدھر؟"

"آپ بھی موج منائیں مہاراج۔ چلیں گے میرے ساتھ؟ بڑی سُندر عورتیں ہوتی ہیں اس جنگل میں۔ آپ دم رس پئیں گے تو سارے سنسار کو بھول جائیں گے۔"

وہ للچا کر بولا: "وہ تو ٹھیک ہے۔ پر میں ہیلی کاپٹر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"تو پھر چنتا نہ کریں۔ آپ کے بدیلی واپس آ جائیں گے تو میں آپ کو بھی اُدھر کی سیر کرا دوں گا۔"

وہ بڑی مایوسی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ چل پڑے مگر

بے چارہ ڈیوٹی سے مجبور تھا۔

"تم سگریٹ پیتے ہو؟" اُس نے اپنا بایاں ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے انکار میں سَر ہلا دیا۔

وہ مسکرایا۔ "ارے بھائی! تمہیں یہاں خالص دیسی دارُو مل جاتی ہے پھر تمہیں سگریٹ پی کر جی جلانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ایک سگریٹ اُس نے ہونٹوں سے کھینچ کر پیکٹ سے باہر نکالی اور پھر پیکٹ جیب میں ڈال کر ایک سگریٹ لائٹر نکال لیا مگر ابھی وہ لائٹر جلانے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک سنسناہٹ کی آواز سنائی دی اور کوئی چیز ہیلی کاپٹر کے دروازے سے ٹکرا کر زمین پر گری۔ یہ ایک زکدار تیر تھا اور ظاہر ہے کہ زہر میں بجھا ہوا ہوگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک دھکّے سے فوجی کو پرے دھکیلا اور خود بھی زمین پر لیٹ گیا۔ اتنے عرصے میں دو اور تیر سنسناتے ہوئے ہمارے سَروں پر سے گزر کر دروازے سے ٹکرائے۔ پائلٹ فوجی پہلے تو میری اس حرکت کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور غصّے سے مجھے گھورنے لگا مگر دو اور تیروں کو دیکھنے کے بعد اس پر تمام بات واضح ہو گئی۔ وہ سٹین گن ہاتھ میں سنبھالے ہوئے پوزیشن لے کر کہنیوں کے بل جنگل کی طرف مُڑا۔ میں نے بھی فرش سے سَر اُٹھا کر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جہاں میں سردار کی بیویوں کے ساتھ کھڑا تھا اُب وہاں دو خونخوار آدم خور جنگلی کھڑے تھے۔ اپنے تین نشانے ضائع جاتے دیکھ کر وہ سخت برہم تھے اور ایک بار پھر کمانوں میں تیر چڑھا رہے تھے لیکن پائلٹ نے اُنھیں اس کا موقعہ نہیں دیا۔ یکے بعد دیگرے چند فائر ہوئے۔ ایک جنگلی چیخ مار کر اوندھے منہ زمین پر گر گیا جب کہ دوسرے نے زخمی شیر کی طرح ایک چھلانگ لگائی اور جنگلی زبان میں ایک نعرہ بُلند کرتے ہوئے ہماری طرف لپکا۔ جنگلیوں کی شجاعت اور بے جگری کا میں پہلے ہی قائل ہو چکا تھا جب میں نے سردار بوگا کے قبیلے کو آدم خوروں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت تو میں دل سے ان کی بہادری کا لوہا مان گیا۔ ایک خوفناک آتشیں ہتھیار سے اپنے ساتھی کو مرتا ہوا دیکھنے کے باوجود دوسرا آدم خور بھالا ہاتھ میں سنبھالے ہوئے ہم پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ اُس نے ہمیں سوچنے اور سنبھلنے کے لیے زیادہ مُہلت نہیں دی۔ ایک زقند میں وہ کئی گز کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور دوسری بار جب اُس نے اپنا جسم تول کر چھلانگ لگائی تو اس کا نشانہ ہم دونوں تھے۔ اپنے جسم پر اس کا کنٹرول قابلِ تعریف تھا اور وہ ہوا میں یُوں اُچھلا تھا جیسے سُبک خرام ہرنیاں لمبی لمبی زقندیں لگاتی ہیں مگر میرے پاس اس کی پھُرتی اور چابکدستی کی داد دینے کے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ چند لمحوں میں وہ بھالے سمیت مجھ پر آ کر گِرنے والا تھا لیکن میں نے زمین پر تیزی سے لوٹ لگا کر جگہ خالی کر دی۔ وہ ہوا میں اپنے جسم کو پلٹا نہیں سکا اور دونوں پیروں کے بل ٹھیک اُسی جگہ آ کر گرا جہاں ایک لمحہ پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے بھالے کی تیز نوک زمین سے ٹکرائی اور میں نے اپنی بروقت پھُرتی اور حاضر دماغی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن اس نے زمین سے قدم ٹکانے کے بعد ان ہی پیروں پر دوبارہ اُچھل کر چھلانگ لگائی۔ یُوں لگتا تھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ مگر اس بار میں نے اُسے پلٹنے اور ہوا میں اُچھلنے کا موقعہ نہیں دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا ایک پیر مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے بھالے کی نوک میرے سینے کی طرف تھی لیکن میں نہایت برق رفتاری سے اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے اس کو سنبھلنے کی مُہلت دے دی تو پھر میری جان کی خیر نہیں ہوگی۔

یہ میری اور اس کی پھُرتی اور مستعدی کا مقابلہ تھا۔ اس کے دوبارہ زمین پر گرنے سے پہلے میرے ایک زوردار جھٹکے کی وجہ سے اس کا توازن خراب ہو گیا اور وہ بے ڈھب انداز میں زمین پر گرا۔ اُس نے تیزی سے زمین پر لیٹ کر دوسری جانب لوٹ لگانی چاہی مگر میں اس بار اس سے زیادہ پھُرتیلا ثابت ہوا۔ اتنی دیر میں میرا خنجر میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ زمین سے اُٹھتے اُٹھتے میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے باوجود اس کی سخت جانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا بھالے والا بازو دوبارہ بُلند ہوا مگر سٹین گن کے ایک برسٹ نے اُسے گھائل کر دیا اور اس کا بازو اُٹھا کا اُٹھا رہ گیا اور جب وہ زمین پر گرا تو بے جان ہو چکا تھا۔

فوجی زمین سے اُٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ میں کیونکہ اپنے اکلوتے ہتھیار سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے لپک کر میں آدم خور کے مُردہ جسم کے پاس پہنچا اور اپنا خنجر اس کے جسم سے کھینچ لیا۔ اس نے ایک نہایت مختصر لنگوٹی باندھ رکھی تھی مگر خون

آلود خنجر صاف کرنے کے لیے وہ اُٹھ کر اُٹھ کانی تھی۔

پائلٹ اس اثنا میں ہیلی کاپٹر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"بابا تمہارا یہ جنگل بہت خطرناک ہے۔" اس نے لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت ڈراؤنا آدمی ہے۔"

میں نے خنجر کو دوبارہ گلے میں لٹکاتے ہوئے جواب دیا: "بھگوان کی کرپا ہے کہ ہم ان کے قابو میں نہیں آئے۔ یہ آدم خور لوگ ہیں زندہ انسانوں کو چبا کر کھا لیتے ہیں۔"

پائلٹ کے جسم میں ایک جھرجھری آئی اور وہ اس تصور سے ہی کانپ کر رہ گیا۔

"ہے بھگوان، کہاں پھنس گئے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری پھر جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا: "لڑائی کے میدان میں جنگ کرنا آسان ہے پر جنگل میں چھپے ہوئے آدم خور جنگلیوں سے لڑائی کرنا تو بہت جوکھوں کا کام ہے۔"

جنگل میں اس کے ساتھیوں کو گئے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کچھ دیر بعد وہ لوگ شاید زندہ لوٹ کر آجائیں یا ہو سکتا ہے کہ سردار لوگا اور اس کے قبائلی ان کی کھوج لگاتے ہوئے ہیلی کاپٹر تک آ پہنچیں۔ ایسی صورت میں میری اصلیت کا راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لیے مناسب یہ تھا کہ جتنی جلد بھی ممکن ہو سکے میں ہیلی کاپٹر پر قبضہ جما کر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں مگر پے در پے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے کہ میں اپنے کسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے قابل نہ ہو سکا تھا۔ اگر آدم خوروں کے حملوں نے صورتِ حال کو سنگین نہ کر دیا ہوتا تو میں شاید اب تک کوئی ترکیب آزما چکا ہوتا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس وقت اور کتنے آدم خور جنگلی اس گھنے اور خوفناک جنگل میں بکھرے ہوئے ہیں اور ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ آدم خوروں کو یوں تو مکمل شکست ہو چکی تھی مگر گزشتہ واقعات سے ثابت ہو چکا تھا کہ ان کے بچے کھچے جنگجو جنگل میں موجود ہیں اور چھاپہ مار سرگرمیوں کو اپنا کر اپنی شکست کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ اب اپنے دشمن پر فتح نہیں پا سکتے تھے مگر جنگلیوں کے جنگی جنون سے اب میں واقف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کا طریقۂ جنگ ہم مہذب لوگوں سے قطعی مختلف تھا۔ کسی حد تک آپ اسے حریت پسند مجاہدین کے طریقۂ واردات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ حریت پسند بھی اپنی زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اپنی کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ وقتی فتح یا شکست ان کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ وہ اس بات کو بھی اہمیت نہیں دیتے کہ اس کارروائی میں وہ زندہ بھی بچ سکیں گے یا نہیں؟ ان کا مقصدِ اوّلین محض دشمن کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے خواہ اس کوشش میں انھیں اپنی زندگی سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں۔ یہی اصول جنگلی قبائل کا بھی ہے۔ چاہے وہ امریکہ کے ریڈ انڈین ہوں یا افریقہ کے دور دراز علاقوں میں بسنے والے وحشی اور اُجڈ جنگلی قبائل۔ جب وہ حملہ آور ہوتے ہیں تو نتائج سے بے پروا ہو کر جان پر کھیل جاتے ہیں۔ یہی صورتِ حال اس وقت بھی میرے سامنے تھی۔ آدم خوروں کے جو اکا دکا لڑاکا باقی بچ گئے تھے وہ محض جان لینے اور جان دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس سے انھیں کیا حاصل ہوگا یہ سوچنے کی انھیں ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایسے دشمن از حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ ان سے لڑائی کے کسی باضابطہ اُصول کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ بھی از حد پریشان اور فکرمند نظر آرہا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس خطرناک جنگل سے فوری طور پر نکل جانا چاہتا تھا جہاں کسی بھی درخت کی اوٹ میں موت اس کی گھات لگائے کھڑی تھی۔

اُس نے ایک اور سگریٹ سلگا لی تھی اور بے چینی سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ میں آہستگی سے اس کے نزدیک چلا گیا۔

"تم نے میرے ساتھیوں کو کہاں بھیج دیا ہے؟ آخر میں کب تک یہاں ان کا انتظار کروں گا؟ ہو سکتا ہے وہ لوٹ کر ہی نہ آئیں۔"

وہ چڑچڑے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کون جانے" میں نے مختصر جواب دیا: "میں نے انھیں کہیں نہیں بھیجا صاحب۔ وہ خود ہی اُن عورتوں کا پیچھا کرتے ہوئے جنگل میں چلے گئے۔" پھر میں نے بات کا رُخ تبدیل کرنے کے لیے کہا: "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ لوگ اس موت کے جنگل میں کس لیے آئے ہیں؟ آپ کو گھومنے پھرنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی۔"

www.pdfbooksfree.pk

"بکواس" وہ جھلا کر بولا: "بیوقوف ہم گھومنے پھرنے یہاں نہیں آئے۔ اس جنگل میں تفریح کی بھلا کیا چیز ہو سکتی ہے۔"

میں نے اسے مزید کریدا: "تو پھر اور کس لیے آئے ہیں؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے جلدی سے فقرہ پورا کر دیا: "یہ جنگل اتنا بُرا بھی نہیں ہے صاحب۔ اندر جا کر دیکھیں۔ بڑی سُندر جگہ ہے۔ دریا ہیں، جھرنے ہیں، مچھلیاں ہیں۔ شکار کے لیے ہر طرح کے جنگلی جانور بھی ہیں۔"

وہ تلخی سے بولا "اور خوبصورت عورتیں بھی ہیں جو ہر آنے والے کا دل لُبھانے کے لیے تیار رہتی ہیں۔"

"جی۔ بہت سُندر لڑکیاں ہیں اور جب کبھی تہوار ہوتا ہے تو خوب ناچ گانا اور موج میلہ ہوتا ہے۔ آج بھی سردار نے بستی میں سبھا جمائی ہے۔ آپ کے ساتھی بھی اُدھر بیٹھ گئے ہوں گے ـــ آپ کی مرضی ہو تو آپ کو بھی اُن کے پاس لے چلوں؟"

وہ بدمزاجی سے بولا: "یہ بات تمہاری جنگلی کھوپڑی میں نہیں آئے گی۔ ہم اتنی دُور ناچ گانا دیکھنے نہیں آئے اور اگر میں بھی تمہارے ساتھ چلا گیا تو اس کی حفاظت کون کرے گا؟" اس نے ہاتھ سے ہیلی کاپٹر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، نہ کوئی اسے توڑ سکتا ہے۔ نہ اسے اُٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ یہ تو دیوتاؤں کی بنائی ہوئی ایسی چیز ہے جسے جنگل میں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ تھوڑی دیر آپ بھی دل بہلا لیں۔ ہمارا سردار مہمانوں کی بہت سیوا کرتا ہے۔"

"یار کیوں کان کھا رہے ہو۔" وہ قریب قریب ڈانٹ کر کہنے لگا: "تم اور تمہارا سردار جائیں بھاڑ میں۔ ہم اِدھر ایک بہت خطرناک دُشمن کی تلاش میں آئے ہیں۔ کھیل تماشہ دیکھنے نہیں آئے۔"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا: "آپ کا دُشمن اور اس جنگل میں؟ ہم جنگلیوں سے آپ کی دُشمنی کیسے ہو سکتی ہے صاحب۔"

"وہ جنگلی نہیں ہے۔ ہمارے دُشمن مُلک کا فوجی ہے۔ بہت بہادر اور بے خوف سپاہی ہے۔ اس نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اسی علاقے میں کہیں بھاگ کر آگیا ہے۔" پھر وہ یکایک پُوچھنے لگا: "سنو! تم نے اس طرف کوئی فوجی آدمی تو نہیں دیکھا؟"

"آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے سوا اور کوئی فوجی ہم نے نہیں دیکھا صاحب۔" میں نے معصومیت سے جواب دیا: "اور کوئی اکیلا فوجی تو اس جنگل میں آ بھی نہیں سکتا۔ اگر آ بھی جائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ یہاں پگ پگ پر آدم خور جنگلی پھیلے ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے مجھ سے اتفاق کیا: "پرائی کمان کو کون سمجھائے۔ سچ کہتے ہو تم۔ اگر وہ سُسرا اِدھر آیا بھی ہوگا تو اب تک آدم خوروں کے پیٹ کا ایندھن بن چکا ہوگا۔" وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔

"وہ اکیلا آدمی اتنا خطرناک کیسے ہو گیا صاحب۔" میں نے اُسے باتوں میں لگانے کے لیے پُوچھا اور آہستگی سے اس کی طرف بڑھنے لگا: "کیا اس کے پاس بھی توپ ہے؟ ہوائی جہاز ہے؟"

"اس کے پاس دماغ ہے۔"

"دماغ؟" میں نے حیرت سے کہا: "دماغ کیا ہوتا ہے صاحب، کیا کوئی بہت خطرناک توپ ہوتی ہے یہ؟"

بدمزاجی کے باوجود وہ اچانک ہنس پڑا: "دماغ نہیں جانتے؟ وہ جو اِدھر سر کے اندر ہوتا ہے جس سے انسان سوچتا ہے، غور کرتا ہے۔" اس نے اُنگلی اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے کہا: "یہ سب توپیں، ہوائی جہاز، خطرناک ہتھیار کسی نے دماغ سے سوچ کر ہی بنائے ہیں۔ اگر انسان کے پاس دماغ نہ ہوتا تو وہ بھی جانوروں کی طرح رہتا۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے جنگلی لباس پر تحقیر آمیز نظر ڈالی اور مُسکرایا: "تمہاری طرح رہتا۔ جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا۔ اپنی زندگی یوں ہی ضائع کر دیتا۔"

"کیا انسان ہم جنگلیوں سے زیادہ دماغ والا ہوتا ہے؟" میں نے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔ میں اس اثنا میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنی سٹین گن اُٹھا لی اور چوکنا ہو گیا۔ شاید اسے اچانک یاد آگیا تھا کہ وہ ایک فوجی تھا اور ہر دم مستعد اور نادیدہ دُشمن سے ہوشیار رہنا اس کے فرض کا ایک حصہ تھا۔ کیا اُس نے میرے ذہن کو پڑھ لیا ہے اور میری طرف سے مشکوک

www.pdfbooksfree.pk

ہو چکا ہے؟ مَیں نے سوچا مگر بظاہر وہ میری طرف سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔

مَیں احتیاط کے طور پر اس سے کچھ دُور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔ ہمارے تین اطراف گھنا جنگل تھا۔ صرف ایک جانب کافی دُور تک کھلا میدان چلا گیا تھا۔ شاید اسی لیے ان لوگوں نے اپنا ہیلی کاپٹر اُتارنے کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پنکھے بدستور حرکت میں تھے اور اس سے پیدا ہونے والے شور کی وجہ سے ہم دونوں بہت بُلند آواز میں چیخ چیخ کر باتیں کرنے پر مجبور تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کے شور کے سوا جنگل میں ہر طرف سناٹا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ اب دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا اور سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ نکال رہا تھا۔ اس کے پیکٹ سے سگریٹ نکالنے کا طریقہ وہی تھا جو اُس نے اس سے پہلے اختیار کیا تھا۔ ایک ہاتھ سے پیکٹ کھول کر اُس نے پیکٹ کو آگے کی طرف جھٹکا اور ایک سگریٹ ہونٹوں سے پکڑ کر باہر نکال لی۔ سگریٹ کے پیکٹ کو دوبارہ جیب میں رکھنے کے بعد اُس نے سگریٹ لائٹر نکالا اور سگریٹ کو سُلگانے لگا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں سٹین گن کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ مختصر سے وقفے میں جنگل میں جو واقعات پیش آ چکے تھے اُن کے پیشِ نظر اس کا چوکنّا اور ہوشیار رہنا ایک قدرتی عمل تھا لیکن میرے لیے ہر لمحہ قیمتی تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی ایسا واقعہ رونما ہو سکتا تھا جو میرے مفرور ہونے کے اس نادر موقع کو ضائع کر دیتا۔ لہٰذا مَیں نے فوری طور پر عملی اقدام اُٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ مَیں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور مَیں نے کہا "سنو! کیا تم اُوپر والے پنکھے بند نہیں کر سکتے؟"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

مَیں دو قدم اور اُس کی طرف بڑھ گیا "مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہے مگر یہ مت بھولو کہ اُن کی آواز سُن کر جنگل میں دُور دُور تک یہ خبر پھیل جائے گی اور اگر کچھ اور آدم خور لوگ آس پاس ہوں گے تو وہ سب اس طرف آ جائیں گے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"تم نہیں جانتے۔ یہ جنگلی لوگ جب چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں تو بچنا مُشکل ہو جاتا ہے۔ تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گے۔"

خوف کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے مگر وہ بظاہر مطمئن تھا۔ "فکر مت کرو۔ میرے پاس یہ سٹین گن موجود ہے۔ جنگلی کیا چیز ہیں اس سے تو ہم بڑی بڑی فوجوں سے مقابلہ کر کے اُنھیں بھگا دیتے ہیں۔"

"اور اگر وہ سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوئے تب کیا ہو گا؟"

وہ غصّے میں میری طرف پلٹا "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ مَیں ان ننگ دھڑنگ جنگلیوں سے ڈر جاؤں گا؟ مَیں نے بہت سی لڑائیوں میں حصّہ لیا ہے مجھے تمغے بھی ملے ہیں۔ یہ دیکھو؟" اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے نشانوں کی طرف اشارہ کیا۔ "مگر تم انہیں کیا سمجھو گے؟ شہر میں رہنے کے باوجود تم ہو تو بالکل جنگلی......"

یکایک وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ مَیں نے نگاہیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی نظریں میری گردن اور سینے پر تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا اور سٹین گن پر اس کی اُنگلیوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر میری نظر فوراً اپنے سینے کی طرف چلی گئی اور مَیں اس کی تشویش کا سبب جان گیا۔ میرے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر میں لٹکا ہوا لفظ "اللّٰہ" بالکل نمایاں طور پر اس کو نظر آ رہا تھا۔ یہ زنجیر مَیں کسی وقت ایک لمحے کے لیے بھی گلے سے نہیں اُتارتا تھا۔ جنگل میں پناہ لینے کے بعد بھی مَیں نے اسے جنگلیوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور اس وقت بھی مجھے پورا یقین تھا کہ یہ میرے لباس میں چھپی ہوئی ہے لیکن پچھلے چند گھنٹوں کی بھاگ دوڑ اور جنگ و جدل کے دوران میں وہ اب نمایاں ہو گئی تھی۔ محض سونے کی زنجیر ہوتی تو شاید کوئی فکر کی بات نہ تھی، لیکن اس کے عین درمیان میں نمایاں طور پر لکھا ہوا لفظ "اللّٰہ" اس کو چونکانے اور مشکوک کر دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ مَیں نے پریشانی سے لفظ "اللّٰہ" کو اور پھر دوبارہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے فوجی کو دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اُس کی سٹین گن کی نالی کا رُخ زمین کی طرف تھا، لیکن مَیں چاہے کتنی بھی برق رفتاری سے اس کی طرف لپکتا۔ میرے اُس تک پہنچنے سے پہلے اس کی سٹین گن کی گولیاں میرے جسم میں لاتعداد سوراخ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

"تم.....؟" اس نے سگریٹ پھینکتے ہوئے اُنگلی سے میری طرف اشارہ کیا مگر دوسرے ہی لمحے بجلی کی طرح میرا ہاتھ خنجر کو نکال کر اُس کی طرف اُچھال چکا تھا۔ ہمارے مابین فاصلہ بہت کم تھا اور نشانہ خطا ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی مگر میرا ہاتھ بے ڈھب تھا نہ میرے پاس اتنا وقت اور مہلت تھی کہ اپنے جسم اور ہاتھ کو تھوڑی سی جُنبش دیکر صحیح زاویہ بنا لیتا۔ خنجر پھینکنے کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی اور شاید وہ میرے ہاتھ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر میرا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس نے تیزی سے ایک طرف ہٹ کر میرا وار خالی کر دیا اور اب تمام پتّے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس کی سٹین گن کی نالی بلند ہو کر میرے سینے کا نشانہ لے چکی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اُس نے قریباً پونے انچ مربع سونے کے ٹکڑے کو اپنے نشانے کی زد پر لیا تھا جس پر لفظ "اللّٰہ" کندہ تھا۔ اب مجھے اس کی گولیوں کی بوچھاڑ اور موت سے بچانے والا اللّٰہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"کون ہو تم؟" اُس نے کرخت لہجے میں پُوچھا "سچ بتانا۔ اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گا۔" وہ مجسّم موت بن کر میرے سامنے تنا کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے سچ بولنے کو کہا تھا اور اس کی نظروں نے لفظ "اللّٰہ" کو بھی دیکھ لیا تھا جو میرے دل کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ اس آخری وقت میں جھوٹ بول کر اپنی جان بچانے کی کوشش نہ صرف مذہبی اور اخلاقی طور پر غلط ہو گی بلکہ اس طرح میں اپنی جان بھی نہ بچا سکوں گا۔ اس کو میرے جھوٹ پر یقین نہیں آئے گا اور پھر سچ جاننا اس کے لیے ویسے بھی مُشکل نہیں تھا۔

چنانچہ مَیں نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بے خوفی سے کہا "مَیں وہی ہوں جو تم مجھے سمجھ رہے ہو۔ جسکی تلاش میں تم اور تمہارے ساتھی جنگل جنگل گھوم رہے ہیں۔ جس نے تمہاری فوج کو تتر بتر کر دیا ہے جس نے تن تنہا تمہاری فوجی طاقت کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے ہیں۔ مَیں تمہارا دُشمن ہوں۔"

وہ میری صاف گوئی پر حیران رہ گیا۔ پھر ہنسا اور بولا "بہادر آدمی ہو۔ کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟"

مَیں نے کہا "زندگی سے زیادہ مجھے اپنے وطن سے اور اپنے فرض سے پیار ہے۔ اور پھر اگر میری موت تمہارے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو پھر مَیں چاہے کتنے ہی جھوٹ بولوں۔ دُنیا کی کوئی طاقت میری جان نہیں بچا سکتی۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔ پھر بولا "تم شاید نہیں جانتے کہ تم ہمارے لیے کتنے مہنگے آدمی ہو۔ تمہاری جان نہیں بچ سکتی مگر یہ کام اس اکیلے اور سنسان جنگل میں میرے ہاتھوں سے نہیں ہو گا۔ تمہیں ہائی کمان کے سامنے پیش کر کے مَیں تمغے لوں گا اور پھر وہ تم سے مزید معلومات حاصل کریں گے۔ اُس کے بعد تمہاری زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

گویا ابھی موت کا لمحہ مجھ سے دُور تھا اور اس تصور نے میرے اندر ایک خاص قسم کی وحشی اور توانائی پیدا کر دی۔ میری خود اعتمادی جو ایک پل کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی اس کے ایک جملے سے فوراً واپس آ گئی۔ فی الحال مَیں نہیں کہہ سکتا اور یہ خیال میرے لیے انتہائی فرحت بخش اور خوش آئند تھا۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم اس جنگل میں کیا کر رہے تھے اور تم نے ہمارے جوانوں کو کہاں بھیجا ہے؟"

میری شوخی اور ظرافت کی حس پھڑک اُٹھی۔ مَیں نے کہا "مَیں اس جنگل میں فوج بھرتی کر رہا تھا اور مَیں نے جنگلیوں کی کافی بڑی فوج بنا لی ہے۔ اُن کے پاس زہریلے ہتھیار بھی ہیں۔ اس جنگل میں دُشمن کی بڑی سے بڑی فوج بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تمہارے ساتھیوں کو مَیں نے موت کی راہ پر چلتا کر دیا۔ وہ تو اب تک آدم خوروں کی خوراک بن چکے ہوں گے۔ اس لیے تم ان کی واپسی سے نااُمید ہو جاؤ۔"

"یو باسٹرڈ۔" وہ غصّے سے بے قابو ہو کر چلّایا "دھوکہ باز تمہیں اُن کی موت کا حساب چُکانا ہو گا۔"

"حساب تو بہت لمبا ہے دوست۔" مَیں نے ٹھنڈی آواز میں اطمینان سے کہا "کس کس ساتھی کی موت کا حساب لو گے مجھ سے؟ درجنوں نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو مَیں نے جہنم رسید کیا ہے۔ تم ایک اکیلے آدمی ہو۔ اتنا لمبا چوڑا حساب کرنا تمہارے بس

www.pdfbooksfree.pk

کی بات نہیں ہے۔"

میں اسے مشتعل کر کے کسی اضطراری فعل پر اُکسا رہا تھا تاکہ اس سے فائدہ اُٹھا سکوں۔ میرے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گئے۔ وہ دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک منٹ کے لیے مجھے خیال گزرا کہ شاید وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے گا اور مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا مگر وہ محض دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے انگریزی زبان میں مجھے موٹی موٹی غلیظ گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور پھر سٹین گن کی نالی لہرا کر بولا "فوراً ہیلی کاپٹر میں سوار ہو جاؤ ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرنا۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا مگر تمہیں معذور کر دوں گا۔ تم شاید اپنے ہاتھوں اور پیروں سے محروم ہونا پسند نہیں کرو گے؟"

اس کی بات میں سچائی تھی۔ بھلائی اسی میں تھی کہ میں چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل کروں ورنہ وہ یقیناً اپنی دھمکی کو سچا کر دکھائے گا۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا مسلح ہونے کے باوجود وہ چونک کر پھرتی سے چند قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ میرا خوف، رعب اور دبدبہ اس پر پوری طرح حاوی تھا۔ مجھے اپنے دشمن پر نفسیاتی برتری ضرور حاصل تھی۔

میں ہیلی کاپٹر پر سوار ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اُسی لمحے میری پشت کی جانب آہٹ سنائی دی۔ غیر ارادی طور پر میں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کی نظریں بھی جنگل کی طرف اُٹھ گئیں جہاں چار جنگلی آدم خور اچانک نمودار ہو گئے تھے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بھالے تھے جو انہوں نے ہوا میں اوپر اُٹھائے ہوئے تھے۔ باقی دو جنگلی اپنی کمانوں میں تیر چڑھا رہے تھے اور اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ ان کے تیر زہر میں بجھے ہوئے تھے مگر اس بار فوجی پائلٹ ضرورت سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر اُس نے سٹین گن کا رُخ جنگلیوں کی طرف موڑ دیا۔ فائرنگ کی آواز گونجی اور وہ چاروں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ میرے لیے یہ نادر موقع تھا۔ میں نے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ میں تیزی سے مڑا اور دوڑ کر پوری طاقت سے اپنا جسم اس کے جسم سے ٹکرا دیا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں اس کے جسم کے کون سے حصے کو نشانہ بناؤں گا مگر جب میرا جسم اس سے ٹکرایا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ سٹین گن اس کی گرفت سے چھوٹ کر فضا میں اچھلی اور دور جھاڑیوں میں جا گری مگر اس تصادم نے خود مجھے بھی غیر متوازن کر دیا اور میں چند گز دور جا گرا۔ پائلٹ نے سٹین گن کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نمایاں وہ میری شہرت اور شخصیت سے مرعوب تھا اور مجھ سے دوبدو مقابلہ کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُس کی پھرتی واقعی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس سے پہلے کہ میں زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہوتا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور ہیلی کاپٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس میں بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ میرے اُٹھتے اُٹھتے اس نے ہیلی کاپٹر پر اپنا کنٹرول سنبھال لیا اور جب میں زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو ہیلی کاپٹر جو اس تمام عرصے میں سٹارٹ ہی رہا تھا حرکت کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شکر ہے کہ اس کی رفتار کم تھی ورنہ میرا قیمہ بن چکا ہوتا۔ میں دوبارہ زمین پر گرا اور لوٹ لگا کر دور چلا گیا۔ میرا مقصد سٹین گن پر قبضہ کرنا تھا لیکن اُس طرف جانے کی مہلت نہ تھی اس لیے مخالف سمت میں لوٹ پوٹ ہو کر جب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوا تو ہیلی کاپٹر پھر میری نظروں کے سامنے تھا اور ایک مہیب عفریت کی طرح میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ تھی سٹین گن مجھ سے مخالف سمت میں کافی فاصلے پر پڑی تھی اور خود رو گھاس اور جھاڑیوں میں اسے تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دوسری طرف گھنا جنگل تھا۔ میں جنگل کی طرف بھاگ کر ہیلی کاپٹر کی زد سے محفوظ ہو سکتا تھا لیکن ایسی حالت میں جب کہ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ قدم قدم پر آدم خوروں سے بھرے ہوئے جنگل میں پہنچ جانا میرے لیے موت کا پیغام بن سکتا تھا۔ ایسی صورت میں نجات اور بچاؤ کی محض ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ میں چوتھی سمت میں کھلے میدان کی طرف نکل جاؤں۔ یہاں میں ہیلی کاپٹر سے محفوظ نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کے سوا میرے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ آناً فاناً یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے ہوا میں چند قلابازیاں لگائیں اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی زد سے باہر نکل کر کھلے میدان کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ہیلی کاپٹر سے میرے اوپر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پائلٹ کے پاس کوئی اور آتشی ہتھیار نہیں تھا۔ یا پھر وہ پائلٹ کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہوئے مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں بے تحاشا میدان میں بھاگا جا رہا تھا جس کے دوسرے کنارے پر ٹیلے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ اگر میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کم از کم ہیلی کاپٹر کے حملوں سے محفوظ ہو سکتا ہوں۔ پلٹ کر دیکھا تو ہیلی کاپٹر بدستور میرے تعاقب میں تھا اور اس بار زیادہ تیز رفتاری سے مجھ پر چڑھا آ رہا تھا۔ آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور زمین بھی خاصی ہموار تھی۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا لیکن پائلٹ بھی میرا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اُس نے ہیلی کاپٹر کو اور نیچا کر لیا اور جب وہ خوفناک شور کے ساتھ میری طرف بڑھا تو ایک بار پھر مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ میں بالکل زمین سے چپک کر نشیب کے بل چت لیٹا ہوا تھا مگر خبیث پائلٹ ہیلی کاپٹر کو مزید نیچے لے آیا تھا اور مجھے کچلنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مجھے جتنی بھی دعائیں یاد تھیں وہ از خود میری زبان پر رواں ہو گئیں۔ موت اور خدا مجھے بیک وقت یاد آ رہے تھے۔ شاید میرا آخری وقت آ چکا تھا اور میرے خدا نے مجھے اپنے پاس بلانے کا حکم دے دیا تھا موت کا تو ایک وقت متعین ہوتا ہی ہے۔ اگر میری موت اس آہنی ہیلی کاپٹر سے کچل کر لکھی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں بچا سکتی یہ سوچنے کے باوجود میں اپنی فوجی تربیت اور آخر دم تک مقابلہ اور مدافعت کرنے کی عادت سے مجبور تھا اس لیے کھلی آنکھوں سے ہیلی کاپٹر کو موت کا پیغام بن کر اپنے اوپر نازل ہوتا ہوا دیکھنے کے باوجود آخری دم تک مزاحمت کے لیے تیار تھا۔

مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر ہیلی کاپٹر کی رفتار یکایک کچھ اور تیز ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ اتنا نیچا ہو گیا کہ گھاس اور خود رو پودے اس آہنی جنگلے سے ٹکرانے لگے جنہیں ہیلی کاپٹر کی ٹانگیں سمجھ لیجیے کیونکہ ان ہی ٹانگوں پر ہیلی کاپٹر زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ ہیلی کاپٹر دوسرے ہی لمحے میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو زمین سے اور زیادہ چپکا لیا۔ اگر پائلٹ ہیلی کاپٹر کو اتنی نچائی پر لائے گا تو خود اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر یہ مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ صرف یہی ایک خیال میرے لیے آخری آس کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک دیوزاد آہنی پرندے کی طرح مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کے پنکھوں کی ہوا کی شدت سے آس پاس کے پودے اور درخت جھوم رہے تھے۔ خود میں بھی کوشش کے باوجود پوری طرح اپنی آنکھیں کھول کر رکھنے میں سخت دشواری محسوس کر رہا تھا۔ مگر میں موت کو آخری سانسوں تک اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر مہیب آواز کے ساتھ مجھ تک پہنچا۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ پائلٹ کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کی اونچائی اتنی تھی کہ وہ مجھے کچل نہیں سکتا تھا۔ میرے حواس پوری طرح میرے قابو میں تھے اور میں نے اسی لمحے ایک اور فیصلہ کر لیا۔ ہیلی کاپٹر کی ٹانگیں میرے جسم اور چہرے سے محض ایک یا دو انچ کے فاصلے پر تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے، ٹانگوں کو بالکل سیدھا پھیلایا اور آہنی جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہیلی کاپٹر تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور میرا جسم اور ٹانگیں اس کے ساتھ ہی زمین پر گھسٹنے لگیں۔ خود پائلٹ بھی زیادہ دیر تک ہیلی کاپٹر کو اتنی کم اونچائی پر رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ میرا انجام دیکھنے کا بھی خواہش مند تھا۔ دوسرے ہی لمحے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں بھی اوپر اُٹھنے لگا۔ میں نے لوہے کے جنگلے پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ اگر دشمن آہنی تھا تو میرا عزم بھی آہنی تھا۔

جب ہیلی کاپٹر فضا میں کچھ اور بلند ہوا تو میں اس کو پکڑے ہوئے اس کے نیچے لٹک رہا تھا۔ پائلٹ نے پلٹ کر اس جگہ دیکھا ہو گا جہاں کچھ دیر پہلے تک میں لیٹا ہوا تھا مگر مجھے وہاں موجود نہ پا کر اسے جو حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی اس کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ اتنی شدید پریشانی اور خطرے کے باوجود میں پائلٹ کی متوقع حیرانی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پائلٹ نے کھلے میدان میں ایک دو اور چکر لگائے مگر میرا وجود اسے نظر نہ آیا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور غالباً میری فضا میں لہراتی ہوئی ٹانگیں اسے نظر آ گئیں۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی رفتار اور تیز کر دی اور اُسے تیزی سے دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ میرا جسم فضا میں ہلکورے کھا رہا تھا مگر میری گرفت بدستور مضبوط تھی۔ پائلٹ نے بھی غالباً صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ فضا میں ہیلی کاپٹر کو چند تیز جھٹکے اور قلابازیاں دینے کے باوجود جب وہ مجھے زمین پر گرانے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اُس نے یکلخت ہیلی کاپٹر کو اونچائی پر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ کھلا میدان بہت جلد میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور ایک بار پھر جنگل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ علاقہ قدرے سنگلاخ تھا۔ اونچے نیچے پہاڑی ٹیلے اور یہاں وہاں پتلی پتلی ندیاں مجھے صاف طور پر نظر آ رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر خاصی تیز رفتاری سے پرواز کر رہا تھا اور میں اس سے ابابیل کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ پائلٹ کو میری سخت جانی کا پورا علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی

www.pdfbooksfree.pk

بھانک کر یہ تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ آیا میں بدستور ہیلی کاپٹر سے چمٹا ہوا ہوں یا جنگل میں کہیں گر چکا ہوں۔ میں اس کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ اس کے جو ساتھی جنگل کے اندر داخل ہوئے تھے وہ اب تک موت کا نوالہ بن چکے ہوں گے اور ان کی واپسی کا مطلق کوئی امکان نہیں ہے۔ ان کی واپسی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ جلد سے جلد مجھے زندہ سلامت اپنے ہیڈ کوارٹر پر لیجا کر سُرخروئی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اُس نے کس قدر نایاب اور قیمتی شکار پکڑا ہے وہ مجھے بتا چکا تھا کہ میری سرگرمیوں کی وجہ سے دُشمنوں کی صفوں میں مجھے کتنی اہمیت دی جانے لگی ہے۔

ہیلی کاپٹر کا سفر کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ اپنی کٹھن فوجی تربیت کے باوجود اب یوں فضا میں لٹکا رہنا میرے لیے دُشوار ہوتا جا رہا تھا۔ مسلسل لٹکے رہنے کی وجہ سے میرے بازو قریب قریب شل ہو چکے تھے۔ میری اُنگلیاں آہنی جنگلے پر بدستور جمی ہوئی تھیں مگر میرے جسم کے بوجھ اور ہوا کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے اب وہ جواب دیتی جارہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کی بُلندی کافی زیادہ ہو چکی تھی اور اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ پائلٹ جلد سے جلد اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچنے کی دُھن میں تھا۔ نیچے جنگلوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کے درمیان یہاں وہاں کچے مکانات اور جھونپڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ جب ہم کھیتوں اور گاؤں پر سے گزرے تو نیچے اور کسان مرد اور عورتیں سر اُٹھا کر حیرت سے یہ نظارہ دیکھتے کہ ہیلی کاپٹر سے ایک شخص لٹکا ہوا ہے۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاید وہ اس کو بھی فضائی مظاہرے اور مشق کا ایک حصّہ سمجھ رہے تھے۔ وہ اُنگلیاں اُٹھا اُٹھا کر میری طرف اشارے کرتے اور ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر باتیں بھی کرتے۔ میرا زمین سے فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کے چہرے تو بالکل واضح نہیں تھے مگر میں ان کے اشارے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور وہ اسے محض ایک تماشا اور فضائی کرتب سمجھ رہے تھے۔

پائلٹ بھی غالباً اس تماشے سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مگن ہو کر کبھی ہیلی کاپٹر کو فضا میں زیادہ اُونچا اُٹھا لیتا اور کبھی اسے نیچائی پر لے جاتا۔ میں چشم تصور سے اس کا خوش و خرم اور دمکتا ہوا چہرہ صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں اور دیہاتی آبادیاں، کھیت کھلیان اور دریا میری نظروں کے سامنے تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔ کبھی ہم ویران علاقوں اور جنگلوں پر سفر کرنے لگتے اور پھر ایکا ایکی کھیت اور گاؤں نظر آنے لگتے مگر یہ بات تو طے شدہ تھی کہ جنگلی قبائل کے علاقے کو ہم کہیں بہت دُور چھوڑ آئے تھے اور اب مہذب علاقے پر پرواز کر رہے تھے۔ ایک بار پائلٹ نے کھیتوں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو اتنا پست کر دیا کہ میں کوشش کرتا تو کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کو اپنی ٹانگوں سے چھُو سکتا تھا۔ ایک سبزی کے کھیت پر سے گزرے تو ایک من چلے کسان نے اپنی لاٹھی گھما کر مجھ پر حملہ کیا اور اگر میں بروقت اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اُوپر نہ اُٹھا لیتا تو یقیناً ٹانگیں تڑوا لیتا۔ ایک بستی میں چند بچے پتنگ بازی میں مصروف نظر آئے۔ میں نے ٹانگیں ہلا کر ایک کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور کو اپنے پیروں میں بھی لپیٹ لیا جو کافی فاصلے تک ہمارے ہیلی کاپٹر کے ساتھ ساتھ اُڑتی رہی۔ اس اثنا میں کھیتوں میں موجود لڑکے شور مچاتے ہوئے ہمارے تعاقب میں دوڑتے رہے۔ اِن میں سے بعض نے اُچھل اُچھل کر میری ٹانگیں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔

اس دلچسپ منظر نے میری تھکن اور بوریت کو کسی حد تک کم کر دیا اور کچھ دیر کے لیے میں بھی اس تماشے سے لُطف اندوز ہونے لگا لیکایک ایک شریر دیہاتی بچّے نے پوری قوت سے اپنی غلیل کھینچ کر میری طرف نشانہ باندھا اور اس کا غلّہ میرے چہرے کے نزدیک سے ہو کر نکل گیا۔ اگر وہ میری آنکھ یا پیشانی پر لگ جاتا تو خطرناک زخم بھی آسکتا تھا۔ پائلٹ نے یکلخت ہیلی کاپٹر کو زمین سے اُونچا کر دیا اور میں ان لوگوں کی زد سے باہر نکل گیا۔

اب یہ سب کچھ رفتہ رفتہ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے بازو قریباً سُن ہو چکے تھے اور اب میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کر کے اس پر عمل کر ڈالوں ورنہ میری قوتِ برداشت کے جواب دے جانے کی صورت میں کوئی حادثہ پیش آسکتا تھا اور میں کسی بھی جگہ گر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا سفر مزید کتنی دیر جاری رہے

گا میں نے یکایک ایک فیصلہ کیا اور ایک مقام پر جب ہم ایک ندی کے اُوپر سے گزر رہے تھے میں نے اللہ کا نام لے کر ہیلی کاپٹر کے آہنی جنگلے کو چھوڑ دیا۔ اپنی ٹانگیں یکجا کر کے سمیٹیں اور پانی میں کُود گیا۔ یہ میرے لیے کوئی نئی اور انوکھی بات نہ تھی۔ اپنی فوجی تربیت کے زمانے میں اس قسم کی مشقیں میں بارہا کر چکا تھا مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ تربیت ہمارے اپنے علاقے میں ہوا کرتی تھی۔ اور میں اس کے لیے بالکل تازہ دم ہوا کرتا تھا جبکہ اس وقت صورت حال اس کے برعکس تھی۔

پانی میں گرنے کے بعد میں نے لمبا غوطہ لگایا اور ندی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میں پائلٹ کی نظروں سے اوجھل رہوں اور اگر آس پاس کوئی شخص مجھے دیکھ رہا ہو تو میں آسانی سے اس کے قابو میں نہ آجاؤں۔ ندی کا پانی ٹھنڈا تھا مگر اس کی گہرائی بہت زیادہ نہ تھی۔ چند منٹ کے بعد میرے پیر ندی کی سطح سے ٹکرائے تو میں نے دونوں بازو سمیٹ کر آگے کی جانب پیراکی شروع کر دی۔ پانی کے اندر تیرتا ہوا میں کافی دُور نکل گیا یہاں تک کہ پانی کے اندر سانس روکے رکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ میں نے جسم کو سمیٹ کر اُوپر کی جانب حرکت دی اور میں اس بار کسی کاوش کے بغیر پانی کی سطح پر پہنچ گیا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ہر طرف ویرانی اور خاموشی تھی۔ دُور دُور تک چند بھینسوں اور گائے بیلوں کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں بے حد زیادہ تھکا ہوا تھا مگر احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ میں کچھ دیر زیرِ آب اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ چنانچہ ایک لمبی سانس لینے کے بعد میں دوبارہ پانی کے اندر غائب ہو گیا اور میں نے پانی کے بہاؤ کے رُخ تیرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک دانشمندانہ ترکیب تھی جس کی وجہ سے مجھے زیادہ ہاتھ پیر مارنے اور جسمانی مشقت کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اسی طرح میں پانی کے اندر تیرتا رہا اور فاصلہ طے کرتا رہا۔ جب تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی میں ندی کی سطح پر آ جاتا۔ پیراکی میں مہارت میرے کام آرہی تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی میرا مددگار تھا۔ جس کی وجہ سے میرا سفر بہت تیزی سے گزرا اور تھوڑے عرصے میں میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ مگر اب میرے ہاتھ پیر جواب دینے لگے تھے اور سانس بھی سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ چنانچہ مجبوراً میں نے پانی سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ایک پُرفضا مقام تھا۔ چاروں طرف ہریالی اور قدآور پھلدار درختوں کا سایہ تھا۔ غالباً یہ کوئی باغ تھا۔ ندی سے باہر نکل کر کچھ دیر میں کنارے پر لیٹا لمبے لمبے سانس لے کر اپنے آپ کو تازہ دم اور بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سانس قابو میں آئی تو میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا اور باغ میں اس وقت کوئی رکھوالا بھی موجود نہ تھا۔ میں سر جھکائے ہوئے بھاگا اور میں نے درختوں کے سائے میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ پھر مجھے اپنی کوئی سُدھ نہ رہی۔ گزشتہ کئی گھنٹوں کی اعصاب شکن کشمکش اور جسمانی تھکن نے مجھے چُور چُور کر دیا تھا۔ لیٹتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ نیند جو قدرت کا بہت بڑا عطیہ اور انعام ہے ہم کو اس بات سے آگاہی نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گہری نیند بے شمار تکالیف اور بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ اتنی بڑی نعمت ہے جس کا اندازہ انسانوں کو اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اس سے محروم ہو جاتے ہیں یا اُس میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت احساس پیدا ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف جو راحت بے مول اور بن مانگے مل رہی تھی اس سے محروم ہونے کے بعد زندگی کتنی دشوار بلکہ وبال ہو جاتی ہے۔

خدا جانے کتنی دیر میں سوتا رہا۔ آنکھ کھُلی تو شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اُونچے اُونچے درختوں کے گھنے پتّوں اور شاخوں نے سائبان سا تان دیا تھا۔ کچھ دیر میں بے حس و حرکت پڑا۔ اپنے ہوش و حواس مجتمع کرتا رہا۔ کچھ دیر سو لینے کی وجہ سے میں اپنے جسم میں تازگی اور توانائی محسوس کر رہا تھا، لیکن اب بھوک نے ستانا شروع کر دیا تھا۔ میں کروٹ بدل کر اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ باغ میں کوئی نہ تھا۔ خدا جانے یہاں کوئی مالی یا رکھوالا ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوچ کر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے آس پاس پھلوں کے درخت تھے، لیکن فی الوقت میرے لیے سب سے کارآمد امرود ہو سکتے تھے۔ درخت چھوٹے بڑے امرودوں سے لدا ہوا تھا۔ میں نے درخت پر چڑھ کر امرود کھانے شروع کر دیئے۔ امرود بہت لذیذ تھے۔ اس وقت تو اگر بدمزہ بھی ہوتے تو لطف دے جاتے۔ امرود ایک ایسا پھل ہے جو شکم پُری بھی کرتا ہے اور لذیذ بھی ہے۔ کافی دیر کا بھوکا تھا اور درخت پر

www.pdfbooksfree.pk

امرودوں کی کمی نہ تھی اس لیے یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ میں کافی دیر تک اپنا پیٹ بھرتا رہا یہاں تک کہ پیٹ بھی بھر گیا اور نیت بھی ساب بھٹپٹا ہو چلا تھا۔ کہیں دُور سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی تو مجھے اندازہ ہوا کہ آبادی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لیکن کیا اس وقت اور اس حلیے میں بستی میں جانا میرے لیے سُود مند ہوگا؟ میں نے سر سے پیر تک اپنا جائزہ لیا۔ میں ابھی تک جنگلیوں کا عجیب و غریب لباس پہنے ہوئے تھا۔ ماحول کی تبدیلی سے ہر چیز ہی بدل جاتی ہے۔ یہ لباس جو جنگلی سردار کی خلعتِ فاخرہ تھی شہر کے ماحول میں آنے کے بعد ایک مضحکہ خیز چیز نظر آ رہی تھی۔ ویسے بھی مجھے جتنی جلد ممکن ہو اس لباس سے چھٹکارا حاصل کر لینا ضروری تھا۔ میرے دُشمن بدستور میری کھوج میں تھے اور وہ کسی بھی لمحے اپنا شکاری دائرہ تنگ کر کے میری زندگی دوبھر کر سکتے تھے مگر اس لباس سے نجات کیوں کر حاصل ہو۔

ان ہی سوچوں میں گُم میں درخت سے نیچے اُترا۔ میرے سامنے فی الحال نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ کوئی منزل۔ کوئی راستہ نہیں سُوجھ رہا تھا۔ یکایک کچھ آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ یہ دو انسانوں کے بولنے کی آوازیں تھیں اور رفتہ رفتہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ میں نے پریشان ہو کر ایک درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے پناہ لی اور چھپ کر انتظار کرنے لگا۔ آوازیں بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ اب میں صاف طور پر ایک مرد اور ایک عورت کی آوازیں سُن سکتا تھا۔ مرد دھیمی مگر گہری اور بھاری آواز میں گفتگو کر رہا تھا جبکہ عورت کی آواز بہت مضطرب اور بلند تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بات پر ناراض ہو رہی ہے یا رو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں مجھے نظر بھی آ گئے۔ واقعتاً وہ ایک مرد اور عورت تھے۔ مرد دیہاتی لباس پہنے ہوئے تھا اور لمبا تڑنگا سانولے رنگ کا جوان تھا۔ عورت بھی دراز قد اور خوب رُو تھی۔ وہ سیاہ شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھی اور پاؤں سے ننگی تھی گلے میں دوپٹے کی جگہ اس نے ایک سیاہ رنگ کی چادر ڈال رکھی تھی۔ وہ بے حد ناراض اور برہم معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اور زیادہ احتیاط سے چھپا لیا۔ میرے سامنے کھلا میدان اور ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ درختوں سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا تھا جو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ وہ دونوں اُس چبوترے پر بیٹھ گئے۔

مرد نے رسانی سے کہا: "دیکھ شاداں۔ میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ میرا باپ اور گھر والے مانیں یا نہ مانیں میں تیرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔"

شاداں نے غصے سے اس کو گھورا اور بولی: "جھوٹی تسلیاں مت دیا کر مجھے۔ باپ کے بغیر تیری حیثیت کیا ہے۔ اسی کی زمینداری اور پیسے پر تو عیش کرتا ہے۔ اس کو ناراض کر کے تو کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ تجھے روٹی کے لیے محتاج کر دے گا۔"

مرد غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "تو مجھے کیا سمجھتی ہے؟ میرے بازوؤں میں بھی دم ہے۔ کیا میں باپ کی دولت کے بغیر خود روزی نہیں کما سکتا؟ میں دس جماعت پڑھا ہوا ہوں۔ تندرست اور مضبوط ہوں۔ محنت مزدوری کر سکتا ہوں۔"

"وہ بھلا تمہیں محنت مزدوری کرنے دیں گے؟" شاداں کی آواز میں طنز نمایاں تھا: "اُن کی اُونچی ناک کٹ نہیں جائے گی!"

"مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر زیادہ تنگ کریں گے تو میں شہر چلا جاؤں گا۔ ہم وہاں اپنا گھر بنائیں گے ان لوگوں سے، ان کی زمینوں سے، ان کی دولت سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے۔"

شاداں خاموش رہی مگر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

مرد اس کے پاس بیٹھ گیا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "دیکھو شاداں۔ تو مانتی کیوں نہیں میری بات۔ میں ابا کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

شاداں چمک کر بولی: "یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔ وہ تجھے کبھی نہیں جانے دیں گے۔ وہ تجھے اپنے سے الگ نہیں کریں گے۔ منظور۔"

"اری پگلی۔ وہ میرے ماں باپ ہیں۔ میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تھوڑے ضدی اور غصے والے ضرور ہیں مگر میرے بغیر وہ کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔ تھوڑے دن ناراض رہیں گے مگر پھر ہار مان کر مجھے واپس لے آئیں گے اور تجھے اپنی

www.pdfbooksfree.pk

بہو مان لیں گے۔"

"اگر وہ تجھ سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں اور تیری ہر بات مان لیتے ہیں تو پھر وہ اس بیاہ پر کیوں رضامند نہیں ہوتے؟ تو بہت ڈرپوک ہے منظور۔ تو تو اپنے ابا کے سامنے بول ہی نہیں سکتا۔ میرے لیے ضد کیسے کرے گا؟ یہ سب دل خوش کرنے کی باتیں ہیں۔ تیرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ انہیں چھوڑ کر شہر چلا جائے اور جب وہ تجھے ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے تو ایک منٹ میں سیدھا ہو جائے گا۔ ان کے ایک اشارے پر مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا۔"

"تجھے یقین ہی نہیں آتا تو پھر میں کیا کروں؟" منظور جھنجھلا کر بولا۔

"کیسے یقین کروں تیرا۔ تو تو بھیگی بلی بن جاتا ہے اُن کے سامنے۔ باپ ہی کیا تو تو ماں اور بہنوں تک سے ڈرتا ہے۔ بالکل موم کی ناک ہے۔ نہ بابا۔ تیرے جیسے ڈرپوک کی باتوں میں آ کر میں اپنی زندگی برباد نہیں کروں گی۔"

منظور ایک بار پھر غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ تو ملک یعقوب کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اُنہوں نے تیرے بابا کو لالچ بھی دیا ہے اور قرضہ اُتارنے کے لیے رقم بھی دینے کو تیار ہیں۔ تیرا بابا ان سے دامنی ہے تو اس کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتی۔"

"کتنی جلدی میرے اُوپر الزام رکھ دیا ہے تو نے اور کمزوری کا طعنہ بھی مار دیا ہے۔ ارے جب تو مرد اور اکلوتا بیٹا ہو کر اپنے باپ کے آگے کچھ نہیں بول سکتا تو پھر میں تو ایک کمزور اور غریب لڑکی ہوں۔"

منظور لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔ شاداں بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے لالچی اور دھوکے باز سمجھتا ہے؟" وہ منظور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

منظور نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

"میرا باپ غریب ہے۔ اس کا دل امیروں کی طرح پتھر نہیں ہے منظور۔ تو نے ٹھیک سُنا ہے۔ ملک یعقوب نے اُسے بہت لالچ دیئے ہیں۔ اُسے پیسوں کی ضرورت بھی ہے۔ پر وہ میری خوشیوں کا مول کبھی نہیں کرے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک وہ ہزار بار ہاں کر چکا ہوتا اور میری شادی بھی کر دی ہوتی۔ پر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ میری خوشیوں اور زندگی کو اپنی ضرورت پر قربان نہیں کرنا چاہتا۔ پر تو ہی بیچ منجدھار میں چھوڑ دے گا تو پھر اور کیا ہو گا؟ کیا میں ساری عمر کنواری بیٹھی رہوں گی؟ اور پھر یہ بتا کہ ملک یعقوب کے بیٹے میں خرابی کیا ہے؟ پیسے والا ہے۔ زمین ہے، مویشی ہیں۔ نیک طبیعت ہے سارا گاؤں اس کی شرافت کی تعریف کرتا ہے۔ اگر اس کا باپ مجھ ایسی غریب لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بنانا چاہتا ہے تو یہ تو اُس کی بڑائی ہے۔ تعریف کی بات ہے۔ ایسے لوگ آس پاس کے گاؤں دیہات میں اور کتنے ہیں؟ بول؟"

منظور خاموش اسے گھورتا رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کے پاس اُس سچائی کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ایک کمزور شخص تھا جو کسی مقصد کے لیے تن کر کھڑا ہونے کی خوبی سے محروم تھا۔ پھر بھی وہ سارا الزام ایک کمزور لڑکی کے سر تھوپ رہا تھا جو اس سے کہیں زیادہ دلیر، جرأت مند اور سمجھدار تھی۔

شاداں ایک لمحہ اُسے دیکھتی رہی۔ پھر مُڑتے ہوئے بولی "اب میں چلوں گی۔ رات ہونے لگی ہے۔"

منظور نے پُکارا۔ "پھر کب ملے گی؟"

"کبھی نہیں۔" شاداں تیزی سے جاتے ہوئے بولی۔

منظور لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا اور دُکھ بھرے لہجے میں کہنے لگا "کیا کہہ رہی ہے شاداں؟ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔"

"بچپن کے ساتھی ضرور ہیں پر جیون ساتھی نہیں بن سکتے۔ دیکھ منظور۔ میرا باپ بہت شریف اور نیک ہے۔ وہ مجھ سے پیار بھی ڈھیر سارا کرتا ہے تو پھر میرا بھی فرض ہے کہ اسکی عزت کو بٹہ نہ لگاؤں۔ اب میرا تجھ سے چھپ چھپ کر ملنا ٹھیک

نہیں ہے۔ غریبوں پر لوگ بڑی جلدی الزام لگا دیتے ہیں۔"

منظور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ بے چین اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ "شاداں۔ کیا ہم ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے؟"

"یہ فیصلہ کرنا تیرا کام ہے اور کان کھول کر سُن لے منظور۔ اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو اپنے باپ سے صاف صاف بات کر۔ اسے بتا دے کہ میرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ جو باتیں مجھ سے کہتا رہتا ہے وہ اپنے باپ کے سامنے بھی کرنے کی ہمت پیدا کر اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو پھر میرا اور تیرا راستہ الگ الگ ہے۔"

شاداں مضبوط آواز اور مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سُنا چکی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کرے گی۔ منظور کے قدموں میں سست رفتاری پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ سوچ رہا ہے۔ غور کر رہا ہے۔ شاداں کے الفاظ نے اس کے دل و دماغ پر اثر کیا ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بالکل حق بجانب اور سچی ہے۔

مجھے اس وقت منظور پر بے اختیار ترس آ گیا۔ وہ کمزور ارادے کا آدمی تھا لیکن صاف ظاہر ہے کہ شاداں سے سچی محبت کرتا تھا۔ باپ کی سخت گیری کے باعث وہ منہ نہیں کھول سکتا تھا، لیکن وہ دل کی گہرائیوں سے شاداں کو چاہتا تھا اور اس سے علیحدہ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لہجے کا خلوص اور درد اس کے جذبے کی گہرائیوں کا مظہر تھا۔ کاش وہ عملی آدمی ہوتا اور ایک جواں مرد کی طرح آگے بڑھ کر شاداں کا ہاتھ تھام لیتا اور ساری دُنیا کو للکار کر بتا دیتا کہ وہ اپنی خوشیوں کا مول کسی قیمت پر بھی نہیں کرے گا۔

یکایک گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ منظور اور شاداں تو ٹھٹھک کر رُک ہی گئے تھے خود مجھے بھی اپنے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ خدایا۔ کیا کوئی نئی آفت نازل ہونے والی ہے؟ میں نے سوچا۔

دوسرے ہی لمحے درختوں کے پیچھے سے چار گھڑسوار نمودار ہوئے۔ اُنہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ شاداں بے اختیار سمٹ کر منظور کے نزدیک پہنچ گئی جو حیرانی سے سواروں کو دیکھ رہا تھا۔ شہسوار ان دونوں کے نزدیک پہنچ کر رُک گئے اور پھر ان میں سے ایک شخص گھوڑے سے کود کر نیچے اُترا۔

"کون ہے تو؟" اُس نے درشتی سے سوال کیا۔ اس کے سوال کا رُخ شاداں کی طرف تھا۔

"میں شاداں ہوں اور تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

شہسوار نے سر سے پیر تک شاداں کا جائزہ لیا اور پھر ہنسا۔ "میرا نام بادل ہے۔ کبھی سُنا ہے؟"

شاداں سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ منظور نے غیر ارادی طور پر اپنا بازو اس کے شانے کے گرد رکھ دیا۔ "بادل ڈاکو؟" شاداں کے مُنہ سے نکلا۔

بادل زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا پھر اس نے اپنے چہرے پر بندھا ہوا ڈھاٹا کھول دیا۔ وہ درمیانی عُمر کا ایک کرخت اور بدشکل آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھوں اور بائیں رُخسار پر زخم کے ایک نشان کی وجہ سے اس کا چہرہ مزید بدصورت اور ڈراؤنا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک پہچانا۔" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "آج ہم نے اس باغ میں ڈیرا لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ قدرت کی مہربانی دیکھو کر دل بہلانے کا سامان بھی یہاں پہنچا دیا۔"

یہ کہہ کر وہ پُرزور آواز میں قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے باقی تین ساتھی بھی ہنس رہے تھے۔ وہ تینوں بھی گھوڑوں سے نیچے اُتر آئے اور گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہوئے شاداں اور منظور کی طرف بڑھے جو تیز نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔

"ارے یہ کون ہے؟" بادل نے منظور کی طرف بندوق سے اشارہ کر کے پوچھا۔

"میرا نام منظور ہے۔ گاؤں کے چوہدری کا بیٹا ہوں۔"

www.pdfbooksfree.pk

"پھر تو بڑی قیمتی شے ہے بھئی۔ ٹھنڈی ہے ٹھنڈی۔ ٹھیک ہے۔ تجھے بھی ہم بھُنائیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ دو ڈاکوؤں نے آگے بڑھ کر منظور کے دونوں بازو تھام لیے۔

"لے جاؤ اسے۔" بادل گرج کر بولا۔

مگر منظور نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو چھڑا لیے اور غصّے سے بولا "میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"بہت پیار ہے اس سے؟" بادل نے طنزیہ انداز میں پوچھا اور پھر منظور کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "بھئی یہ آج کا مجنوں ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ غیرت والا ہوگا۔ پر یہ تو ادھر سے جانا ہی نہیں چاہتا۔ ٹھیک ہے پھر اسے بھی تماشا دیکھنے دو۔ اسے سامنے والے درخت سے باندھ دو۔"

دو ڈاکو منظور کی طرف بڑھے مگر وہ پھرتی سے اُچھل کر اُن سے دُور پہنچ گیا اس سے پہلے کہ جو تھا ڈاکو چوکنا ہو سکتا منظور اس پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے سینے پر اپنے سر سے ضرب لگائی اور وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ اس دوران میں ڈاکو کی بندوق منظور کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ بندوق تانے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا اور بے خوفی سے بادل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "بادل۔ تو نے مجھے غلط طعنہ دیا ہے۔ میں بے غیرت نہیں ہوں نہ بزدل ہوں۔ یہ لڑکی میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے تجھے میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔"

بادل اس اچانک اور غیر متوقع حملے سے بھونچکا رہ گیا تھا اور آنکھیں پھاڑے منظور کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرتا وہ چشم زدن میں شاداں کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی بندوق کی نالی شاداں کی پتلی کمر پر ٹِک گئی اور وہ خونخوار لہجے میں بولا "تمہاری جان بخشی میں کر سکتا ہوں مگر اس البیلی نار کو نہیں جانے دوں گا۔ بندوق زمین پر پھینک دو اور چُپ چاپ چلے جاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"بکواس بند کرو۔" منظور گرجا۔ اس وقت وہ یکسر ایک مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے جس نرم گفتار اور مصلحت بین منظور کو دیکھا تھا وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا "میں نے بتایا ہے کہ یہ میری ہونے والی بیوی ہے اور کوئی آدمی اپنی بیوی کو تم جیسے جانوروں کے حوالے کر کے نہیں جا سکتا۔"

"تم بھول رہے ہو منظور۔ خاموشی سے چلے جاؤ گے تو تمہاری جان بھی بچ جائے گی اور تمہاری دلرُبا کی بھی۔ ورنہ ضد کرو گے تو تم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی نظر آئیں گی۔ تمہارے حرکت کرنے سے پہلے میری گولی اس کے جسم کے پار ہو گی اور اس کے بعد تمہاری باری ہے۔"

منظور غصّے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈاکو جس کی بندوق اس نے چھین لی تھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور منظور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ منظور بجلی کی سی سُرعت سے گھوما اور اس کی بندوق کی نال آگے بڑھتے ہوئے ڈاکو کے سر سے ٹکرائی۔ اگر اس نے سر پر پگڑی نہ باندھ رکھی ہوتی تو یقیناً اس کا سر ٹوٹ جاتا مگر پھر بھی اس کی ضرب سے وہ لڑکھڑایا اور دوبارہ زمین پر گر گیا۔ پھر وہ بادل ڈاکو سے مخاطب ہوا "یاد رکھو۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر اپنی آنکھوں کے سامنے بے عزت ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھوں گا۔ عورت کی آبرو ہی اس کا زیور ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی بیکار ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے شاداں کو مرتے ہوئے دیکھنا منظور ہے مگر یہ مت بھولو کہ مرنے سے پہلے تم میں سے بھی ایک دو کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

اس دوران میں منظور کی تمام تر توجہ بادل اور شاداں کی طرف مبذول تھی۔ بادل کے باقی دو ساتھیوں میں سے ایک نے اس ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اُٹھایا اور ہوا میں چھلانگ لگا دی۔ یوں لگا جیسے وہ فضا میں پرواز کرتا ہوا منظور پر جا گرا ہو۔ ظاہر ہے کہ منظور اس اچانک حملے کے لیے مطلق تیار نہ تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ زمین پر گرنے والی بندوق اسی ڈاکو نے اُٹھائی جس سے منظور نے چھینی تھی۔ اب منظور بے سہارا اور نہتا تھا اس سے پہلے کہ وہ

زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہوتا ایک ڈاکو کی ٹھوکر نے اُسے دوبارہ زمین پر لٹا دیا اور بندوق کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو چکی تھی۔ منظور بے دست و پا اور بے قابو ہو چکا تھا۔ شاداں بادل کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ بادل کے بھیانک قہقہے نے جنگل کے سناٹے کو توڑ دیا۔ وہ بے تحاشا اور بے اختیار ہنس رہا تھا۔ اب اُس نے بایاں ہاتھ آگے بڑھا کر شاداں کا بازو بھی مضبوطی سے تھام لیا تھا اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہی تھی مگر ایک صحت مند اور مضبوط دیہاتی لڑکی ہونے کے باوجود وہ بادل ڈاکو جیسے دیو قامت اور طاقت ور شخص کے سامنے بالکل بے بس نظر آ رہی تھی۔ بادل کے تینوں ساتھی بھی اپنی مکروہ آوازوں کے ساتھ اس کے قہقہے میں شامل ہو گئے تھے۔ منظور کے اُوپر کھڑے ہوئے ڈاکو نے اپنی بندوق اُٹھائی اور پوری قوت کے ساتھ منظور کے سینے پر ضرب ماری۔ منظور کے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ شاداں تڑپ کر اس کی طرف بڑھی مگر وہ بادل ڈاکو کی آہنی گرفت میں محض تھرتھرا کر رہ گئی۔ ڈاکو نے دوبارہ ضرب لگانے کے لیے بندوق اُٹھائی اور شاداں کے لبوں سے ایک چیخ کی آواز نکلی۔

اب میرے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں درخت کی اوٹ سے نکل کر آہستگی سے آگے بڑھا اور برق کی طرح بادل ڈاکو کے سر پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا اس کی بندوق میرے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی تھی اور اس کی نالی بادل کے سینے پر تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ حیران اور بھونچکے رہ گئے۔

میں نے انتظار کیے بغیر بادل کے چہرے پر ایک بھرپور گھونسہ رسید کیا اور وہ لڑکھڑا کر دُور جا گرا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر میری بھرپور ٹھوکر نے اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھی اس اثنا میں سنبھل چکے تھے اور پوزیشنیں سنبھال کر میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنی بندوق کی نالی بادل کے سینے پر ماری اور وہ بلبلا کر رہ گیا۔ پھر میں اس کے ساتھیوں سے مخاطب ہوا جو اپنی اپنی جگہ رُک کر کھڑے ہو گئے تھے "اگر کسی نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت کی تو بادل زندہ نہیں بچے گا۔ اگر اس کی خیر چاہتے ہو تو اپنی اپنی بندوقیں زمین پر پھینک دو۔"

وہ اتنے مرعوب اور خائف ہو چکے تھے کہ اُنہوں نے بلا تامّل میری ہدایت پر عمل کیا۔ اتنی دیر میں منظور بھی زمین سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس بار میں اس سے مخاطب ہوا "منظور۔ ان لوگوں کے پاس مضبوط لمبی سی رسّی ضرور ہو گی۔ رسّی نکال کر ان سب کو مضبوطی سے باندھ دو۔"

منظور نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میری ہدایت پر عمل کیا۔ رسّی ایک گھوڑے کی کاٹھی سے بندھی ہوئی تھی۔ ان چاروں کو یکجا کر کے مضبوطی سے باندھنے کے بعد منظور میری طرف متوجہ ہوا۔ اب ڈاکوؤں کی نگاہیں بھی مجھ پر لگی ہوئی تھیں اور شاداں بھی قدرے حیرانی سے میرے لباس کو اور مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں منظور کے پاس گیا اور میں نے کہا "منظور ایک گھوڑا تم کھول کر آزاد کر دو اور تم دونوں دو گھوڑے لے کر چلے جاؤ۔"

"مگر ہمارا گاؤں یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"پھر بھی تم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر جاؤ اور تھانے میں پہنچ کر رپورٹ لکھوا دو۔ مناسب سمجھو تو شاداں کو راستے میں اس کے گھر چھوڑ دینا۔"

منظور نے ایک لمحے مجھے دیکھا۔ پھر جذباتی لہجے میں بولا "آپ کون ہیں جو فرشتہ بن کر ہماری مدد کو آ گئے۔"

میں ہنسا "اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری مدد کے لیے بروقت بھیج دیا، مگر میں فرشتہ نہیں ہوں۔" پھر میں شاداں سے مخاطب ہُوا "شاداں۔ تم نے کچھ دیر پہلے منظور سے جو باتیں کی تھیں وہ میں نے سُن لی ہیں۔ اس میں واقعی اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ یہ اپنے باپ کے سامنے سر اُٹھانے کی ہمت نہیں رکھتا مگر تم نے دیکھ لیا کہ یہ تمہاری خاطر کتنی بے خوفی سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ تم نے اسے ڈرپوک ہونے کا طعنہ دیا تھا مگر یہ ڈرپوک نہیں ہے۔ اس کی قدر کرنا اور اگر ہو

www.pdfbooksfree.pk

سکے تو اس کا ساتھ دینا۔"

شاداں اور منظور کی آنکھوں میں حیرانی تھی اور پھر وہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ان دونوں نے آبدیدہ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے۔ یہ منظر میرے لیے بھی متاثر کن تھا مگر وقت زیادہ نہیں تھا، اس لیے میں نے غیر جذباتی لہجے میں کہا "دیر نہ کرو۔ ابھی مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں!"

وہ دونوں خاموشی سے آگے بڑھ کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تیسرے گھوڑے کی لگام بھی منظور نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ذرا دیر کے لیے اُنہوں نے رُک کر میری طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پھر کچھ بولے بنا وہ رُخصت ہو گئے۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اُن کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں بہت دُور چلی گئیں۔ اب تاریکی پھیل چکی تھی مگر رات زیادہ اندھیری نہیں تھی۔

میں بادل ڈاکو کی طرف بڑھا۔ وہ خاموش کھڑا برہمی سے مجھے گھور رہا تھا۔ "تم اپنے آپ کو ڈاکو کہتے ہو۔ کتنے بزدل اور کمینے ہو تم؟ اُچکے ہو۔ اکیلی عورتوں کی عزت لوٹنے پر تُل جاتے ہو۔ بے غیرتی اور بے شرمی تمہارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ تمہیں اپنے آپ کو ڈاکو کہتے ہوئے شرم آنی چاہیئے۔"

"مگر تم خدائی فوجدار کون ہو اور کہاں سے آگئے ہو؟" وہ بدتمیزی سے غُرّایا۔

میں نے جواب میں ایک بھرپور تھپڑ اس کے مکروہ چہرے پر رسید کیا جسکی آواز سارے جنگل میں گونج اٹھی۔ "یوں سمجھ لو مجھے خدائی فوجدار ہی سمجھ لو جسے خدا نے اُن معصوموں کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ تمہاری بہادری میں دیکھ چکا ہوں۔ اب میں تمہاری بزدلی دیکھ رہا ہوں!" یہ کہہ کر میں نے اس کے جسم کے اِردگرد لپٹی ہوئی رسی ڈھیلی کر دی۔ "آگے آؤ اور اپنے اِن تینوں ساتھیوں کو مضبوطی سے دوبارہ باندھ دو!"

اس کے پاس میرا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خاموشی سے اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

"اب اپنے کپڑے اُتار دو!"

"کیا؟" وہ چونک کر بے اعتباری سے بولا۔

"اپنے کپڑے اُتار دو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر دیر کی تو یہ بندوق دیکھ رہے ہو؟"

اس نے ڈرتے ہوئے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اگرچہ اندھیرا تھا پھر بھی وہ سمٹ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا لباس سمیٹ کر اُٹھا لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔ "آگے آ کر اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤ!"

اس نے پریشانی اور خوف سے مجھے دیکھا مگر میرے حکم کی تعمیل میں مطلق دیر نہیں لگائی۔ میں اس کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور گھوڑا میرے اشارے پر دوڑنے لگا۔ باغ سے نکل کر ہم کھیتوں میں آ گئے۔ مجھے سمتوں کا کوئی اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی راستوں کا علم تھا مگر میں ایک جانب گھوڑا دوڑاتا رہا یہاں تک کہ ایک دو میل آگے چل کر پھر درختوں کا ایک ذخیرہ نظر آ گیا۔ میں نے گھوڑا روکا اور نیچے اُتر آیا۔ بادل ڈاکو اب پوری طرح سہما ہوا تھا اور انتہائی خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "گھوڑے سے اُتر جاؤ!"

وہ کود کر اُتر تو گیا مگر دونوں ہاتھ جوڑ کر دوزانو بیٹھ گیا اور گھگھیا کر بولا "بھگوان کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے جان سے نہ مارو۔ میرے اُوپر رحم کرو!"

میں ایک لمحے اسے دیکھتا رہا۔ یہ شخص جو کچھ دیر پہلے فرعون بے ساماں بنا ہوا تھا۔ اس وقت کتنا بزدل اور حقیر نظر آ رہا تھا۔ "فکر نہ کرو بادل۔ میں تم جیسے بزدل کے خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گا!"

وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور سامنے درختوں کے ذخیرے میں چلے جاؤ۔ جب

تک پولیس تمہاری کھوج میں نہ آئے تم یہیں چھپے رہنا۔ ظاہر ہے کہ اپنے پیدائشی لباس میں تم کہیں اور جانا پسند نہیں کرو گے!"

وہ خاموش ڈری ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ "دیر مت کرو۔ بھاگو۔ تیزی سے بھاگو!" وہ بے اختیار درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگا مگر پھر یکایک رُک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ بذاتِ خود ایک بزدل اور دغا باز انسان تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں میں پیچھے سے اس پر گولی نہ چلا دوں۔

"میں نے کہا ہے نا کہ میں تم جیسے بزدل کتوں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گا۔ تیزی سے بھاگو!" شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا پھر بھی وہ تیزی سے دوڑتا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا یہاں تک کہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے گھوڑے سے اُتر کر اپنا جنگلی لباس اُتار کر بادل ڈاکو کا لباس زیب تن کر لیا۔ اپنا لباس میں نے اُچھال کر دُور پھینکا اور دوبارہ اپنی اَن جانی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ بادل ڈاکو کی طرف سے میں مطمئن تھا۔ وہ لباس کے بغیر درختوں کے ذخیرے سے باہر آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک منظور پولیس لے کر آئے اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لے وہ بھی یقیناً اسی جگہ چھپے رہنے پر مجبور تھا۔ منظور اور شاداں کی پیار کہانی کا کیا انجام ہو گا؟ میں نے یہ فیصلہ بھی خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ اب میں ایک بار پھر اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کون سا علاقہ ہے؟ اور میں کتنی دیر تک اپنی تلاش کرنے والوں سے محفوظ رہ سکتا ہوں؟

گھوڑا تیز رفتار تھا۔ اس نے بہت جلد مجھے میلوں آگے پہنچا دیا۔ ابھی تک راہ میں مجھے کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ ایک پتھریلا پہاڑی علاقہ تھا۔ کافی فاصلے پر مجھے بلند پہاڑوں کی چوٹیاں بھی دُھندلی نظر آ رہی تھیں۔

یکایک موٹر انجن کی آواز میرے کانوں میں آئی اور میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ آس پاس ایک ٹیلے کے سوا کوئی اور چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ میں نے گھوڑے کو موڑا اور ٹیلے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ انجن کی آواز قریب تر آ گئی اور مجھے گاڑیوں کی روشنیاں چمکتی ہوئی صاف نظر آنے لگیں۔ اب میں جان چکا تھا۔ یہ دو جیپیں تھیں جو تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں گھوڑا بے چین ہو کر کوئی آواز نہ نکالے۔ میں نے گھوڑے کو پیار سے چمکارا اور آہستگی سے اس کے جسم کی مالش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ گھوڑے کو رشوت دینے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں تھا۔

جیپ گاڑیاں تھوڑے فاصلے سے میرے سامنے سے گزر کر اُس طرف چلی گئیں جدھر سے میں آیا تھا۔ یہ فوجی گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ تین اور فوجی بھی سوار تھے اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ جیپیں میرے سامنے سے گزر کر چلی گئیں مگر مجھے پریشانی اور فکر میں مبتلا کر گئیں۔ اس دُور دراز دیہاتی علاقے میں رات کے وقت فوجی جیپ گاڑیاں کس طرف اور کس لیے مصروفِ سفر تھیں۔ کیا اُن لوگوں کو میری تلاش تھی؟!

جیپوں کی آواز دُور ہو گئی یہاں تک کہ معدوم ہو گئی تو میں ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ جس طرف سے جیپ گاڑیاں نمودار ہوئی تھیں اُس طرف جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے میں نے ایک تیسری سمت سفر کرنے کا قصد کیا۔ گھوڑا اشارے کا منتظر تھا۔ ایڑی کے ایک ہی اشارے پر ہوا ہو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں سفر کرتا رہا یہاں تک کہ کچھ فاصلے پر مجھے اونچائی پر ایک بنگلہ نما گھر نظر آیا۔ پہلے تاریکی میں اس کا ہیولا نظر آیا اور اس کے بعد مدھم روشنی بھی ٹمٹماتی ہوئی نظر آنے لگی۔ میں نے گھوڑے کو روک لیا اور دُور سے اس واحد عمارت کا جائزہ لینے لگا مگر مجھے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ مل سکی۔ ہیلی کاپٹر کی جانی پہچانی آواز ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور گھوڑے سے اُتر کر اس کی پیٹھ پر ایک زوردار ہاتھ رسید کیا۔ گھوڑا تڑپ کر اُچھلا اور تیر کی طرح ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔

میں نے ٹیلوں پر چڑھ کر بنگلے تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ ایک وسیع و عریض بنگلہ تھا جس کے آس پاس دُور دُور تک باغ اور میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک خاردار تار کے ذریعے اس کی حدود کی حد بندی کر دی گئی تھی۔ میں نے خاردار تار کو پھلانگ کر

www.pdfbooksfree.pk

جیسے ہی بنگلے کی حدود میں قدم رکھا، تاریکی میں سے ایک قدآور اور خوفناک کتا بھونکتا ہوا میری طرف لپکا اور میری رُوح فنا ہو گئی۔ کتا مجھ سے قدرے فاصلے پر تھا مگر جس برق رفتاری سے وہ میری طرف لپکا ہوا آرہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ چند لمحے بعد وہ میرے سر پر پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بنگلے کی عمارت کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے اپنے تیز دوڑنے پر ناز تھا لیکن کتا ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اب اس کا سامنا کرنا لازمی تھا۔ وہ تیزی سے لپکا ہوا آرہا تھا۔ میں اچانک رُکا اور تھوڑا سا راستہ کاٹ کر اس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ کتا اپنی تیزی میں چند قدم آگے نکل گیا مگر پھر تیزی سے پلٹا اور اس بار غراتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں نے بندوق کا بٹ گھما کر مارا۔ ایک چیخ کی آواز اس کے منہ سے نکلی اور وہ چلاتا ہوا زمین پر گر گیا۔ میں اتنی دیر میں اس کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ ایک جسیم اور بھاری بھرکم کتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جسم سے ٹکرانے کے بعد بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی۔ کتے کو بھی چوٹ آئی ہوگی مگر میں اس نسل سے واقف تھا۔ جب تک جان میں جان رہے گی وہ اپنے شکار کا پیچھا ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ یہ اس قسم کا کتا تھا جو زمیندار شکار کے لیے پالتے ہیں اور یہ اس قدر خونخوار اور بے جگر ہوتے ہیں کہ آمنا سامنا ہونے پر بھیڑیوں اور چیتوں تک سے لڑ پڑتے ہیں مگر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں نے اس کے اُٹھنے کا انتظار کیے بغیر پوری طاقت سے بنگلے کی جانب دوڑ لگا دی مگر وہ بلائے بے درماں کی طرح میرے تعاقب میں تھا۔ بنگلے کے چاروں طرف ایک برآمدہ تھا اور عین سامنے ایک پھلدار درخت لگا ہوا تھا۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہ تھی اس لیے میں نے درخت کا رُخ کیا اور نہایت تیزی سے اس پر چڑھنا شروع کر دیا۔ کتا مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ اپنے دانت نکالتے ہوئے میرے پیچھے درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے دانت اور گرم سانس میں نے اپنے پیروں کے نزدیک محسوس کی مگر میں اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نہایت تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ کتا اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھ کر غصے سے بے قابو ہو کر بے تحاشا بھونک رہا تھا اور اُچھل اُچھل کر درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر خالہ بی نے کتوں کو بھی اپنی طرح درختوں پر چڑھنا سکھا دیا ہوتا تو اس وقت میرا کیا حشر ہوتا؟ یہ سوچ کر میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ مگر فی الوقت میں اس کی ظالمانہ پہنچ سے باہر تھا اور اپنی سانسیں دُرست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتے کا غیض و غضب دیدنی تھا۔ اس کی آواز اتنی بھاری اور بلند تھی کہ یقیناً آس پاس کے علاقوں تک پہنچ رہی ہو گی۔ رات کی تنہائی اور سناٹے میں اس کی آواز نے دُور دُور تک کے رہنے والوں کو میری آمد سے باخبر کر دیا ہوگا۔

بنگلے کی جانب مکمل خاموشی تھی۔ نہ جانے اس میں کوئی موجود بھی تھا یا نہیں لیکن اتنی دیر میں تو گہری نیند سوئے ہوئے لوگ بھی اُٹھ سکتے تھے۔ میرے لیے اس درخت پر زیادہ دیر تک موجود رہنا کسی طرح بھی مناسب اور محفوظ نہ تھا۔ کسی لمحے بھی کوئی نمودار ہو سکتا تھا اور اس خوفناک کتے کی موجودگی میں میرا پکڑا جانا یقینی تھا۔ یہ سوچ کر میں نے درخت اور بنگلے کی چھت کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لیا جو دس بارہ فُٹ کے لگ بھگ تھا۔ کوئی دوسرا چارہ نہ پا کر میں نے اپنے جسم کو تولا اور اللہ کا نام لے کر بنگلے کی کھپریل کی چھت کی جانب چھلانگ لگا دی۔ لمبی چھلانگیں میں کالج کے زمانے میں بھی لگاتا رہا تھا اور پھر فوجی تربیت کے زمانے میں بھی لمبی چھلانگوں کی مزید تربیت حاصل کر چکا تھا۔ مگر یہ میری زندگی کی سب سے اہم اور دُشوار ترین چھلانگ تھی۔ کتا میری طرف دیکھتا ہوا لپکا۔ وہ اس بات کا منتظر تھا کہ میں زمین پر گروں اور وہ میری تکا بوٹی کر ڈالے مگر میری قوتِ ارادی ایک بار پھر کام آئی اور میں بنگلے کی چھت پر پہنچ گیا مگر ابھی اطمینان کی سانس بھی نہیں لینے پایا تھا کہ چھت کے کھپریل اپنی جگہ سے ہٹنے لگے اور میں نیچے کی جانب پھسلنے لگا۔ میں چھت کو پکڑنے کی کوشش میں جتنے ہاتھ پیر مارتا تھا کھپریل اسی قدر زیادہ تیزی سے پھسلتے تھے۔ یہ چند لمحے میری زندگی کے سب سے اذیت بخش اور فیصلہ کن لمحے تھے۔ میں اپنی جان بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اتنے بہت سے مشکل مراحل سے بچ نکلنے کے بعد خونخوار کتے کے ذریعے جان دینا مجھے قطعی گوارا نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر چھت کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے کوئی سہارا تلاش

کرنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ اس بار میں تیزی سے پھسلتا ہُوا نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ اب کتے سے محفوظ رہنے کے لیے میرے پاس کوئی صورت نہ تھی۔ میری ٹانگیں اور نچلا دھڑ چھت پر سے نیچے لٹک چکا تھا۔ محض بالائی دھڑ چھت پر تھا۔ کتے کے غضب ناک انداز سے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں اب مجھے کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں اس خونخوار کتے کے دانتوں اور جبڑوں کا نشانہ بننے والا تھا۔ خدا کے سوا اب مجھے اس سے بچانے والا کوئی اور نہ تھا، لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ نہتا ہونے کے باوجود آسانی سے اس کا نشانہ نہیں بنوں گا۔

میرے قدم فرش سے ٹکرائے اور میں اپنے تمام حواسوں اور جسم کی توانائیوں کو اکٹھا کر کے اس درندے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا مگر یکایک میں نے محسوس کیا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز رُک چکی ہے اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ خونخوار اور وحشی کتا مجھے ایک طرف بیٹھا نہایت شرافت سے دُم ہلاتا ہوا نظر آیا۔ اس کے نزدیک ہی دو پتلون میں لپٹی ہوئی ٹانگیں تھیں اور پھر نظریں کچھ اور اُوپر اُٹھیں تو میں نے ان ٹانگوں کے مالک کے جسم کا بقیہ حصہ بھی دیکھ لیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے بال شانوں تک تراشے ہوئے تھے۔ رنگ سُرخ و سفید تھا اور چہرے کے نقوش انتہائی دلکش اور تیکھے۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے خاموش کھڑی مجھے تک رہی تھی۔ سر پر سیاہ پگڑی تھی۔ میں اس حلیے میں نہ جانے کیسا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اب میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے پوری طرح بہرہ ور ہو چکا تھا اور اُس سیاہ تراشے ہوئے بالوں والی لڑکی کا تراشا ہوا جسم دیکھ کر قدرت کی صناعی کو داد دے رہا تھا۔ اتنی خوبصورت صحت مند، متناسب اور رعنا لڑکی میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اپنی زندگی میں بیشمار مختلف قسم کی لڑکیاں دیکھنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ مگر یہ نمونہ بالکل انوکھا اور نرالا تھا اور انتہائی دلکش بھی۔

وہ لڑکی دونوں ہاتھ اپنی پتلی کمر پر رکھے ہوئے کھڑی مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں انسان نہیں، دُنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا ہم دونوں کی نگاہیں پَل بھر کے لیے ملیں، وہ بے باکی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے دیکھتی رہی مگر میں اُن سیاہ کٹورہ جیسی بڑی بڑی خوشنما آنکھوں کی تاب نہ لا سکا جن پر لمبی لمبی سیاہ پلکیں جُھکی ہوئی تھیں اور میری آنکھیں خود بخود جُھک گئیں۔ ایک سنسنی خیز لہر سر سے پیر تک میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسی ہستی پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔

ایک کھنکتی ہوئی رسیلی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ "کون ہو تم؟ اور چھت پر کیا کر رہے تھے؟"

مجھے کچھ دیر تو جواب ہی نہ سُوجھا تو دوسری بار اس نے غصے سے پوچھا۔ "جواب کیوں نہیں دیتے چور ہو؟"

میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"پھر کون ہو اور وہاں چھت پر کیوں چڑھے تھے؟"

"میں راہ گیر ہوں۔ کھانے پینے کی تلاش میں اندر آیا تھا مگر یہ کتا میرے پیچھے پڑ گیا۔"

"مگر چھت پر تم کیسے پہنچ گئے؟"

"کتے سے جان بچانے کے لیے۔" میں نے سادگی سے مختصر جواب دیا۔

وہ خاموش مجھے گھورتی رہی پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح ہموار اور سفید تھے۔ ہنستی ہوئی وہ اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب اندر آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ مُڑی اور برآمدے کی طرف چل پڑی۔ میں اُس دیو قامت کتے کی موجودگی سے بے پروا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کتا بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر لڑکی نے ڈانٹ کر کہا۔ "جبرے۔ تم وہیں بیٹھے رہو۔" کتا خاموشی سے دُم ہلاتا ہُوا دوبارہ بیٹھ گیا۔ اسکی اطاعت اور سمجھداری پر حیران ہوتا ہُوا میں لڑکی کے پیچھے برآمدے کی طرف چل دیا۔ اُس نے برآمدے میں پہنچ کر دروازہ کھولا جو مقفل نہیں تھا۔ جبرے جیسے وفادار اور خونخوار کتے کے ہوتے ہوئے دروازے کو مقفل کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ لڑکی نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا اور دروازہ کھلا چھوڑ

www.pdfbooksfree.pk

کر اندر چلی گئی۔ بنگلے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے گردن موڑ کر فرش پر بیٹھے ہوئے جھبرے کو دیکھا اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سیاہ رنگ کی پرانی سی کار پر نظر پڑی جو ظاہر ہے کہ اس لڑکی کی ملکیت تھی۔ کتے کے بے پناہ شور و غل اور اپنی پریشانی کی بناء پر میں گاڑی کے آنے کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ اب مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ حسین لڑکی اچانک کیوں کر نمودار ہو گئی تھی۔

دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد ایک گیلری سے گزرتے ہوئے ہم دونوں ایک کمرے میں پہنچ گئے جو غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ کمرے میں بید کے صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کچھ تصویریں لگی ہوئی تھیں جن میں مختلف پہاڑی مناظر کی عکاسی کی گئی تھی۔

کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گئی اور بولی: "بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" اس بار اس کی آواز اور لہجے میں نرمی تھی۔ وہ فوراً ہی کمرے سے رخصت ہو گئی اور میں ایک گدے دار صوفے پر بیٹھ کر دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا مگر حیران تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی کون ہے اور اس ویران اور الگ تھلگ مقام پر تنہا کیوں رہتی ہے؟

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جو اس نے درمیان میں پڑی ہوئی بید سے بنی ہوئی میز پر رکھ دی۔ "اس وقت تو بس یہی کچھ ہے کھاؤ۔"

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی اور ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکا کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اتنا شفاف اور دبلا پتلا تھا کہ میں اپنی بھوک کو بھول کر اسے تکنے میں معروف ہو گیا۔

"اب کھاؤ نا۔ کھاتے کیوں نہیں؟" اس نے تیز آواز میں کہا تو میں نے چونک کر کھانے کا جائزہ لیا۔ ایک پلیٹ میں سادہ چاول تھے اور دوسری میں آلو کا سالن۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا اور وہ خاموشی سے میرا جائزہ لینے لگی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "تم کھانا کھاؤ میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

وہ کمرے سے چلی گئی تو کمرہ اچانک خالی خالی اور تاریک نظر آنے لگا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ کمرے میں جلنے والا بلب اسے روشن کرنے کے لیے ناکافی ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے نوالہ چباتے ہوئے سوچا۔ "کیا یہاں تنہا رہتی ہے؟ اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ ایک اجنبی مرد کو رات کے وقت اپنے گھر میں مدعو کرتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی اور نہ ہچکچائی۔ اتنی خوبصورت اور اکیلی لڑکی اور اتنی بے پروا؟!" اتنی دیر میں وہ پانی کا گلاس لے کر واپس آ چکی تھی۔ کھانا میں نے ختم کر دیا تھا اس لیے شکریہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔ وہ کسی حیرت یا ناگواری کے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ میں اس وقت جو لباس پہنے ہوئے تھا اس کے پہننے والے سے وہ اسی قسم کی حرکتوں کی توقع رکھتی ہو گی۔

"کیا آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں؟" میں نے گلاس ٹرے میں رکھ دیا۔

"نہیں۔ میرے چچا اور ان کے گھر والے بھی یہیں رہتے ہیں مگر آج وہ سب لوگ کہیں مہمان گئے ہوئے ہیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"کمال ہے۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا: "آپ کو اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کس بات کا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اس ویران جگہ پر رات کے وقت بالکل اکیلی....."

"تم چلے جاؤ گے؟" وہ میری ادھوری بات سن کر کھڑی ہو گئی۔

"اگر مل جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"مہربانی کی اس میں کیا بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم یہاں تک پیدل آئے ہو؟" "جی ہاں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں بوکھلا گیا: "پتہ نہیں جی۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میں اجنبی ہوں۔ اس علاقے سے ناواقف ہوں۔"

"تو پھر یہاں آئے کیوں ہو؟"

میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا: "جی وہ۔ دراصل میرے ایک عزیز رہتے ہیں لکشمی پور میں۔"

"لکشمی پور میں؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "یہاں تو اس نام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"جی ہاں یہی تو بات ہے۔ پتہ نہیں کس نے مجھے ادھر کا راستہ بتا دیا۔ صبح سے ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں۔"

"تم آئے کہاں سے ہو؟"

"بہت دور سے۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ "میرا مطلب ہے کہ..... وہ....."

مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے مطلق یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے.... اس کا نام کیا ہے۔ اس کے آس پاس کون سے شہر ہیں مگر اب لڑکی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ وہ کان لگا کر دور سے آتی ہوئی آواز سن رہی تھی۔ میں نے بھی دور سے آتی ہوئی آواز کی طرف توجہ دی اور مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آوازیں جیپ گاڑیوں کے انجنوں سے بلند ہو رہی تھیں۔ گاڑیاں تعداد میں کئی معلوم ہوتی تھیں۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بظاہر میں ان آوازوں سے بے پروا بنا رہا لیکن میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں یہ جیپیں میری تلاش میں آئی تھیں۔

لڑکی کا چونکنا ہونا بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ اس طرف عام طور پر جیپوں کا رخ نہیں ہوتا۔ لڑکی نے بے اعتباری سے باہر کی طرف دیکھا اور بولی: "جیپ کاریں؟! یہ آج اس طرف کیوں آئی ہیں؟"

"جیپ گاڑیاں تو ہر جگہ پھرتی رہتی ہیں۔" میں نے ٹوہ لینے کی غرض سے کہا۔

"نہیں۔ ہمارے علاقے میں جیپ گاڑیاں کسی مطلب کے بغیر نہیں آتیں اور یہ تو پورا کانوائے معلوم ہوتا ہے۔"

میں آگے بڑھ کر کشادہ کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دور دور تک کا منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اونچے نیچے ٹیلوں پر بہت فاصلے پر میں خاک اڑتی ہوئی دیکھ سکتا تھا، لیکن اب مجھے پریشان کرنے کے لیے ان آوازوں میں ایک اور آواز کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی جسے سننے اور شناخت کرنے کے معاملے میں میرے کان مطلق دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔

لڑکی بھی اب کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور گرد و غبار کے بگولوں کو دیکھ رہی تھی: "او مائی گاڈ!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا: "بات کیا ہے؟"

پھر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور اس کے تیز کانوں نے ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سن لی۔ ایک سیٹی کی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی اور وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: "بہت عرصے کے بعد فوجی آپریشن ہو رہا ہے۔"

"فوجی آپریشن؟" میرے منہ سے نکلا۔

وہ ہنس پڑی اور اس کے ہموار دانتوں کی لڑیاں موتیوں کی طرح جگمگا اٹھیں: "یہ ڈاکٹروں والا آپریشن نہیں دوسری قسم کا آپریشن ہوتا ہے۔ جب فوجی لوگ کسی خاص کام کے لیے جاتے ہیں تو اسے ملٹری آپریشن کہتے ہیں مگر یہ باتیں تم جیسے دیہاتی کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

میں مسکرایا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں دیہاتی کپڑوں میں ملبوس تھا مگر میرا یہ خیال محض ایک جھوٹا دلاسہ تھا۔ میرے دشمنوں نے بالآخر میرا کھوج لگا لیا تھا اور اب وہ بلائے بے درماں کی طرح مجھے شکار کرنے کے لیے یہاں پہنچنے والے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے مگر وہ زیادہ پریشان نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا بغور جائزہ لیا اور اس کے حسن و جمال کے بارے میں میرا پہلا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اس کے تراشے ہوئے بال اس کے

www.pdfbooksfree.pk

شانوں پر لہرا رہے تھے اور اس کے جسم سے بھینی بھینی مہک سی اُٹھ رہی تھی۔ وہ ایک صحت مند، دراز قد اور مضبوط جسم کی لڑکی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ خطرے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھوں؟ اور کیا میں اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں؟ مگر وہ میری مدد کرنے پر کیوں آمادہ ہو گی؟ جبکہ میں اس کے ملک کا دشمن اور مطلوب و مغرور سپاہی ہوں۔ میری نظریں لڑکی پر جمی ہوئی تھیں مگر ذہن کہیں اور تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے معاً نظریں چُرا لیں اور باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ لڑکی کے مُنہ سے ایک استعجابی آواز نکلی اور وہ تیزی سے مجھ سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی کے آثار پیدا ہوئے اور اس کا چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ اس کی نگاہیں میرے گلے پر پڑے ہوئے لاکٹ پر جمی ہوئی تھیں جو بھاگ دوڑ کے دوران میں میرے کُرتے کے گریبان سے باہر نکل آیا تھا۔

"تم!؟" اس کی حیرت بھری آواز بلند ہوئی اور اس نے اُنگلی سے میری جانب اشارہ کیا: "خاموش رہو" میں نے آہستہ مگر تحکمانہ آواز میں اسے متنبہ کیا۔ "اگر تمہارے مُنہ سے کوئی آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہو گی۔" اور اس کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کا بازو تھام لیا۔ شاید یہ میری سب سے بڑی غلطی اور بھُول تھی۔ وہ بجلی کی طرح پلٹی اور اس نے مجھے اپنی کمر پر لاد کر فرش پر پھینک دیا۔ اس کا یہ حملہ قطعی غیر متوقع اور ناقابلِ یقین تھا۔ ایک خوبصورت نازک اندام دوشیزہ سے میں اس قسم کے عمل کی اُمید نہیں کر سکتا تھا۔ فرش پر گرتے ہی میں نے پلٹ کر قلابازی کھائی اور اُٹھنا چاہا، مگر اس کی ٹھوکر میری کنپٹی پر پڑی اور میرے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا مگر ایک لڑکی کے ہاتھوں یہ ذلت مجھے گوارا نہ تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا کر دوبارہ جست لگانے کی کوشش کی اور اس بار اُس نے کراٹے کا ایک ہاتھ میری گردن پر رسید کیا اور پھر اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ تاریکی نے میرے ذہن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہر قسم کی تکلیف کے احساس سے بے نیاز ہو چُکا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں ایک بستر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ میں نے سَر اُٹھانے کی کوشش کی مگر درد کی ایک لہر سر سے پاؤں تک دوڑ گئی اور میں تکلیف سے آہ بھر کر رہ گیا۔ دوسری کوشش میں اُٹھ کر بیٹھا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تو معلوم ہُوا کہ میں ایک مختصر سے تاریک کمرے میں ہوں۔ ایک بستر کے سوا اس میں کوئی اور سامان موجود نہیں تھا۔ ایک پتلے سے روشندان کے راستے برقی روشنی کی ہلکی سی لکیر اندر داخل ہو رہی تھی اور کمرے میں اتنا اُجالا تھا کہ میں سب کچھ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کا ارادہ کیا تو میرا سر بے اختیار چھت سے ٹکرایا اور میں آہ بھر کر رہ گیا۔ اس کمرے کی چھت بہت نیچی تھی۔ جس کا میں نے پہلے اندازہ نہیں کیا تھا۔ سر جھکا کر میں اُٹھ کر کھڑا ہوا تو ٹانگوں اور سارے جسم میں اینٹھن اور ہلکے ہلکے درد کا احساس ہونے لگا۔ گزشتہ مہم کے دوران میں مجھے بے شمار دشمنوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور میں نے درجنوں سخت جان لوگوں سے طاقت آزمائی کی تھی مگر میری یہ دُرگت اس سے پہلے کسی نے نہیں بنائی تھی جو ایک نازک لڑکی نے بنائی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ میری توقع سے زیادہ مستعد اور پھرتیلی ثابت ہوئی کیونکہ میں اس کی جانب سے قطعی بے پروا تھا۔ اس لیے اس نے میری غفلت کا فائدہ اٹھایا۔ دوسری بات یہ تسلیم کرنی پڑی کہ وہ حقیقتاً ایک بہادر اور مارشل آرٹس میں تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ میں نے اسے مالِ غنیمت سمجھ کر پکڑنا چاہا مگر اس نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا۔

میری کنپٹی کی انتہائی نازک اور حساس جگہ پر اُس کے جُوتے کی ٹھوکر کی ضرب نے میری رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ گردن پر اس کا وار اتنا مؤثر نہ تھا کیونکہ اگر یہ چوٹ نہ کھاتا پھر بھی میں بیہوش ہو جاتا۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اپنی کنپٹی پر چلا گیا جہاں ایک حصّے کا گوشت پھُول کر گومڑے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسے اُنگلی سے چھُوتے ہی درد کی ایک لہر پھر میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے میں سر جھکائے روشندان کے پاس پہنچا اور باہر جھانکنے کی کوشش

کی۔ باہر کھلا میدان تھا اور تاروں بھرا آسمان نظر آ رہا تھا، لیکن یہ روشندان اتنا چھوٹا اور تنگ تھا کہ اس میں سے میرا جسم تو کیا سر بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ کمرہ تقریباً سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا تھا۔ روشندان کے بالمقابل ایک کھڑکی نما مختصر دروازہ تھا جس کی لمبائی بمشکل ساڑھے تین فٹ اور چوڑائی سوا دو فٹ ہو گی۔ دروازہ بہت مضبوط تھا۔ محض ہاتھوں کی مدد سے اسے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ دراصل یہ کمرہ نہیں تھا بلکہ ایک مختصر دو چھتی نما سٹور روم تھا جو بعض مکانوں میں چھت اور سیڑھیوں کی درمیانی جگہ کو بامصرف بنانے کی غرض سے بنا لیا جاتا ہے۔ عموماً اس میں چھوٹا موٹا گھریلو سامان، بستر لحاف اور کتابیں وغیرہ رکھی جاتی ہیں مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔

ابھی میں دروازے کو ٹٹول کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دروازے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوجی بوٹوں کی آواز پہچاننے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔ وہ تعداد میں تین چار معلوم ہوتے تھے اور کرخت آوازوں میں گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں دروازے سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھُلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میری جسمانی کمزوری اور اسلحہ سے محرومی کے پیشِ نظر اتنے بہت سے فوجیوں سے بیک وقت نمٹنا اس وقت ایک مسئلہ تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جدید ترین آٹومیٹک اسلحہ سے مسلح تھے مگر جدوجہد کیے بغیر بزدلوں کی طرح جان دے دینا میرے مسلک، اصول، تربیت اور مزاج کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں مرنے سے پہلے ایک دو دشمنوں کو جہنّم واصل کرنے کے ارادے سے مستعد اور کمر بستہ ہو گیا مگر فوجیوں نے دروازے کے باہر رُکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ باتیں کرتے اور ایڑیاں بجاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزر کر چلے گئے۔ میں نے وقتی طور پر اطمینان کی سانس لی مگر یہ بھی احساس تھا کہ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ مجھے اُنہوں نے بے بال و پَر کر کے قفس میں بند کر دیا تھا اور کسی بھی لمحے مجھے شکار کر سکتے تھے۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر مجھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے چوکنا ہو کر روشندان میں سے دیکھنے اور سُننے کی کوشش کی مگر میری نگاہوں کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی کہ میں زمین کی سطح سے قدرے بلندی پر ایک دو چھتی نما کمرے میں قید تھا جہاں سے فرار کا راستہ کوئی نہیں تھا مگر اتنی آسانی سے ہار مان لینا میری سرشت میں نہیں تھا اس لیے میں دوبارہ بستر پر جا گرا اور صورتِ حال کی سنگینی پر غور کرنے لگا مگر ذہن اتنا تھکا ہوا اور مجروح تھا کہ میں سوچنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔ میں نے بہتیرا دماغ پر زور ڈالا مگر ذہن میں کوئی کوندا نہیں لپکا۔ مجبور ہو کر میں نے بستر پر لیٹ کر آرام کر کے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کو مجتمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہلکی سی غنودگی چھائی اور میں ایک بار پھر خواب کی وادی میں پہنچ گیا۔

ایک کھٹکے نے مجھے بیدار کر دیا۔

آواز دروازے کی جانب سے آ رہی تھی۔ کوئی شخص آہستگی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے خاموشی سے بستر سے اُٹھ کر دروازے کے نزدیک پوزیشن سنبھالی اور آنے والے کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ چونکہ دروازہ چھوٹا تھا اس لیے اندر داخل ہونے والے کے لیے لازم تھا کہ وہ سر جھکا کر اندر داخل ہو۔ میرے بچاؤ کے لیے یہی ایک نکتہ اُمید افزا تھا۔ تھوڑی دیر کے مزید آرام کے بعد میں کافی بہتر محسوس کر رہا تھا اور کسی بھی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ دروازہ کھُلنے کا عمل کچھ طویل ہو گیا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ دروازے کی چٹخنی کافی پرانی اور زنگ آلود ہو چکی تھی اور کھولنے والے کی کوشش یہ تھی کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میں سانس روکے کھڑا رہا یہاں تک کہ لگ بھگ ایک منٹ گزر گیا۔ ایک منٹ کا یہ وقفہ میرے لیے انتہائی طویل اور سوہانِ روح تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں جس اعصابی کشمکش اور ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کبھی اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

بالآخر چٹخنی کھُل گئی اور آنے والے نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ آہستگی سے بے آواز کھُلنے لگا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ اس قدر خاموشی اور رازداری کے ساتھ دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی مگر ہو سکتا ہے کہ نہتا اور بے دست و پا ہونے کے باوجود میری گزشتہ کارروائیوں کی وجہ سے وہ لوگ میری طرف سے زیادہ محتاط ہو گئے ہوں، لیکن اگر وہ سمجھتے تھے کہ

www.pdfbooksfree.pk

بے خبری کے عالم میں مجھے بے قابو کر لیں گے تو یہ ان کا خیالِ خام تھا۔ میں اُن کا استقبال کرنے کے لیے دروازے پر ہی موجود تھا۔

دروازہ پوری طرح کھل چکا تھا اور ایک سر اس کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ میرے لیے آئیڈیل موقع تھا۔ میں نے ہاتھ کو کلہاڑا کہا ہتھیار میں تبدیل کر لیا اور ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا میں نے پھرتی کے ساتھ اسے تھام کر اندر کھینچ لیا اور بستر پر ڈال دیا۔ اب میں دوسرے آدمی کے اندر آنے کا منتظر تھا مگر جب اس کے بعد کوئی اور اندر نہیں آیا تو میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا۔ بستر کے نزدیک پہنچا تو ایک مانوس بھینی بھینی خوشبو نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے حیرت اور بےیقینی سے دیکھا۔ بستر پر کسی فوجی کی بجائے وہی لڑکی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ جس نے مجھے گھائل کیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر اس قدر خاموشی سے پُراسرار انداز میں اس کا یوں آنے کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے تراشیدہ بال اس کے شانوں اور بستر پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک وہی لباس پہنے ہوئے تھی جس میں میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ میں نے فوراً اس کی جیبوں کی تلاشی لی مگر کوئی ہتھیار یا پستول موجود نہیں تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ اس لیے میں نے اسے اس کی تمام رعنائیوں سمیت اسی جگہ چھوڑا اور تیزی سے دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ قدرت نے مجھے اس پنجرے سے آزاد ہونے کا بہترین موقع فراہم کر دیا تھا جس سے فائدہ نہ اُٹھانا سراسر احمقانہ فعل ہوتا۔ میں دروازے سے سر جھکا کر باہر نکلا تو سامنے ایک برآمدہ تھا جس کے دوسرے سرے پر چوبی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے اور زینہ بہ زینہ نیچے اُترنے لگا۔ یکایک فوجی بوٹوں کے آپس میں ٹکرانے کی مانوس مگر کرخت آواز نے مجھے ٹھٹھک کر رُکنے پر مجبور کر دیا۔ پھر بندوق کو کندھے پر رکھنے اور اس پر ہاتھ مارنے کی آواز سنائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی فوجی اپنے افسر کو سلیوٹ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں سے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میں دونوں طرف سے پھنس چکا تھا۔ سیڑھیوں پر اُوپر اور نیچے دونوں جانب سے فوجی نازل ہونے والے تھے۔ میں دوبارہ لپک کر اپنی کوٹھری کی طرف آیا۔ دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے میری نظر دیوار پر پڑی۔ یہ ایک چوبی دیوار تھی اور دروازے کے سامنے لکڑی کا ایک تختہ لگا ہوا تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ میں نے تختے کو دیوار سے لگایا تو دیوار برابر ہو گئی۔ گویا اس کوٹھری کا دروازہ لکڑی کی اس دیوار کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور گہری تلاش اور جستجو کے بغیر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ لکڑی کی یہ دیوار مسلسل نہیں ہے اس کے پیچھے ایک دروازہ اور مختصر سا کمرہ بھی موجود ہے۔ قدموں کی آوازیں نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ میں لکڑی کا تختہ ہٹا کر جھک کر دوبارہ کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوا۔ کھینچ کر دیوار کو برابر کیا اور پھر دروازہ بھی بند کر دیا۔ ابھی میں سانس بحال نہیں کرنے پایا تھا کہ فوجی قدموں کی آوازیں پھر دروازے کے نزدیک آ گئیں۔ میں نے اپنی سانس روک لی مگر کسی نے دیوار اور دروازے کے سامنے رُکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ کھسکنے والی دیوار اور چھوٹا سا دروازہ ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ جب وہ دروازے کے سامنے سے گزرے تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پانچ چھ آدمی تھے۔ ان میں سے دو سیڑھیوں پر اوپر کی جانب سے نیچے کی طرف جا رہے تھے اور غالباً چار نیچے سے اوپر کی جانب گامزن تھے۔ میں سانس روکے خاموش بیٹھا دل کی دھک دھک کو قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ وہ سب گزر کر چلے گئے۔

میں نے دروازہ تو بھیڑ دیا تھا مگر اندر سے اسے بند یا مقفل کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ یوں بھی میں اسے بند کرنے کی ضرورت سے بے نیاز تھا۔ میرے لیے سب سے پہلے بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی مگر اس کی سانس کی آمد و رفت ہموار اور معمول کے مطابق ہو چکی تھی۔ میں نے جھک کر اس کی نبض تھامی جو بالکل نارمل تھی۔ اچانک اس کے اندر زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اس نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور کروٹ بدلی اور پھر اچانک آنکھیں کھول دیں۔ میں تب تک اس پر جھکا ہوا تھا مگر گزشتہ تلخ تجربے کے پیشِ نظر پوری طرح چوکس اور مستعد تھا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے بے ساختہ کروٹ لے کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے مضبوطی سے اس کے دونوں بازو مروڑ کر اسے بے بس کر دیا۔ ایک ہلکی سی کراہ

اس کے ہونٹوں سے نکلی مگر میں اس کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ایک نازک اندام اور حسین لڑکی ہونے کے باوجود وہ کس قدر مضبوط اور طاقت ور تھی اگر میری طرف سے تھوڑی سی غفلت یا کوتاہی ہوتی تو شاید ایک بار پھر وہ مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ چند لمحے وہ پورے زور اور جان کے ساتھ آزاد ہونے کے لیے کشمکش کرتی رہی مگر میری گرفت آہنی تھی۔ مایوس اور مجبور ہو کر اُس نے جدوجہد ترک کر دی۔

"چھوڑو۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ دبی آواز میں بولی۔

"آواز بلند نہ کرنا ورنہ میں تمہاری گردن دبا دوں گا۔" میں نے بھی سرگوشی میں کہا مگر میرا لہجہ انتہائی خوفناک تھا۔

"بے وقوف۔ وقت ضائع مت کرو ورنہ یہاں سے کبھی نہیں نکل سکو گے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اس بار میں تمہاری چال میں نہیں آؤں گا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں دوست ہوں۔ میں نے اُن لوگوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے تمہیں اس محفوظ جگہ پر چھپا دیا تھا ورنہ اس وقت تک وہ تمہاری تکا بوٹی کر چکے ہوتے۔"

اس بار میں واقعی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بازوؤں پر میری گرفت ہلکی ہو گئی اور اُس نے موقعے سے فائدہ اُٹھانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔

اس کے جسم کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور دوسرے ہی لمحے وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے آزاد ہو چکی تھی۔ میں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ برق رفتاری سے دوسری جانب کھسک گئی۔ کمرہ انتہائی تنگ اور مختصر تھا جس میں کافی جگہ پلنگ اور بستر نے گھیر رکھی تھی۔ دروازے کے سامنے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لیے روشندان کے برابر والے کونے میں پناہ لینے کے سوا کوئی اور جگہ نہ تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔ جسمانی کشمکش کے باعث اس کی سانسیں ایک بار پھر بے ترتیب ہو گئیں۔ اس انتہائی سنگین اور خطرناک ماحول اور نازک ترین موقعے سے دوچار ہونے کے باوجود میں اس کی دلکشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

چند لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اُس نے ایک لمبی سانس لی اور سر کو جھٹک کر اسی جگہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میں بھی پلنگ کے آخری کنارے پر بیٹھ گیا مگر پوری طرح چوکنا اور ہوشیار تھا۔

"سنو،" وہ اس بار بے تکلفانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی "کیا تمہارے بھیجے میں بالکل عقل نہیں ہے۔ تمہیں دوست اور دشمن کی پہچان نہیں ہے۔ میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ دوست ہوں۔"

"مگر کیوں؟ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ ان فوجیوں کی زبانی مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ تم ایک جی دار مفرور سپاہی ہو۔ تم نے اکیلے ہی اپنے تمام دشمنوں کو ناک چنے چبوا دیئے ہیں۔"

"اور اسی لیے تم میری دوست بن گئیں۔ حالانکہ میں تمہارے ملک اور قوم کا دشمن ہوں اور یہاں کا چپہ چپہ میرے خون کا پیاسا ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہاں۔ یہاں کا چپہ چپہ تمہارے خون کا پیاسا ہے۔" وہ جھلا کر بولی "مگر میں تمہاری دوست ہوں۔ اس لیے کہ میں تمہاری ہم وطن اور ہم قوم ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلا کر بولی "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اگر مجھے تمہارے گلے کا لاکٹ نظر نہ آتا تو شاید میں تمہیں اُن لوگوں کے حوالے کر دیتی۔"

اطمینان اور خوشی کی ایک لہر میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ بالآخر دشمن کی اس وسیع سرزمین پر مجھے ایک ایسی ہستی مل

www.pdfbooksfree.pk

گلی تھی جسے میں اپنا کہہ سکتا تھا۔

"اب تو یقین آگیا نا؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر ہاں کہا مگر میرا ہاتھ بے اختیار میری زخمی کنپٹی پر رینگ گیا۔ وہ ہنس پڑی اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اس کی مسکراہٹ اور ہنسی اتنی ہی روشن اور خوش کن تھی۔

"سوری!" وہ شانے اُچکا کر بولی "میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا اور تمہیں بچانے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ مجھے نہیں سوجھا!"

میں بھی اس کی صاف گوئی اور سادگی پر ہنس پڑا۔ کمرے میں کشیدگی اور بے اعتمادی کی فضا اب ختم ہو چکی تھی اور اپنائیت اور دوستی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"عاشی!" اُس نے سادگی سے جواب دیا۔

"عاشی!" میں نے اس کا نام اپنی زبان سے دوہرایا۔ اور ایک مٹھاس سی میرے منہ میں گھل گئی "یہ بتاؤ۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو! اور ہاں، بائی دی وے یہ علاقہ کون سا ہے؟"

وہ ایک بار پھر ہنسی مگر پھر اس نے بچوں کی سی معصومیت سے بے اختیار اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "میں یہاں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئی ہوئی ہوں۔ اس وقت وہ سب شادی پر گئے ہوئے ہیں۔"

"تمہیں اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟" میں نے کہنی بستر پر ٹکا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"جب تمہیں پیچھے پیچھے پر چھپائے ہوئے کر ڈروں دشمنوں سے ڈر نہیں لگتا تو میں بھی تو اسی قوم کی بیٹی ہوں۔" اس کی سادہ سی دلیل نے مجھے لاجواب کر دیا۔

"اچھا دیکھو۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دو گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی اور وہ لوگ دوبارہ تمہاری تلاش شروع کر دیں گے۔ انہوں نے بھی تمہیں پکڑنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس وقت تمہارے فرار ہونے کا بہترین موقع ہے۔ میں یہی بتانے تمہارے پاس آئی تھی۔" وہ کھسیانی ہو کر سر کھجانے لگی۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

"مگر وہ ہیں کتنے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ہیں۔ مگر تمہیں اس سے کیا؟" پھر وہ مسکرا کر بولی "جو لوگ کسی مقصد کے لیے نکلتے ہیں وہ اپنے دشمنوں کی گنتی نہیں کرتے"

"اچھا فلسفہ ہے۔ پھر بھی معلوم تو ہو۔"

"تین جیپیں، فوجیوں سے بھری ہوئی اس بنگلے میں کھڑی ہیں۔ آس پاس کا علاقہ بھی اِن سے پُر ہوا ہے"

"تو پھر میں نکلوں گا کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر اُس نے فرش پر پڑی ہوئی پوٹلی اُٹھائی اور مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ لے کر ہی آئی تھی۔ وہ بولی "اس میں فوجی وردی ہے اور ایک پستول بھی ہے۔ تم جلدی سے لباس تبدیل کر لو۔ میں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

میں پوٹلی سنبھال کر کھڑا ہو گیا "مگر یہ علاقہ کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنے ملک کی سرحد سے تیس میل دور ہو۔ میں راستے میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ خوشبو کی طرح باہر نکل گئی مگر کمرہ اس کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ جرابیں اور بوٹ پہنے۔ سر پر ٹوپی جمائی اور کمر میں پستول لٹکا لیا۔ دبے پاؤں جھک کر دروازے سے باہر نکلا تو سامنے سیڑھیوں کے نزدیک وہ سراپا انتظار بنی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور سیڑھیوں سے اُوپر کی جانب چل دی۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگا۔ ہر لمحے یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی حریف سامنے نمودار نہ ہو جائے۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم ایک مختصر سی گیلری میں پہنچ گئے۔ جس کے کونے پر ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشبوؤں اور رنگینیوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ وہ مسکرا کر بولی "یہ میرا کمرہ ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔" میں نے کہا پھر بولا "بہت خوبصورت ہے بالکل تمہاری طرح۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور تعجب تھا مگر پھر اس کی آنکھیں حیا سے جھک گئیں۔ میں خود بھی اپنی اس نادانستہ جسارت پر کچھ حیران اور شرمسار ہو گیا۔

وہ لپک کر کھڑکی کے نزدیک گئی اور اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ کھڑکی خاصی کشادہ تھی اور زمین سے زیادہ بلندی پر نہ تھی۔

"وہ دیکھو۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "وہاں سامنے درختوں کے نیچے دو جیپیں کھڑی ہیں۔ تم ان میں سے ایک جیپ لیکر سامنے والی کچی سڑک پر چلے جاؤ۔ مشرق کی سمت چلتے رہنا۔ تیس میل بعد وطن کی زمین پر پہنچ جاؤ گے۔"

اس نے یوں کہا جیسے یہ سب نہایت آسان کام ہو۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پوچھا "مگر میں نیچے کیسے جاؤں گا؟"

"اس پرنالے کے ذریعے۔" اُس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر مجھے دیوار کے ساتھ لگا ہوا موٹا سا پائپ دکھایا۔ "اب دیر نہ کرو۔ خدا حافظ۔"

میں نے ایک بار پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ حالانکہ تشویش کی پرچھائیاں بھی اس کے خوبصورت چہرے پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ "خدا حافظ عاشی۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا؟"

"ایک بار میری جان بچانے کا اور دوسری بار پھر موت کے منہ میں دھکیلنے کا۔" میں نے شرارت سے کہا تو وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ "اچھا۔ خدا حافظ۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

"انشاء اللہ۔" اس نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا اور میرا شانہ تھپکا۔ "ڈرنا مت۔ اچھے بچوں کی طرح سیدھے گھر پہنچ جانا۔ شاباش۔"

پائپ کے راستے نیچے اُترنا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔ میرے اور درختوں کے سائے تلے کھڑی ہونے والی جیپوں میں کم از کم دو سو فٹ کا فاصلہ تھا مگر رات کی تاریکی میری معاون تھی۔ میں نے سر جھکایا اور بگٹٹ جیپوں کی طرف بھاگتا ہوا قریبی جیپ کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ جیپوں میں کوئی موجود نہیں تھا مگر دستور کے مطابق ہنگامی حالات میں استعمال کرنے کی غرض سے چابیاں اگنیشن میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک جیپ میں سوار ہونے کے بعد میں نے گردن گھما کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا مگر اس کے باوجود میں عاشی کو کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا اور جیپ سٹارٹ کر دی۔ لائٹ آن کی تو عاشی کے بیان کے مطابق سامنے کچی سڑک نظر آ رہی تھی۔ میں نے جیپ کو ریورس کیا اور تیزی سے کچے راستے پر دوڑا دیا۔ اسی لمحے فضا میں کرخت آوازیں گونجنے لگیں۔ خالص فوجی انداز میں "ہیواز دیئر" اور "ہالٹ" کے احکام میرے کانوں سے ٹکرائے مگر سننے اور رُکنے کی فرصت کہاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے فضا آٹومیٹک فائر کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ کسی جگہ سے جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور کچھ سائے فائر کرتے اور دوڑتے ہوئے اُس جیپ کی طرف بڑھنے لگے جسے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ گولیاں بارش کی بوندوں بلکہ اولوں کی طرح میرے آس پاس برس رہی تھیں مگر میں ان سے بے نیاز پوری رفتار سے جیپ دوڑا رہا تھا۔ آغازِ سفر سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مجھے اِن مراحل سے گزرنا ہو گا لیکن ذہنی طور پر ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری طرح تیار اور مستعد تھا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، سڑک پختہ نہیں تھی اور خاصی خراب

www.pdfbooksfree.pk

حالت میں تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مگر تعاقب کرنے والوں کی روشنیاں مجھ سے کافی دُور تھیں۔ میں نے کچی سڑک چھوڑ کر ناہموار راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ عاشی نے مجھے بتا دیا تھا کہ قریباً تیس میل مشرق کی جانب میرے وطن کی سرزمین تھی۔ میں کشاں کشاں اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میری منزلِ مقصود میرے سامنے تھی اور مجھے یقین تھا کہ اسکی کشش مجھے خود بخود اپنی طرف کھینچ لے گی۔ جیپ ناہموار زمین پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ اُچھل رہی تھی۔ بعض اوقات میرے لیے سٹیرنگ سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پہاڑ۔ درخت۔ ندی۔ نالے راستے میں جو کچھ بھی تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو بس اپنی منزل پر پہنچنے کی دُھن تھی۔ چند میل اسی طرح سفر کرنے کے بعد سامنے ایک اونچا پہاڑ میری راہ روکے کھڑا تھا۔ مجھے چکر کاٹ کر دوسری جانب جانا تھا۔ میں نے بلا تاخیر جیپ کا رُخ بائیں جانب موڑ دیا۔ جیپوں کی روشنیاں اور آٹومیٹک ہتھیاروں کی فائرنگ میرے تعاقب میں تھی مگر وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔ یکایک میرے سامنے ایک جیپ کی لائٹ روشن ہوئی اور چکا چوند کی وجہ سے مجھے جیپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ جیپ روکے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً میں نے بریک لگا دیئے اور گاڑی کی لائٹیں بجھا دیں۔ سامنے والی جیپ جو ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی حرکت میں آ گئی تھی اور میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس جیپ میں ایک ڈرائیور کے علاوہ دو اور فوجیوں کے ہیولے میں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ [illegible] مشین گنیں سنبھالے ہوئے کھڑے تھے۔ جیپ بہت تیزی سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں بالکل سامنے سے ان کی گاڑی سے اپنی گاڑی ٹکرا دیتا۔ مگر اتنی دیر میں ان کے اسلحہ سے نکلنے والی گولیاں میرا جسم چھلنی کر دیتیں۔ جیپ تیزی سے میری طرف بڑھی آ رہی تھی اور میرا ذہن اس سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اچانک مجھے ترکیب سُوجھ گئی۔ جیپ مجھ سے قریباً سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ جب وہ اور نزدیک آئی تو میں نے اچانک فل لائٹس آن کر دیں۔ ڈرائیور اور دونوں فوجی اس کے لیے مطلق تیار نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تیزی سے اپنی جیپ کو دائیں جانب موڑ لیا۔ سامنے والی جیپ کچھ اور نزدیک آ گئی تھی اور ان سے ہونے والی فائرنگ کی بعض گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر کے پاس سے گزری تھیں۔ مجھے ان کی کوئی پروا نہ تھی۔ مجھے اب تک یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ دُشمن کے فوجیوں کو خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے مجھے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کوئی گولی میرے جسم میں پیوست نہیں ہوئی تھی۔

لیکن جب چاروں طرف سے گولیوں کا مینہ برس رہا ہو تو کوئی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کون سی گولی قدرت نے اس کی زندگی ختم کرنے کے لیے بنائی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی یہ میرا ایمان تھا اور فوجی تربیت کے دوران میں ہمیں بار بار ہمارے استادوں نے یہ بات سمجھائی تھی کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور جو گولی تمہارے لیے بنی ہے۔ خواہ فولادی پردوں میں بھی چھپ کر بیٹھ جاؤ وہ تمہیں ضرور تلاش کر لے گی۔ مگر اب میرے لیے زیادہ عرصے اس جیپ میں بیٹھ کر اپنے دُشمنوں کا انتظار کرنے کا موقع نہ تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا تھا جو میں نے کر لیا۔

میں نے جیپ کی روشنیاں بجھا کر آہستگی سے موڑا اور اسے بائیں جانب کے قدرے کھلے میدان کی طرف ڈال دیا۔ چاروں طرف تاریکی تھی اور گولیوں کی مسلسل فائرنگ کی آوازوں کے باعث میری جیپ کے انجن کی آواز میرے تعاقب کرنے والوں کو سنائی نہیں دے سکی تھی۔ جوں جوں میری آنکھیں تاریکی کی عادی ہوتی گئیں! میں نے جیپ کی رفتار میں اضافہ کر دیا یہاں تک کہ میں خاصے فاصلے تک پہنچ گیا۔ دریں اثنا میں نے ایک زبردست دھماکے کی آواز سُنی اور آگ اور روشنی کا ایک بہت بڑا گولا اُس جگہ نمودار ہوا جہاں کچھ دیر پہلے میری جیپ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ کوئی راکٹ تھا جو کافی فاصلے سے پھینکا گیا تھا۔ راکٹ نے خاصی تباہی پھیلائی مگر میں اس کی زد سے محفوظ تھا۔ البتہ وہ جیپ اور اس میں سوار مسافر جو پوری قوت کے ساتھ درخت سے ٹکرا کر اُلٹ گئی تھی۔ اس حملے کا نشانہ بنی ہوگی اور ان لوگوں کی راکھ کے سوا وہاں کچھ باقی نہ رہا ہوگا۔

مجھے محسوس ہُوا کہ راستہ ناہموار ہو گیا ہے یکایک ایک بہت گہرا کھڈ سامنے نمودار ہوا۔ میری جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی

کھڈ اور جیپ کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ جیپ زور سے اُچھلی اور اس کے اگلے پہیئے کھڈ میں گر گئے، لیکن میرے حواس بھی پوری طرح حاضر تھے۔ میں نے برق رفتاری سے جیپ کی پچھلی نشست پر چھلانگ لگائی اور میں دوسری جست میں جیپ سے باہر اُچھل کر فضا میں جسم کو خم دے رہا تھا۔ انتہائی نازک مرحلہ تھا لیکن قدرت میرے ساتھ تھی۔ چند لمحے کی تاخیر سے میں کھڈ کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو سکتا تھا مگر اب میں ایک پتھریلے فرش پر کولہوں اور کہنیوں کے بل گرا ہوا تھا۔ چوٹ زیادہ نہیں تھی، لیکن اگر زیادہ ہوتی تب بھی میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ زمین پر گرتے ہی میں دوبارہ گیند کی طرح اُچھلا اور چند فٹ دُور جا کر قدموں کے بل کھڑا ہو گیا۔ معاً مجھے جیپ کے کھڈ میں گرنے کی آواز سنائی دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس موت کے غار کی گہرائی کتنی زیادہ ہے۔ جیپ کے بارے میں سوچنا لاحاصل تھا اس لیے میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں اب گولیوں کے ساتھ ساتھ راکٹ بھی برس رہے تھے اور سارا علاقہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔ شاید وہ مجبوری اور مایوسی کے عالم میں اب مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ میں آگ اور آہن کے اس طوفان کی زد سے محفوظ تھا اور اب بائیں جانب ٹیلوں اور پہاڑیوں پر دوڑ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنا تیز دوڑا ہوں گا۔ نہ ہی اس کے بعد اس برق رفتاری کی حد کو چھو سکا۔ چند ہی لمحوں میں پہاڑیوں نے مجھے اپنے کھردرے اور سنگین دامن میں سمیٹ لیا اور میں دُشمنوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے بھاگنے کی رفتار میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ میری سانس پھُول گئی، ٹانگوں نے میرے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا، مگر کوئی نادیدہ طاقت مجھے دھکیلتی ہوئی لیے جا رہی تھی اور میں کشاں کشاں آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اگرچہ ہر قدم پر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ بس اب دوسرا قدم نہ اُٹھا سکوں گا اور تھکن سے چُور ہو کر گر جاؤں گا۔ نہ جانے جسم و دماغ کی یہ کشمکش کتنی دیر تک جاری رہی اور میں اَن جانے راستوں پر آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ قوتِ ارادی نے بھی جواب دے دیا اور میں بے دم ہو کر سنگریزوں پر گر گیا۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

قریباً نصف گھنٹے بعد میری آنکھ کھلی تو آسمان پر یہاں وہاں تارے چمک رہے تھے جیسے کسی دوشیزہ کے دھانی دوپٹے پر سلمہ ستارا ٹانکا ہوا ہو۔ میں تھوڑی دیر تک زمین پر لیٹا آسمان کے حسن میں کھویا رہا۔ کہیں کہیں سیاہ بادلوں کے ٹکڑے بھی آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور زندگی کی لطافت کا احساس ہوا تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں اپنے گرد و پیش سے پوری طرح آگاہ اور باخبر ہو چکا تھا۔ کان لگا کر سُننے کی کوشش کی مگر ہر طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ میرے دُشمنوں کی جیپیں توپیں اور بندوقیں اب خاموش ہو چکی تھیں۔ یا تو وہ مجھے مُردہ سمجھ کر واپس لوٹ گئے تھے یا پھر میری تلاش کی نئی راہیں ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

ہوا کی تازگی نے مجھے نئی زندگی اور حوصلہ بخشا اور میں معمولی سی کوشش کے بعد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے لیے ہر سمت انجان اور ہر راستہ گمنام تھا۔ پھر بھی مجھے سفر طے کرنا تھا۔ بلا سوچے سمجھے میں نے اپنی بائیں جانب چلنا شروع کر دیا۔ تھکن اور بھوک کے مارے بہت بُرا حال تھا، لیکن میں زندگی، خوراک اور رہائی کی جستجو میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک پہاڑی کی اوٹ میں روشنی چمکتی ہوئی دیکھی اور وہیں ٹھٹک کر رُک گیا۔ اس کی مخالف سمت سے بھی روشنی کا جھماکا ہُوا۔ یوں لگا جیسے ٹارچ کی روشنی کے ذریعے کچھ لوگ آپس میں پیغامات یا اشاروں کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ میرے قدم رُک گئے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ فوجی بھی ہو سکتے ہیں جو میری تلاش میں سرگرداں ایک دوسرے کو اطلاعات فراہم کر رہے ہیں یا پھر.....

اس سے زیادہ سوچنے کی مجھے مہلت نہ مل سکی۔ یوں لگا جیسے میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں بے اختیار مُنہ کے بل اوندھا گر گیا اور ایک بار پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر طاری رہی۔ آنکھ کھلی اور دوبارہ دُنیا دیکھنے کی توفیق ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ایک خچر پر مضبوطی سے بندھا ہوا پایا۔ خچر تیز رفتاری سے رواں دواں تھا اس کی ٹاپوں کی آواز خاموش فضا کے سکوت کو توڑ رہی تھی، لیکن اس میں ایک اور آواز بھی شامل تھی۔ یہ زمین سے کسی سخت چیز کے ٹکرانے کی آواز

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ ساتھ ہی کوئی چیز زمین سے گھسیٹی بھی جا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر آس پاس دیکھنے کی کوشش کی مگر رسّی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ البتہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے پتھریلی اور پہاڑی زمین دیکھ سکتا تھا جو خاصی تیزی سے میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے اس بار میں کس کی قید میں تھا؟ میں خود کو نفرین کرنے لگا۔ اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بڑے مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے باوجود میں اتنی آسانی سے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ پھر یکایک مجھے عاشی کا خیال آیا جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر مجھے دشمنوں کے نرغے سے بچایا تھا اور آزادی اور زندگی کے راستے پہ لا کر چھوڑ دیا تھا —— کیا وہ بھی میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی؟ کیا اس کی نیندیں بھی اُڑ چکی ہوں گی اور وہ خیریت کے ساتھ میرے منزلِ مقصود پر پہنچنے کی دُعا کر رہی ہوگی؟ یہ خیال آتے ہی میں اپنے اندر ایک توانائی اور جذبہ محسوس کرنے لگا۔ کوئی میرے لیے بھی دُعا گو تھا۔ میری زندگی اور حفاظت کا خواہاں تھا۔ اس کا خوبصورتی سے سجا ہوا کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا ہوگا۔ اس کے ترشے ہوئے بال اس کے حسین چہرے کے گرد ہالہ کیے ہوں گے اور وہ شاید سو رہی ہوگی؟

یا ہو سکتا ہے جاگ رہی ہو اور میرے بارے میں سوچ رہی ہو؟ عاشی کے تصوّر نے میرے اندر ایک نئی رُوح پھونک دی۔ مایوسی کے اندھیرے دُور ہونے لگے اور روشنی کی کرنوں نے میرے دل و جان کو منوّر کر دیا۔ اس کے بال، اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کا دراز قد، اس کا متناسب اور مضبوط صحت مند جسم جو مجھ جیسے سخت جان کو بھی زمین چٹا چکا تھا۔ وہ کتنی عجیب، کتنی حسین اور کتنی الوکھی لڑکی تھی۔ میری زندگی میں بہت کم لڑکیاں داخل ہوئی تھیں، مجھے لڑکیوں نے کبھی متوجہ اور متاثر نہیں کیا تھا۔ مگر عاشی!! اس کی تو بات ہی اور تھی۔

ایک کرخت آواز نے مجھے جھٹکے کے ساتھ خیالات کے گرداب سے نکال دیا۔

"رُک جاؤ" کی آواز پہ ہم لوگ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ یہ ایک پہاڑی جگہ تھی۔ اُونچے نیچے ٹیلے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ سبزہ اور درخت بھی تھے مگر بہت زیادہ نہیں۔ جغرافیائی حالات سے پتہ چلتا تھا کہ ہم لوگ ایک نیم پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسے پہاڑوں کا آغاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ دُور کافی فاصلے پہ اُونچے اُونچے پہاڑ بھی فخر سے سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک چھولداری نما خیمہ لگا ہوا تھا جس کے سامنے آگ جل رہی تھی۔ کوئی شخص اس آگ کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ بھون رہا تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجّہ ہوا اور ایک ہی جھٹکے میں پتھر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میں اس کا بلند و بالا قد اور مضبوط اور طاقت ور جسم واضح طور پہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مرغی یا کسی اور پرندے کی ایک ٹانگ تھی جسے وہ آگ پر بھون رہا تھا۔ وہ ہم لوگوں کی طرف خاموش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"سردار۔ کوئی نہیں ملا۔ بس ایک یہ ملا ہے!" یہ کہہ کر مجھے گھیر کر لانے والے نے مجھے زوردار دھکا دیا اور میں قریب لڑھکتا ہوا سردار کے قدموں کی طرف چلا گیا۔ زمین پر لیٹے لیٹے سردار کو دیکھا تو آسمان کی بلندیوں کے پس منظر میں وہ کچھ اور زیادہ لمبا اور بھیانک نظر آیا۔ اس کے چہرے پر موٹی موٹی کالی مونچھیں تھیں اور شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان بھی تھے جن کی وجہ سے وہ اور زیادہ ڈراؤنا ہو گیا تھا۔

"کون ہو تم؟" وہ بارُعب کرخت آواز میں بولا اور آگے بڑھ کر اس نے میرے اوپر اپنا پیر رکھ دیا: "سچ سچ بتانا اور جلدی جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس کا بھاری جوتا میرے پیٹ میں چبھنے لگا۔

"میں راہ گیر ہوں۔ مسافر ہوں۔"

"کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جاؤ گے؟"

میں جواب میں خاموش رہا۔ اس علاقے کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میری خاموشی پر اس نے ایک ٹھوکر مجھے رسید کی۔ اگر میں نے اپنے تربیت یافتہ جسم کو پہلے ہی اس کے لیے تیار نہ کر لیا ہوتا تو یہ میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

"جواب دو۔ اور جھوٹ مت بولنا۔" وہ مجھ پر جھک کر بولا۔ "پولیس والے ہو؟"

"نہیں۔ میں پولیس والا نہیں ہوں۔ میں تو مسافر ہوں راستہ بھول گیا ہوں۔ پہلے اُس بڑے بنگلے میں پہنچ گیا جہاں بڑا ساگنا ہے۔ وہاں سے نکلا تو آپ کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

"ہوں!" وہ غصّے سے ہنکارا۔ پھر مجھے ٹھوکر مار کر بولا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔"

میری دونوں کلائیاں مضبوطی کے ساتھ رسّی سے بندھی ہوئی تھیں اس لیے کسی کی مدد کے بغیر میرا اُٹھ کر کھڑا ہونا دشوار تھا۔ پھر بھی میں نے کوشش کی اور لڑکھڑاتا ہوا گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں ہمارا کھوج لگانے کو؟"

"میں نے بتایا تو ہے کہ مجھے کسی نے بھیجا نہیں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ یکایک میری گردن پر ایک زوردار مکّا لگا اور میں دوبارہ زمین پر گر گیا۔

"سردار کے ساتھ تمیز سے بات کرو۔" ایک محافظ درشتی سے بولا۔ اب تک میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا گروہ ہے اور یہ لوگ مجھے پولیس کا آدمی سمجھ کر چوکنے ہو گئے ہیں۔

میں نے دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش کی اور کافی جدّوجہد کے بعد سر و قد کھڑا ہو گیا۔ میرا پیٹ اور گردن ان بے رحم ضربوں کی وجہ سے دُکھنے لگے تھے۔

"اب بولو۔" سردار نے مجھے پوری طرح کھڑے ہونے کا موقع دیا اور اس دوران میں وہ خاموشی سے میری جدّوجہد دیکھتا رہا تھا۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں۔ تم لوگ غلط فہمی میں مُبتلا ہو۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم تمہیں پولیس والا سمجھ رہے ہیں؟"

"تم نے خود ہی تو مجھ سے سوال کیا تھا۔" میں نے تکلیف ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اور پھر تم ایسے ڈاکوؤں کو پولیس کے سوا اور کس کا ڈر ہو سکتا ہے۔"

"بہت ڈھیٹ معلوم ہوتے ہو۔" سردار غرّا کر بولا۔ پھر اُس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے منہ اور جسم پر چند گھونسے رسید کیے۔ میرا سر گھومنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد اُس نے دوبارہ مجھے اپنے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میں اپنا بچاؤ کرنے سے قاصر تھا۔ چُپ چاپ مار کھانے اور برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"بس بس۔" سردار ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مر جائے گا سالا۔ اس سے پوچھ گچھ کرنا بہت ضروری ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب کچھ یاد آیا تمہیں؟"

"مجھے سب کچھ یاد ہے۔" میں نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے اپنی سانس روک لی۔

سردار نے پھر اس شخص کو اشارہ کیا۔ وہ اب مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا، سردار کے حکم کا منتظر تھا۔ مگر اب میں خاموشی سے مار کھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ پہلے ہی وہ میری کافی درگت بنا چکے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میں ایک سخت جان، تربیت یافتہ فوجی نہ ہوتا تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکو میرے نزدیک پہنچتا میں نے اپنے پیروں کو تولا اور جسم کو اوپر اُٹھایا۔ میرا جسم ایک راکٹ کی مانند زمین سے اُونچا اُٹھا اور دوسرے ہی لمحے میں فضا میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ حیران ڈاکو کچھ سمجھ سکتا میری فلائنگ کِک نے اُسے جا لیا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ دوسرے ڈاکوؤں نے جو اتنی دیر میں کافی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے بندوقیں میری طرف تان لیں۔ مگر سردار نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں فائر کرنے سے روک دیا۔ پھر اُس نے زمین سے اُٹھتے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا جو دانت پیستا ہوا میری طرف جھپٹا مگر اس بار میں اُچھلا اور اس پر جا گرا۔ وہ اس بار تیار تھا اور جھکائی دے کر میرا پیر پکڑنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر میں اس کے اس ارادے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ اس لیے میں نے ہوا میں

www.pdfbooksfree.pk

ایک اور پلٹی کھائی اور میری ٹھوکر اس بار اس کی ٹھوڑی پر لگی۔ اس کے منہ سے ایک آہ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس اثنا میں دوسرے ڈاکو مجھ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔ سردار نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اور دوسری جانب ہٹ کر راستہ دیا اور وہ اپنی جھونک میں تیزی سے آگے نکل گیا مگر جب وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھا میرا پیر حرکت میں آیا اور میری ٹھوکر اس کی کنپٹی پر لگی۔ وہ ایک چیخ مار کر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اب ڈاکوؤں کے چہروں پر غصہ اور نفرت کے سائے صاف نمودار ہو گئے تھے اور بندوقوں کی نبلیوں پر ان کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ میری تکا بوٹی کر دیتے اور اس مقصد کے لیے وہ اپنے سردار کے حکم اور اشارے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے لیکن سردار ہی ایک ایسا شخص تھا جو خاموش کھڑا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کی جگہ حیرت اور ستائش کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے۔

وہ ایک لمحہ بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور وہ دھیمی آواز میں بولا "بہت اچھے۔ بہت اچھے تم بہادر آدمی ہو۔ خاموشی سے ہار نہیں مانو گے۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا "کون ہے جو اس کا مقابلہ کرے گا۔"

جواب میں تین چار آدمی للکارتے ہوئے آگے بڑھے مگر سردار کے ہاتھ کے اشارے نے انہیں روک دیا "مقابلے کے لیے اس کے ہاتھ کھولنے ہوں گے اور ایک وقت میں ایک ہی اس سے لڑے گا۔" ان میں سے ایک آدمی اپنی بندوق پھینک کر کھڑا ہو گیا۔ سردار کے اشارے پر وہ نفرت سے پھنکارتا ہوا آگے بڑھا اور جیب سے چاقو نکال کر اس نے میرے ہاتھوں کو رسّی کی مضبوط بندش سے آزاد کر دیا۔ میرے ہاتھ مسلسل اور سختی کے ساتھ بندھے رہنے کی وجہ سے قریب قریب سُن ہو چکے تھے۔ یہ تو میری ڈھٹائی اور سخت جانی تھی جو اب تک خاموشی سے یہ تکلیف برداشت کرتا رہا تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میرے ہاتھوں میں مضبوطی سے پیوست ہونے والی رسّی نے خون کی گردش روک دی تھی اور ان میں شدید درد شروع ہو چکا تھا۔

میں نے مٹھیاں کھول کر اور بند کر کے ہاتھوں کی ورزش کی اور پھر کلائیوں کو بل دے کر بازوؤں کو ہوا میں گھمایا۔ کچھ دیر بعد میرے ہاتھوں میں سکت پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دُکھن اور تکلیف ابھی تک باقی تھی مگر میں ان کو استعمال کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس تمام عرصے میں سردار اور اس کے ساتھی خاموش کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرے ساتھ لڑنے کا ارادہ رکھنے والا شخص بھی چپ کھڑا تھا لیکن اس کے چہرے پر میں اپنے لیے تعریف کے جذبات لکھے ہوئے پڑھ سکتا تھا اور یہ میری نصف جیت تھی جب آپ کا مقابل آپ کی ستائش اور تعریف پر مجبور ہو جائے تو سمجھئے کہ نفسیاتی طور پر آپ نے اس پر برتری حاصل کر لی ہے۔

یکایک سردار کی مضبوط اور بھاری آواز گونجی "تم لڑنے کے لیے تیار ہو؟"

"تیار ہوں" میں نے اپنے اِردگرد پھیلے ہوئے ڈاکوؤں پر نظر ڈالی جن کی تعداد اب درجنوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ سب کے سب میرے خون کے پیاسے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان سب سے باری باری مقابلہ کرنا تھا جو ایک مشکل بلکہ ناممکن کام نظر آنے لگا تھا۔ میں کتنا ہی محنت جان اور تربیت یافتہ سہی، بالآخر ایک انسان ہی تو تھا۔ جسمانی قوت میرے اندر بھی اتنی ہی تھی جتنی ایک عام انسان میں ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلسل اور متواتر تربیت اور مشق نے مجھے زیادہ مضبوط اور مستعد انسان بنا دیا تھا۔ یہ پھرتی اور مستعدی آخر کہاں تک کام دے سکتی تھی۔ میرا مقابلہ جنگلی اور وحشی سورماؤں سے تھا جو کشت و خون اور جان جوکھوں کا کام کرنے کے عادی تھے میں کب تک اور کہاں تک ان سے لڑ سکوں گا، اور شکست کی صورت میں مجھے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔

اس اثنا میں میرا مقابل بڑھ کر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پَر تول رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسّی کاٹنے کے بعد اس نے اپنا چاقو ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ جب اُس نے چاقو کو بند کر کے جیب میں رکھنے کا ارادہ کیا تو سردار نے اسے ٹوک دیا "رُک جا گاموں۔"

گویا اس کا نام گامو تھا۔ کم از کم مجھے یہ تو پتہ چلا کہ میں جس شخص کے ساتھ زندگی اور موت کی لڑائی لڑنے والا ہوں اس

کا نام کیا ہے۔

"چاقو مت پھینک۔ یہ لڑائی تک تیرے پاس رہے گا۔"

گامو کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے معنی خیز انداز میں اپنے ساتھیوں کو اور پھر مجھے دیکھا اور چاقو کو دوبارہ کھول کر اور اپنا جسم تول کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ چاقو پر اس کی گرفت صاف بتا رہی تھی کہ وہ اس لڑائی کے فن سے آگاہ ہے۔ وہ جھپٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا مگر میں اس کا وار روکنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے پینترا بدل کر بائیں جانب جھکائی دی۔ اُس نے بائیں جانب کا رُخ کیا مگر اس اثنا میں میں نے اپنے تربیت یافتہ جسم کو یکایک دائیں جانب جھکا دیا تھا۔ اس کے حملے میں بے یقینی اور کمزوری پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کا ہاتھ میرے نزدیک آیا تو مجھے اس کو تھام کر جھٹکا دینے اور موڑنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت کو مضبوط کر کے جھٹکا دیا ایک کھٹکے جیسی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ کر ہلکا سا دھکا دیا اور وہ چلّاتا ہوا دور جا گرا۔

ڈاکوؤں کے گروہ میں بھی بھنبھناہٹ سی پیدا ہوئی اور ایک اور شخص بندوق پھینک کر چاقو کھولتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ یہ قد و قامت میں دوسرے ڈاکوؤں سے زیادہ تھا اور اس کے قدموں کی مضبوطی سے اس کے جسم کی طاقت اور پھرتی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ غصے سے ہانپ رہا تھا اور یہ اُس کا کمزور ترین پہلو تھا۔ نفرت اور غصے نے اس کی نصف انرجی پہلے ہی ختم کر دی تھی اور میں جان گیا کہ اس پر غلبہ حاصل کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ میرے نزدیک پہنچتا سردار کی آواز ایک بار پھر گونجی "یوں نہیں" سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سردار نے زمین پر پڑا ہوا چاقو اُٹھایا اور میری طرف اُچھال دیا جسے میں نے فوراً ہی دبوچ لیا۔

"لڑائی برابر کی ہونی چاہیئے" سردار نے کہا۔ وہ ایک بہادر اور جری آدمی تھا کیونکہ صرف بہادر انسان ہی اتنا منصف اور فراخ دل ہو سکتا ہے۔

مگر اب میرے تیور بدلے ہوئے تھے۔ میں نے سردار کی نفسیات اور فطرت کا مطالعہ کر لیا تھا اور مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ مجھے کہاں ضرب لگانی چاہیئے۔

سردار نے کہا "دیکھو۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے رعایت نہیں کرے گا۔ مقابلہ برابر کا ہے۔"

اب میں سردار کا مطلب بھی سمجھ گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں چاقو دینے کا مطلب واضح تھا۔ لڑائی کے دوران میں ہم لازماً ایک دوسرے کو زخمی کریں گے اور اس طرح میری قوت اور توانائی ہر مقابلے کے ساتھ کم ہوتی جائے گی۔ سردار میری شجاعت اور مہارت کا قائل ضرور تھا لیکن وہ میری جان بخشی کرنے کو آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

"سردار" میں نے اس بار اسے براہِ راست مخاطب کیا "یہ تماشا تو دو دن بھی جاری رہ سکتا ہے۔ لڑائی چاہتے ہو تو اس کا کوئی انجام بھی ہونا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم انصاف پسند اور بہادر آدمی ہو مگر یہ انصاف نہیں ہے کہ میں اگر جیت بھی جاؤں تو دوسرے آدمی سے لڑوں اور جب تک ان میں سے ایک بھی باقی ہے لڑتا رہوں۔ یہ تازہ دم ہوں گے اور میں تھک چکا ہوں گا ہو سکتا ہے میں زخمی بھی ہو جاؤں۔"

"تو پھر؟" وہ برہمی سے منہ بگاڑ کر بولا۔

"تو پھر اس کا فیصلہ جھٹ پٹ ہونا چاہیئے اور دیکھو۔ ان بے چاروں کو کیوں مارتے ہو۔ لڑائی تم مجھ سے کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہیں اپنی طاقت پر اتنا مان ہے تو انہیں مروانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم خود مجھ سے کیوں نہیں لڑتے؟"

"کیا!" وہ غصے سے دھاڑا "میں تم سے لڑوں گا۔ ایک سردار ایک قیدی سے لڑے گا۔"

www.pdfbooksfree.pk

"کیوں نہیں لڑو گے۔ اگر تمہارے ساتھی مجھ سے لڑ سکتے ہیں تو تم بھی لڑ سکتے ہو۔ سردار کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ بہادر ہو۔ تمہیں ان پر یہی برتری حاصل ہے کہ تم ان سب سے زیادہ طاقت ور اور بلوان ہو۔ ورنہ یہ تمہیں اپنا سردار کیوں بناتے؟"

سردار نے مجھے گھورا پھر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ وہ چپ کھڑے تھے مگر ان کے دلوں کے اندر میری اس بات نے یقیناً ہلچل پیدا کر دی ہوگی۔ یہ ڈاکوؤں اور مجرموں کی نفسیات ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے چیلنج اور للکار کو نظر انداز نہیں کرتے ورنہ وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ مسلسل اور متواتر دوسروں پر اپنی جسمانی اور ذہنی برتری ثابت کرتے رہیں ورنہ ایک چوک، ایک بھول بھی انہیں ان کے مقام سے گرا سکتی ہے۔

"سردار" اس کو تذبذب میں دیکھ کر میں نے کہا: "میں تمہیں چیلنج کر رہا ہوں۔ اگر ہمت ہے تو خود مجھ سے مقابلہ کر۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ہار گیا تو تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

یہ براہِ راست مقابلے کی دعوت تھی جسے مسترد کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے ایک اور چوٹ لگائی: "اور اگر تم ہار گئے تو پھر تمہیں مجھ کو کسی شرط کے بغیر آزاد کرنا ہوگا اور میں جو رعایت اور سہولت مانگوں گا وہ تم مجھے دو گے۔"

"بکواس" وہ دہاڑا۔ "تم زندہ بچو گے تو کوئی رعایت مانگو گے نا؟ مجھ سے لڑنے والا زندہ نہیں رہتا۔"

"تو پھر مجھے تمہاری موت کا افسوس ہے۔" میں نے اس پر ایک اور نفسیاتی ضرب لگائی: "بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ تم کسی وجہ کے بغیر ہی میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہوگا۔"

اب سردار کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ میدان میں کھڑے آدمی کو اس نے دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دیا اور قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔ یہ ایک کمانی دار چاقو تھا اور اس کے کھلنے کی آواز ہی کمزور دل لوگوں کے لیے خاصی ہیبت ناک تھی۔ اس تمام عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظریں میرے چہرے سے نہیں ہٹائیں جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ ایک تربیت یافتہ چاقو باز ہے۔ چاقو پر اس کی گرفت ماہرانہ اور مضبوط تھی۔ وہ ایک دیوہیکل شخص تھا اور اس کے چہرے پر موجود زخموں کے نشانات اس کی جنگجوئی اور بہادری کا ثبوت تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ایک بے رحم مسکراہٹ ہر دم رقصاں رہتی تھی جسے مسکراہٹ بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ امر طے شدہ تھا کہ وہ ایک معاف نہ کرنے والا شخص تھا۔ خصوصاً دشمن کو اس سے کسی بھی لاگ یا رعایت کی توقع نہیں رکھنی چاہیے تھی۔

ہمارے اردگرد کافی کھلی جگہ تھی مگر ڈاکوؤں نے خاص طور پر پیچھے ہٹ کر مزید جگہ پیدا کر دی۔ یہ ایک ہموار جگہ تھی اور اس کا رقبہ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں کبڈی کھیلی جا سکتی تھی۔

سردار نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ ایک نعرہ مار کر وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ فضا میں اس کا بھاری بھرکم جسم ایک بے وزن چیز کی طرح بلند ہوا اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے اس نے ہوا میں دو تین پلٹیاں کھائیں۔ دراصل وہ میرے جسم کی جنبش سے اندازہ لگا چکا تھا کہ میں کس طرف حرکت کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور یہ اس کی جہارت کا مکمل ثبوت تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر گرتا میں نے اس کی خلاف توقع مختلف سمت میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا چاقو میرے جسم سے چند انچ کے فاصلے سے سنسناہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا گزرا۔ اگر میرے اندازے میں معمولی سی غلطی بھی ہو جاتی تو وہ چاقو میرے سینے میں گھاؤ ڈال دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر قدم رکھتا اس نے پنجوں کے زور پر دوبارہ چھلانگ لگا دی اور میں اس کی پھرتی اور چستی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس بھاری بھرکم جثے کے مالک آدمی کا یوں بلا توقف ہوا میں چھلانگ لگا دینا بہت مشکل کام ہے مگر وہ اپنے فن میں ماہر تھا۔ اس بار وہ جھکائی دے کر بائیں جانب سے میرے اوپر حملہ آور ہوا۔ میرے پاس ہٹ جانے کا وقت نہ تھا اس لیے میں نے چاقو والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے وار کو اپنے بازو پر روک لیا۔ میرا تمام جسم اس ضرب کی وجہ سے جھن جھنا کر رہ گیا۔ اس نے مجھے سنبھلنے یا دم لینے کا موقع نہیں دیا اور پے درپے وار شروع کر دیئے یہ حقیقت ہے کہ میرے لیے اس کے پیہم حملوں سے محفوظ رہنا ایک دشوار امر تھا۔ میں غیر ضروری طوالت میں جائے بغیر

www.pdfbooksfree.pk

اتنا کہوں گا کہ وہ ایک بے جگرا اور ان تھک آدمی تھا اور چاقو زنی کے فن میں کسی ماہر استاد سے اس نے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ تک مجھ پہ حملے کرتا رہا مگر اس کے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ بدستور تازہ دم اور پُر اعتماد تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اسے تھکا کر اپنے حملے کا آغاز کروں گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا تھا وہ کسی طرح تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا بلکہ اس کے حملے اور بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار اس کے چاقو کی نوک میرے کاندھے پر لگی۔ میں نے پھرتی سے جسم کو پیچھے جھکایا مگر چاقو میرے جسم پر خراش ڈالتا ہوا پیٹ تک پہنچ گیا۔

اس کا دوسرا جان لیوا حملہ میں نے اپنی کلائی پر روکا اور جب اس نے چاقو کو جھٹکا دے کر کھینچا تو میری کلائی خون میں نہا گئی۔ اس کے چہرے پر ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مسلسل حملوں کے باوجود وہ تازہ دم تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے پر پسینے کا ایک قطرہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

اب اس لڑائی کا طول کھینچنا میرے حق میں کسی طرح بہتر اور مناسب نہ تھا مگر سردار ایسا مدمقابل تھا جسے اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ٹھکانے لگانا بھی ممکن نہ تھا لیکن خوش قسمتی نے میرا ساتھ دیا اور اس نے بذات خود مجھے ایک موقع فراہم کر دیا۔ وہ بائیں جانب جھکائی دے کر میری طرف لپکا اور اس اثناء میں اس نے چاقو کو بھی بڑی پھرتی سے بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ جب وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں اس کے لیے تیار تھا۔ حالانکہ اس کی یہ چال کسی عدو کو بوکھلا دینے کے لیے کافی تھی مگر میں نے اس آرٹ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ جونہی اس کا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر میری گردن کی طرف آیا۔ میں نے دو قدم ہٹ کر ٹانگ چلا دی۔ ضرب اس کی دائیں کلائی پر لگی مگر وہ فوری طور پر سنبھلا اور فضا میں پلٹ کر دوبارہ مجھ پر باز کی طرح گرا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ اسی کا داؤ میں بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ بجلی کی طرح میں نے بھی چاقو کو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا اور ترچھا کر کے اس کی کمر پر حملہ کیا۔ وہ حسبِ توقع پلٹا مگر یہ بھول گیا کہ چاقو اب میرے دوسرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کا بھاری جسم میرے چاقو سے ٹکرایا اور اس کی نوک سردار کے سینے میں اترتی چلی گئی۔ میں اس کی جان لینے کا مطلق خواہاں نہ تھا۔ میں نے فوراً ہی چاقو کو واپس کھینچ لیا مگر اس اثناء میں اس کے جسم کا بوجھ میرے چاقو کو نصف سے زیادہ جسم کے اندر پیوست کر چکا تھا۔ ایک جھٹکے سے میں نے چاقو کھینچا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سردار کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے جان تھا۔

میں اس اچانک اور خلاف امید واقعے کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ میں نے چاقو کی طرف دیکھا۔ وہ خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ دوسری نظر سامنے زمین پر ڈالی جہاں سردار کا بے جان جسم ایک ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ میں ایک ثانیے کے لیے تو سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل عاری ہو گیا مگر پھر یہ خیال مجھے ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا کہ میں جو کہ ڈاکوؤں کے سردار کا قاتل تھا ان مسلح خونخوار لوگوں کے سامنے قریب نہتا کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک چاقو تھا اور میرے مقابلے میں جو لوگ تھے وہ بندوقوں، پستولوں اور خنجروں سے پوری طرح لیس تھے۔

کچھ دیر سناٹا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس واقعے نے ان سب کو ساکت اور بے جان کر دیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے مگر میں کہیں بھاگ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک نہتا شخص اتنے بہت سے مسلح لوگوں سے بچ کر کہاں تک بھاگ سکتا ہے جبکہ وہ نشانے کے بھی پکے تھے۔

میری حالت ایک ایسے شکار جیسی تھی جو چاروں طرف سے شکاریوں کے نرغے میں پھنس چکا ہو اور جس کی جان بچنے کا کوئی بھی امکان باقی نہ ہو۔ میں ان نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی بالکل تیار تھا۔ مقابلے کے بغیر ہار مان لینا میری سرشت میں شامل نہیں تھا۔ بدترین حالات میں بھی میرے ہوش و حواس قائم رہتے تھے جو کہ خدا کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔ مجھے اپنے اللہ پر مکمل ایمان تھا۔ شاید اسی لئے وہ بظاہر ناممکن حالات میں بھی میرے بچنے کے سامان پیدا کر دیتا تھا۔

لیکن اس وقت صورت حال بلکہ مختلف تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی خونخوار ڈاکوؤں کے سردار کو قتل کر دیا تھا۔ اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی اور چاروں اطراف سے اس کے وحشی ساتھیوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ ابتدائی لمحات جنہوں نے ڈاکوؤں کو ہکا بکا کر دیا تھا گزر چکے تھے۔ اب ان کی نگاہوں میں مجھے اپنے لئے نفرت اور انتقام کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کی نظریں آگ برسا رہی تھیں اور ان کے چہروں پر غیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ ان سب نے اپنے ہتھیاروں پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ وہ میرے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے تھے لیکن اب وہ اچانک صدمے کے اثر سے آزاد ہو چکے تھے اور ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آ چکی تھی۔ ان کے چہرے دیکھ کر ہی میں ان کے ارادوں کا اندازہ کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔

''موت، موت اور صرف موت۔''

ہر ایک کے چہرے پر صرف یہی عبارت لکھی نظر آ رہی تھی۔ یکا یک ان کے ساکت جسموں میں حرکت شروع ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگے۔ میرے اردگرد ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک میرے لئے موت کا فرشتہ تھا۔ میں موت کے ان فرشتوں کے درمیان میں تنہا کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک چاقو کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ وہی چاقو تھا جو کہ ان کے سردار کی موت کا سبب بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بندوقوں اور پستولوں سے مسلح تھا اور وہ سب مجھے اپنی گولیوں سے بھون ڈالنے کے لیے بے تاب تھے۔

میں نے موت کو بار بار اپنے روبرو دیکھا تھا لیکن موت کے اتنے بہت سے فرشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ میں چاروں طرف سے ان کے نشانے پر تھا۔ نہ کوئی پناہ گاہ تھی اور نہ ہی عقبی دیوار جو پیچھے ہٹنے کے لیے میری مددگار ثابت ہوتی۔ ہر طرف موت کا موجیں مارتا ہوا سمندر تھا جس کی لہریں لمحہ بہ لمحہ مجھے غرق کرنے کے لئے بڑھی آ رہی تھیں۔

اب ان سب نے اپنی بندوقوں اور پستولوں کی نالیں میری جانب تان لی تھیں۔ ان سب کی انگلیاں لبلبی پر تھیں۔ اس بار موت سے دامن بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس بار میں بے بسی اور لاچاری کے عالم میں جان دینے والا تھا۔ جان بچانے کا تو کوئی راستہ نہ تھا لیکن میں مرنے سے پہلے اپنے کسی ایک حریف کو بھی موت کے گھاٹ اُترنے سے قاصر تھا۔ محض ایک چاقو کی مدد سے میں مدافعت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس ایک لمحے کی دیر تھی کہ میرا جسم گولیاں سے چھلنی ہونے والا تھا۔

موت برحق ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ بھی میرا ایمان تھا کہ آپ کی موت جب، جیسے اور جس جگہ لکھ دی گی ہے اس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ شاید میری موت اسی طرح لکھ دی گئی تھی۔ پہلا موقعہ تھا جب میں کسی مدافعت کے بغیر اپنے دشمنوں کا چارہ اور نشانہ بننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ خون آلود چاقو کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہونے کی بجائے کمزور ہو گئی تھی۔ وہی مثل تھی کہ

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی کا گلہ کرے کوئی

www.pdfbooksfree.pk

گولیوں کی بوچھار سہنے کے لیے میں بالکل تیار تھا مگر میرے عزم وارادے میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مرنا بھی کسی کسی کے نصیب میں ہی ہوتا ہے۔ اب اس طرح کی موت میرا مقدر بن چکی تھی۔

بندوقوں اور پستولوں کی نالیں بلند ہو چکی تھیں اور آگ برسانے والی ہی تھیں کہ اچانک ایک آواز اس سناٹے میں گونجی

"رک جاؤ"

سناٹا اس قدر مکمل تھا کہ موت کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس خاموشی میں گونجنے والی اس آواز نے ہم سب کو چونکا کر رکھ دیا۔ سب کی نگاہیں اس جانب مڑ گئیں جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔

میرے سامنے ایک لمبی تڑنگی، مضبوط عورت کھڑی تھی۔ اس نے سیاہ قمیض اور سیاہ شلوار پہن رکھی تھی۔ سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کھلتے ہوئے گندمی رنگ کی عورت تھی لیکن سیاہ لباس میں اس کا چہرہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی جس کی وجہ سے اس کا بھرپور تندرست سراپا کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس قد وقامت اور ڈیل ڈول کے باوجود اس کی شخصیت میں ایک سحر انگیز مرعوب کن کشش تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک آٹو میٹک رائفل تھی۔

میں اس کی آواز سن کر چونک گیا تھا مگر جب اس کے چہرے اور سراپا پر نظر ڈالی تو میری حیرت اور استعجاب میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے چند قدم آگے بڑھائے تو اس کی شخصیت کچھ اور نمایاں ہو گئی۔

میں نے ڈاکوؤں کی جانب دیکھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پتھر کے بے جان مجسمے ہوں۔

عورت کی آواز ایک بار پھر گونجی۔

"سردار مر گیا۔ مگر میں تو ابھی زندہ ہوں۔ میری اجازت اور حکم کے بغیر تمہیں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے؟"

"بندیا مائی۔ اس آدمی نے سردار کو چاقو سے، مار دیا ہے۔" ڈاکوؤں میں سے ایک ہٹا کٹا جوشیلا نوجوان آگے بڑھ کر بولا۔

اس فقرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس عورت کا نام بندیا ہے اور وہ سردار کی بیوی تھی جو کہ اب بیوہ ہو چکی ہے۔

بندیا کی نظریں سامنے پڑی ہوئی سردار کی لاش پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے بندوق ہاتھ سے پھینک دی اور بے اختیار دوڑ کر لاش کے پاس پہنچ گئی۔ سردار کے جسم سے چاقو باہر کھینچ لینے کے بعد خون بے تحاشہ بہہ نکلا تھا۔ جس نے اس کے مردہ جسم کے علاوہ آس پاس کی زمین کو بھی سرخ کر دیا تھا۔

وہ لاش کے پاس دوزانو بیٹھ گئی۔ سردار کا سر اس نے اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس مردہ جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

اس نے بے اختیار سردار کی پیشانی کو چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ ایک جی دار اور مضبوط قسم کی عورت تھی۔ ظاہر ہے کہ ڈاکوؤں کے سردار کی بیوی کے نرم دل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی آنکھوں

ے درجنوں بلکہ سینکڑوں انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہوگا، ممکن ہے خود اس کے ہاتھ بھی بہت سے انسانوں کے خون ے رنگین ہوں۔ اس لیے موت اور خون کا یہ کھیل یقیناً اس کے لیے نیا نہیں تھا مگر اس سے پہلے وہ بیگانوں کو موت کا دلہن بنتے ہوئے دیکھتی تھی۔ آج پہلی بار اس کا محبوب شوہر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اس کے آنسو اور چہرے کے ثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ درحقیقت اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

چند لمحے کے لیے ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ صرف بندیا کی سسکیوں کی آواز تھی اور سناٹا۔

اس نے بہت جلد اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ سردار کا سر اس نے بہت احتیاط اور محبت سے اپنے زانو سے ہٹایا اور زمین پر رکھ دیا۔ ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھے اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گی۔ اس کے چہرے پر غم وغصہ کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اس نے جب میری جانب خون آلود نگاہوں سے دیکھا تو میں اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کی حدت محسوس کر رہا تھا۔

بندیا نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی بندوق اٹھائی اور میری جانب قدم بڑھا کر رک گئی۔

اس نے بلند آواز میں پوچھا "رحمو یہ سب کیسے ہوا؟"

رحمو ہی ڈاکو تھا جس نے پہلے اس کو مخاطب کیا تھا۔

رحمو نے مختصر طور پر تمام واقعہ اس کو سنا دیا۔ وہ ایک اکھڑ اور صاف گو ڈاکو تھا۔ اس نے کسی مبالغے یا جھوٹ کے بغیر تمام داستان من وعن بیان کر دی کہ سردار کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

بندیا خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور دوٹوک الفاظ میں پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم پولیس کے مخبر ہو؟"

"نہیں۔" میں نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ "میں سردار سے بھی کہتا رہا مگر اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ پھر میں نے اسے روبرو مقابلے کے لیے للکارا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ میں اپنی بچانے کے لیے مقابلہ کر رہا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر سردار کو قتل نہیں کیا۔ اس کا چاقو ہم دونوں کے جسم کے درمیان آ گیا اور کسی ارادے یا کوشش کے بغیر سردار کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ یہ سب کچھ اچانک اور اتفاقیہ ہو گیا ہے۔ میں سردار کا قاتل نہیں ہوں۔ وہ ایک بہادر آدمی تھا۔ اگر اپنی جان بچانے کے لئے مجھے مجبوراً اس کو قتل کرنا پڑتا تو میں بلا جھجک اسے قتل کر دیتا مگر جس طرح وہ مرا ہے اس میں کوشش یا ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے"۔

یہ کہہ کر میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

میری جرأت اور بے خوفی نے اسے متاثر کیا تھا۔

اس نے کہا۔ "تم جانتے ہو قتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟"

"جانتا ہوں۔" میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔ "لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اگر وہ میری بات پر یقین کر لیتا تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا اور وہ اس وقت زندہ ہوتا۔"

بندیا مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ ڈاکوؤں کی خاموشی ٹوٹ چکی تھی اور وہ سب کے سب بولنے لگے تھے۔ ان کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں مگر میں اتنا سمجھ سکتا تھا کہ وہ سب میرے لئے موت کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یکا یک بندیا نے ایک ہاتھ اونچا اٹھایا تو سب خاموش ہو گئے۔

بندیا نے رحمو کی طرف دیکھا جو سب سے زیادہ جوشیلا اور بڑھ بڑھ کر بولنے والا تھا۔ "رحمو، تم کیا کہتے ہو؟"

رحمو غالباً سردار کے بعد گروہ کا سب سے زیادہ اہم رکن تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

"بندیا بائی۔" رحمو نے کرخت آواز میں جواب دیا۔ "خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ اس نے ہمارے سردار کا خون کیا ہے۔ اس کے خون سے ہی ہمارا دل ٹھنڈا ہوگا۔"

بندیا نے ایک لمحہ اس کی جانب اور پھر دوسرے ڈاکوؤں کو دیکھا۔ ان سب کے چہروں پر ایک ہی جواب لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اس کا خون کون کرے گا؟" بندیا نے سوال کیا۔

"میں۔" رحمو نے فوراً جواب دیا مگر ہر ڈاکو "میں" کی آواز بلند کر رہا تھا۔

"سردار نے اس کو مقابلہ کرنے کا موقعہ دیا تھا۔ کسی بھی آدمی کو ہم عدالت کچہری کی طرح موت کی سزا نہیں دے سکتے۔ ہمارے قانون کے مطابق اس کو مقابلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔"

سب ڈاکو ایک دم خاموش ہو گئے۔

بندیا ایک معاملہ فہم ٹھنڈے مزاج کی عقلمند عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس قدر جذباتی اور ہنگامی حالات کے باوجود اس کا دماغ صحیح طور پر کام کر رہا تھا۔

بندیا نے گہری نظروں سے سب ڈاکوؤں کا جائزہ لیا پھر اس کی آواز بلند ہوئی۔

"بولو۔ اس سے مقابلہ کون کرے گا؟"

ایک لمحہ خاموشی طاری رہی۔ پھر ڈاکوؤں نے باہمی طور پر دبی زبان میں ایک دوسرے سے مشورہ شروع کر دیا۔

بندیا نے کہا۔ "رحمو، تم سردار کے سب سے زیادہ بھروسے کے آدمی تھے۔ اپنی طاقت اور بہادری پر بھی تمہیں ناز ہے۔ کیوں نہ تم اس کے ساتھ زور آزمائی کرو؟"

رحمو اس اچانک تبدیلی سے قدرے پریشان نظر آ رہا تھا لیکن اب اس کے تمام ساتھیوں کے سامنے اس کے وقار کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔ بندیا نے جس انداز میں اسے مخاطب کیا تھا اس میں قدرے طنزیہ عنصر بھی شامل تھا۔ غالباً رحمو کی بڑھ بڑھ کر بولنے اور ڈینگیں مارنے کی عادت سے بندیا ناخوش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کھلے عام رحمو کو ایک چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" رحمو نے کرخت لہجے میں کہا۔ "میں تیار ہوں۔" سب ڈاکوؤں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

بندیا بولی۔ "یہ فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ڈاکو سے کہا۔ "سردار کی لاش اٹھا کر احترام سے ایک طرف رکھ دو۔ اس بات کا فیصلہ ہونے کے بعد ہم اپنے سردار کو مٹی کے سپرد کر دیں گے۔"

چند ڈاکو آگے بڑھے۔ انہوں نے سردار کے مردہ جسم کو بہت احتیاط اور احترام کے ساتھ اٹھا کر ایک جانب رکھ دیا۔ اس پر ایک چادر ڈالی دی گئی۔

رحمو چند قدم آگے بڑھ کر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت کے الاؤ سلگ رہے تھے۔

بندیا نے ہم دونوں پر نظر ڈالی پھر کہا۔ "مقابلہ چاقو سے ہوگا یا کلہاڑی سے؟" یہ کہہ کر ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

میں ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو چکا تھا جس پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے بہرصورت مقابلہ کرنا تھا۔

مجھے یکا یک جس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑ گیا تھا اس میں زندگی کے امکانات بہت کم تھے۔ اگر بندیا

بروقت آ کر اس معاملے میں مداخلت نہ کرتی تو شاید میرا جسم اب تک برہم اور غضب ناک ڈاکوؤں کی گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ وقتی طور پر میری جان بچ گئی تھی لیکن مجھے ابھی ایک اور امتحان سے گزرنا تھا۔ اس کے بعد اور کتنی آزمائشیں میری منتظر تھیں میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے زندہ بچ جانے کا امکان صرف ایک فیصد تھا اس لیے میں ہر قیمت پر جان کی بازی لگانے پر مجبور اور آمادہ تھا۔

رحمو نے بندیا کی طرف دیکھا۔ "میں کلہاڑی سے مقابلہ کروں گا۔"

بندیا نے میری جانب دیکھا۔

میں نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے۔"

ظاہر ہے کہ کلہاڑی کا ہتھیار ہو یا چاقو کا۔ مجھے بہرصورت اپنی جان بچانے کے لئے مقابلہ کرنا تھا۔

بندیا کے اشارے پر ایک ڈاکو دو کلہاڑیاں لے آیا۔ ان میں سے ایک مجھے اور دوسری رحمو کو دے دی گئی۔ میں نے کلہاڑی کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد تولا۔ اس کی دھار کو انگلی چھو کر محسوس کیا۔ وہ چاقو کی طرح تیز اور دھاردار تھی۔ یقیناً رحمو کی کلہاڑی بھی ایسی ہی تھی۔

ہم دونوں کلہاڑیاں ہاتھ میں تھام کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ ڈاکوؤں کا مجمع قدرے پیچھے ہٹ چکا تھا تاکہ مقابلے کے لئے زیادہ جگہ میسر آ جائے۔

بندیا البتہ ابھی تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اس نے ہماری لڑائی کے دوران میں بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی حالانکہ کئی بار ہم دونوں کلہاڑیوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہوئے اس کے بالکل نزدیک بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ بہت عجیب نڈر اور انوکھی عورت تھی۔

بندیا کے اشارے پر ہم دونوں حرکت میں آ گئے۔ پہلے چند لمحے ہم کلہاڑیاں تھامے ایک دوسرے کو تولتے اور ایک دائرے میں حرکت کرتے رہے۔ پھر اچانک رحمو بجلی کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں نے اس کا بھرپور وار ایک طرف جھکائی دے کر بے اثر کر دیا۔ میں کسی بھی قسم کے خوف سے قطعی بے نیاز تھا حالانکہ کلہاڑی سے جنگ کرنے کا یہ میری زندگی میں پہلا موقعہ تھا۔

رحمو بہت پھرتیلا اور طاقتور انسان تھا۔ اس نے فوراً ہی مجھ پر دوسرا حملہ کر دیا اور پھر تابڑ توڑ کئی حملے کئے جن میں سے کچھ حملوں کو میں نے کلہاڑی پر روکا۔ کچھ حملوں کو تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ کر خالی جانے دیا۔

رحمو کو غالباً میری جانب سے اتنی طویل مزاحمت کی توقع نہیں تھی اس لیے لمحہ بہ لمحہ اس کے جوش اور غصے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اپنے وار خالی جاتے ہوئے دیکھتے ہوئے تو اس کی جارحیت میں اور اضافہ ہو گیا مگر میں نے اپنے جذبات پر مکمل قابو رکھا، نہ تو میں مشتعل ہوا نہ ہی غصے میں آیا۔ حملہ آور رحمو تھا اس لیے جسمانی مشقت بھی اسی کے حصے میں آئی تھی۔ میں معمولی حرکت کے ذریعہ اس کے وار بچا رہا تھا۔

بندیا اور دوسرے لوگ خاموشی اور دلچسپی سے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے میرا پرسکون چہرہ اور مطمئن انداز ان کے لیے حیران کن تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں چند منٹ بھی رحمو کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا اور شکست یا موت میرا مقدر بن جائے گی لیکن صورت حال ان کی توقعات کے برعکس تھی۔

رحمو جسمانی مشقت اور پیہم حرکت کرنے کی وجہ سے ہانپنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جوش اور غیظ و غضب میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میری بے پروائی اور پرسکون مدافعت کی وجہ سے اس کے جوش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مسلسل حملوں کی تھکن اس کے چہرے پر نظر آنے لگی تھی۔ ابھی تک میں نے اس پر ایک بھی حملہ نہیں کیا تھا۔ محض دفاع

www.pdfbooksfree.pk

کرنے میں مصروف تھا۔

رحمو جھلایا ہوا تھا مگر تھک بھی چکا تھا اس لئے وہ دم لینے کے لیے رک گیا لیکن اس کی خونخوار نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کو ہانپتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر کہا۔ ”رحمو، اتنی جلدی تھک گئے؟ آؤ، اپنا ہرا رمان پورا کرلو۔“ یہ کہہ کر میں نے ہاتھ سے اس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

رحمو انتہائی اشتعال میں آ کر بے اختیار دانت پیستا ہوا میری جانب لپکا۔ کلہاڑی کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اونچا اٹھا رکھا تھا اور ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی مانند میری طرف لپکا آ رہا تھا۔

اس نے کلہاڑی بلند کی اور ایک بھرپور حملہ کیا لیکن زمین کی ناہمواری کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے کلہاڑی کا جو وار مجھ پر کیا تھا وہ بھرپور نہ تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اپنی کلہاڑی پوری طاقت سے اس کی کلہاڑی کے دستے پر ماری۔ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بہت دور جا گری۔ وہ خود بھی لڑکھڑایا۔ جتنی دیر میں وہ سنبھلتا میں اس کے سر پہ جا پہنچا تھا۔ میں نے کراٹے کا ایک داؤ آزمایا اور میری کک پوری قوت سے اس کے سینے پر لگی تو وہ کوشش کے باوجود اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ دوسرے لمحے میں وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا ہوا تھا۔

اس نے پھرتی کے ساتھ پلٹی مار کر زمین سے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی مہلت نہ دی۔ میری ایک بھرپور ٹھوکر اس کے منہ پر لگی اور وہ دوبارہ زمین پر گر گیا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دیا اور اس کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اب وہ ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر نیم جان ہو کر میرے سامنے پڑا ہوا تھا۔

میں نے ایک پیر اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔ اب وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون جاری تھا اور وہ بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مقابلے کے اصول کے مطابق غالب آنے والے کو مغلوب کو ہلاک کر دینا چاہئے تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی کلہاڑی اوپر اٹھائی اور ضرب لگانے سے پہلے اپنے اردگرد کھڑے ہوئے حیران و پریشان ڈاکوؤں پر نظر ڈالی۔ وہ سہمے ہوئے تھے اور تشویشناک انداز میں یہ سب منظر دیکھ رہے تھے۔

میں نے نگاہیں پھیر کر بندیا کو دیکھا جو بدستور اپنی جگہ پر جمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور ستائش کا تاثر تھا۔ رحمو ان کے گروہ کی آن تھا مگر چند لمحوں میں وہ ریت کی دیوار کی طرح گر چکا تھا اور میرے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

میں نے بندیا کو دیکھا۔ میری نظروں میں ایک سوال اٹھا کہ اب اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میں اس گروہ میں تنہا ہوں۔ ان وحشی اور اجڈ لوگوں سے دشمنی مول لے کر زندہ رہنا میرے لئے ممکن نہیں تھا لیکن جن حالات سے دوچار تھا، ان سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل تھا۔ میں احتیاط سے بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

بندیا نے مضبوط آواز میں کہا۔ ”یہ تمہارا شکار ہے۔ ہمارے قانون کے مطابق تم اس کو جان سے مار سکتے ہو۔“

اس کی سنگدلی اور بے رحمی میرے لئے حیران کن تھی۔ رحمو اس کے گروہ کا ایک اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم رکن تھا مگر اس نے بہت بے نیازی سے مجھے اس کو قتل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کی اصول پرستی اور منصفی قابل داد تھی۔

میں نے ایک بار پھر ڈاکوؤں کی جانب دیکھا۔ وہ سب خاموش کھڑے تھے۔ کسی میں بندیا کے حکم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ پھر میں نے اپنے قدموں میں پڑے ہوئے۔ رحمو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ خود اسی کے خون سے لہولہان ہو چکا تھا۔ وہ ایک چاروں طرف سے گھر جانے والے شکار کی طرح مجھے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ممکن ہے رحمو کی جان بخشی کر کے میں ان وحشیوں کی خوشنودی حاصل کرلوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا پیر رحمو کی چھاتی پر سے اٹھالیا اور اپنے ہاتھ کی کلہاڑی کو دور پھینک کر بندیا کی جانب بڑھا۔ وہ حیرت اور بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”میں قاتل نہیں ہوں، نہ ہی بننا چاہتا ہوں۔ سردار کی موت ایک حادثہ تھی۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ مگر میں جانتے بوجھتے ہوئے کسی کی جان نہیں لے سکتا۔“

یہ کہہ کر میں رحمو کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحمو بھی زمین پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تیزی سے چند ڈاکو اس کی جانب بڑھے اور اس کو سہارا دے کر اٹھالیا۔ وہ اس کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ دوسرے ڈاکو بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ صرف دو ڈاکو کھڑے رہ گئے۔

بندیا سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی تھی۔ موقع پا کر میں نے بھی گہری نظروں سے سر سے پیروں تک اسے دیکھا۔ وہ ایک مضبوط، دراز قد لیکن پرکشش عورت تھی جس کے چہرے سے حاکمانہ شان کا اظہار ہو رہا تھا۔

اب اس کے چہرے کی خشونت اور برہمی ختم ہو چکی تھی۔ ان کی جگہ اب اس کے چہرے پر نرمی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

”تم ایک بہادر بندے ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تم جھوٹے نہیں ہو سکتے۔“

”شکریہ۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تم پولیس کے آدمی نہیں ہو؟“ اس نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو پھر اس جنگل میں کیا کر رہے ہو؟“

”میں اپنے دشمنوں سے جان بچا کر بھاگا تھا کہ تمہارے گروہ کے قابو میں آ گیا۔ مجھے سردار کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ کاش انہوں نے میری بات کا یقین کرلیا ہوتا۔“

وہ خاموش کھڑی دانتوں سے اپنے ہونٹ دباتی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”ہمارا سات سال کا ساتھ تھی۔“ وہ بولی تو اس کی آواز میں سوگواری تھی۔ ”مگر اوپر والے کی مرضی، اس سے کون لڑ سکتا ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے سامنے کھڑے ہوئے دونوں ڈاکوؤں کی طرف دیکھا۔

”دیکھو موجو، یہ ہماری پناہ میں ہے۔ اس کے رہنے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ ہمیں ابھی سردار کے کفن دفن کا بھی انتظام کرنا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مڑی اور تیزی سے ایک جانب چلی گئی۔

”آؤ۔“ ایک ڈاکو نے اپنی بندوق سے اشارہ کر کے مجھے مخاطب کیا۔ میں خاموشی سے ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اب میں مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بندیا اپنے قول کی پکی ہے اور اب ڈاکوؤں کے اس گروہ سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

پہاڑیوں کے اندر چوٹیوں اور ٹیلوں سے گھری ہوئی اس پناہ گاہ میں کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ مجھے جس کمرے میں مہمان بنایا گیا وہ بہت مختصر کمرہ تھا۔ ایک چارپائی اور چادر کے سوا وہاں کسی قسم کا فرنیچر یا ضرورت کا سامان نہیں تھا۔ میں نے کمرے کے اندر داخل ہو کر اس کا جائزہ لیا۔ دروازے کے علاوہ ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

''تم یہاں رہو گے۔'' ایک ڈاکو نے قدرے بیزاری سے مجھے مخاطب کیا۔ وہ مجھ سے سخت ناخوش معلوم ہوتا تھا۔ ''بندیا مائی نے تمہیں معاف کر کے مہمان بنالیا ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو جائے تم قیدی مہمان رہو گے۔ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا خصت ہو گیا۔ اس کے بیان کے مطابق میں مہمان قیدی تھا۔ شاید اسی لئے میری کوٹھری کا دروازہ بند کرنے یا مقفل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ ویسے بھی یہاں سے فرار ہونا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا جبکہ یہ سارا علاقہ ڈاکوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ میں بالکل نہتا تھا اور یہاں کے راستوں سے قطعی ناواقف بھی تھا۔ اگر بھاگنے کی کوشش بھی کرتا تو کس برتے پر؟

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ تکئے کی جگہ اپنا بازو استعمال کیا۔ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اس لیے چارپائی پر لیٹتے ہی گہری نیند نے مجھے اپنی پُرشفقت آغوش میں سمیٹ لیا۔

ایک کرخت مردانہ آواز سن کر میں جاگا۔ سامنے ایک ڈاکو کھانے کی تھالی لئے کھڑا تھا اور مجھے بیدار کرنے کے لیے آوازیں دے رہا تھا۔

''اٹھو، کھانا کھالو۔'' یہ کہہ کر اس نے تھالی چارپائی پر رکھ دی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سوتا رہا تھا لیکن شام کے گہرے ہوئے ہوتے سایوں سے اندازہ ہوا کہ رات ہونے والی ہے۔

نیند لینے کے بعد میں تازہ دم ہو گیا تھا۔ ڈاکو تھالی رکھ کر جا چکا تھا اس تھالی میں پانی سے بھرا ہوا جست کا ایک بڑا گلاس، مکئی کی دو موٹی موٹی روٹیاں اور چنے کی دال تھی۔ روٹیوں پر مکھن بھی لگا ہوا تھا۔ غالباً یہ مہمانداری کی انتہا تھی۔ نہ جانے کب سے بھوکا پیاسا تھا۔ مکئی کی روٹیاں اور چنے کی دال میرے لئے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے ایک نئی زندگی دی تھی اور اس جنگل بیابان میں رزق کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔

کچھ دیر تک میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ آنے والا وقت میرے لئے اپنے دامن میں کیا سمیٹ کر لانے والا ہے۔ کرنے کے لیے کوئی کام تھا نہ بات چیت کے لیے کوئی ذی روح۔ مجھ پر ایک بار پھر سستی اور نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ اس وقت نیند ہی میرے لیے سب سے بڑی تفریح اور ضرورت تھی۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور بہت جلد گہری نیند نے مجھے آلیا۔

میری آنکھ کھلی تو سورج چمک رہا تھا۔ رات بھر کی نیند نے میرے اندر ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ مایوسی کے بادل خود بخود چھٹ چکے تھے۔ میں اب ایک پُرامید انسان تھا۔

صبح کے وقت کم از کم منہ ہاتھ دھونا بہت ضروری تھا۔ حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرنے کی حاجت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے کوٹھری نما کمرے سے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک دیسی ٹوائیلٹ موجود تھا۔ پانی کے لیے ہینڈ پمپ تھا۔ غسل خانے کے اندر ایک پرانی بالٹی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً غسل خانے کا دروازہ بند کیا اور کچھ دیر بعد جب میں تازہ پانی سے نہا کر باہر نکلا تو بالکل تازہ دم ہو چکا تھا۔ میرا لباس میلا ہو چکا تھا مگر کوئی دوسرا لباس دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں اسی کو پہننے پر مجبور تھا۔

میں اپنی کوٹھری میں واپس لوٹا تو چارپائی پر ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ اس بار بیسن کی دو روٹیاں اور اچار سے تواضع کی گئی تھی۔ جست کے ایک گلاس میں بدنما سی چائے بھی تھی جس نے اس وقت بہت مزہ دیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے سوا کوئی اور مصروفیت بھی نہیں تھی لیکن مجبوری تھی

نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا مگر میں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا۔

یکایک دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے ایک خونخوار شکل کا ڈاکو کھڑا تھا۔

''چلو، مائی بندیا نے بلایا ہے۔'' اس نے پتھریلی آواز میں کہا میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا۔

بندیا گھنے درختوں سے گھری ہوئی ایک وادی میں میری منتظر تھی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے۔ سردار کی تکفین ہو چکی تھی۔ مجھے ماحول میں ایک کھنچاؤ اور کشیدگی محسوس ہو رہی تھی۔ بندیا کالے لباس میں تھی۔ اس کی پیشانی پر بھی ایک سیاہ رومال بندھا ہوا تھا۔ اس سیاہ لباس اور سوگواری کے عالم میں وہ کہیں زیادہ دلکش اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ گذشتہ روز کے ڈھیلے ڈھالے بے ڈھنگے لباس کی بجائے وہ ایک معقول شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اس لباس میں اس کی نسوانی رعنائیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کے آس پاس چند مسلح ڈاکو باادب کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ لوگ میرے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے چونکہ مجھے دیکھتے ہی بہت خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

''آپ نے مجھے بلایا ہے؟'' میں نے بندیا کو مخاطب کیا۔

اس نے گلابی آنکھوں سے مجھے دیکھا جو کچھ عرصے پہلے رونے کی وجہ سے سرخ ہوں گی۔ ایک نظر اپنے گروہ کے افراد پر ڈالی اور پھر بولی۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور پھر اپنا نام بتا دیا۔

اس نے کہا۔ تم نے ہم سب کو بڑی الجھن میں ڈال دیا۔

''میں نے؟''

''ہاں تم نے۔ دیکھو بابو صاحب۔ ہمیں تمہاری بات اور زبان پر بھروسہ ہے مگر میرے دوسرے ساتھی اندھا بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم کو جانے دیا جائے۔ تم بھی آرام سے رہو اور ہم بھی بے فکر ہو جائیں۔ مگر رحمو کچھ اور کہتا ہے۔''

''رحمو کیا کہتا ہے؟'' میں نے رحمو کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ابھی تک سوجا ہوا اور داغوں سے پُر تھا۔ اس نے اپنے سر پہ پٹی بھی باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت تھی۔

''ہم پرائے لوگوں پر کیسے بھروسہ کر لیں؟ یہ ہم سب کی زندگی کا سودا ہے۔ گر تم نے یہاں سے جا کر مخبری کر دی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ کہیں کے نہیں رہیں گے۔''

''تمہارا خیال درست ہے رحمو۔'' میں نے کہا۔ ''تم خود تنگدل اور شکی مزاج ہو اس لیے دوسروں پر بھی شک کرتے ہو۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں صاف اور کھرا آدمی ہوں۔ زبان کا پکا ہوں۔ جو کہتا ہوں اسے پورا کرتا ہوں کھلی دشمنی اور دوستی کرتا ہوں۔''

رحمو جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے میری طرف بندوق تان لی۔

''تم مجھے نہیں جانتے؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''حیرت کی بات ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے ترس کھا کر زندہ چھوڑ دیا تھا۔''

رحمو کچھ بولنے والا تھا کہ بندیا نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے اسے روک دیا۔

''رحمو۔ تمہیں دوسری زندگی ملی ہے اور تمہارا دوسرا جنم اسی بندے کی مہربانی سے ہوا ہے۔ تم احسان فراموش ہی نہیں بزدل بھی ہو۔ کیا بندوق ہاتھ سے رکھ کر تم اس سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو۔'' رحمو ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا مگر

www.pdfbooksfree.pk

غصے سے اس کا چہرہ مزید مسخ ہو گیا تھا۔

"بندیا مائی۔ ایک غیر اور انجان آدمی کے لیے تم اپنے پرانے آدمی کی بے عزتی کر رہی ہو۔"

بندیا نے غصے سے کہا۔ "رحمو! بندہ اپنی عزت اور بے عزتی خود کراتا ہے۔ تم اپنی عزت کرانے کے قابل ہی نہیں ہو۔"

"مائی۔" رحمو بے اختیار چیخ اٹھا۔

"آواز نیچی رکھو اور آنکھیں بھی۔" بندیا نے غصے سے کہا۔ "تمہارے سردار کے ساتھ ہمارے اصول نہیں مر گئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ میں تمہارے سردار کی نشانی اور اس کی جانشین ہوں۔ آج کے بعد اس طرح مجھ سے بات نہ کرنا ورنہ......"

بندیا کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ رحمو نے چاروں طرف دیکھا مگر سب نے نگاہیں نیچی کر لی تھیں۔

"میں سمجھ گیا مائی۔" اس نے میری طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ جسے میری ضرورت تھی وہ جو میری قدر کرتا تھا اب وہ دنیا میں نہیں ہے۔ اپنے ایک پرانے وفادار کو بھلا دیا اور سردار کے قاتل پر بھروسہ کر لیا۔ ٹھیک ہے۔ یہاں کسی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ پلٹ کر واپس جانے لگا۔ تمام ڈاکو خاموشی سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔

یکا یک۔ بندیا کی آواز گونجی۔ "رک جاؤ رحمو۔"

رحمو کے قدم وہیں رک گئے۔

"ادھر آؤ۔ میرے پاس۔"

رحمو بندیا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو۔ تم ہمارے پرانے ساتھی ہو۔ سردار کو بھی تم پر بہت بھروسہ تھا اور میں بھی تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ تم نے ایک معمولی بات کو اتنا بڑھا لیا ہے۔ دنیا میں انسان کو ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ بات کو جلدی ختم کر دیا جائے۔ سردار نے اگر پردیسی کی بات کو اتنا زیادہ نہ بڑھایا ہوتا تو آج وہ ہمارے ساتھ ہوتے اور ہم سب خوش رہتے۔ بہت زیادہ شک کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں تمہیں اور دوسرے سب ساتھیوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ہمیں پچھلی باتیں بھلا کر نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہے۔ ہوشیار بھی رہنا ہے۔ مگر بلاوجہ کسی جھگڑے میں بھی نہیں پڑنا چاہئے۔ اسی طرح ہم خوش رہ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین ہے تو رک جاؤ۔ ہمارے ساتھ رہو۔ ہم سب پہلے کی طرح مل جل کر رہیں گے۔ اگر اپنے دل کی مرضی کرنی ہے تو پھر وہی کرو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی۔"

رحمو نے ایک لمحہ سوچا پھر نظریں جھکا کر بولا۔ "آپ ٹھیک کہتی ہو مائی۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آگے جیسا کہو گی وہی ہو گا۔"

بندیا کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تو پھر پردیسی بابو سے ہاتھ ملاؤ اور دل صاف کر لو۔"

رحمو نے جھجکتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے گرمجوشی سے تھام لیا۔

تمام ڈاکوؤں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ظاہر ہے کہ صورتِ حال جو رخ اختیار کرتی جا رہی تھی اس کی وجہ سے وہ سب بھی پریشان تھے۔

اچانک میرے کانوں میں ایک ہلکی مانوس آواز سنائی دینے لگی۔ میں اس آواز سے بخوبی واقف تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی جو کہ میری تلاش میں تھا۔

میں نے کہا۔ "لو وہ پھر آ گیا۔"

"کون آ گیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیلی کاپٹر۔ یہی لوگ میرے دشمن ہیں اور مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ ان ہی سے چھپ کر اور جان بچا کر میں اس جنگل میں آ گیا تھا مگر سردار مجھے مخبر ہی کہتا رہا۔"

ہیلی کاپٹر کی آواز اب قریب آ گئی تھی اور صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "آڑ میں چھپ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ ہمیں دیکھ لیں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک چھلانگ لگائی اور گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ میں پناہ گزیں ہو گیا۔

بندیا اور دوسرے ڈاکوؤں کو بھی موقعے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب بھی مناسب پناہ گاہوں میں چھپ گئے تاکہ ہیلی کاپٹر والے ہمیں نہ دیکھ سکیں۔

ہیلی کاپٹر اب نزدیک آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے سروں پر پہنچ گیا مگر اتنی بلندی سے وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ہیلی کاپٹر کچھ دیر فضا میں چکر کھاتا رہا پھر ایک طرف کو چلا گیا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہم سب اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر باہر آ گئے۔

میں نے کہا۔ "میرا یہاں رہنا تم سب کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میری تلاش میں یہ لوگ آس پاس منڈلاتے رہیں گے۔ اگر میری بات کا یقین آ گیا ہو تو بہتر ہے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ یہ میرے لئے بھی بہتر ہے اور تم لوگوں کے لئے بھی۔"

بندیا خاموش سوچ میں گم تھی۔ سب ڈاکوؤں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بندیا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہارا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔"

میں نے خوش ہو کر اس کو دیکھا۔ "تو کیا میں یہاں سے جا سکتا ہوں؟"

"نہیں۔"

میں نے حیران ہو کر بندیا کو دیکھا۔ "تم جا سکتے ہو۔ مگر اکیلے نہیں۔ تم اس جنگل اور پہاڑوں میں بھٹکتے رہ جاؤ گے۔" پھر وہ رحمو سے مخاطب ہوئی۔ "رحمو۔ تم پردیسی بابو کو اس کی راہ پر ڈال کر آؤ گے۔"

رحمو نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

کچھ دیر بعد میں جانے کے لیے تیار تھا۔ میرے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ بندیا نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو۔ میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ ایسا نہ ہو مجھے پچھتانا پڑے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے۔"

یہ کہہ کر میں رخصت ہو گیا۔ رحمو میرے ساتھ تھا۔ ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرتے رہے۔ کافی طویل راستہ تھا مگر ہم دونوں بالکل خاموش تھے۔ نہ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ نہ میں نے اس سے بات کی۔

کئی گھنٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے ایک پتلی مگر پختہ سڑک نظر آ رہی تھی۔

رحمو نے کہا۔ "اس سڑک پر تمہیں کوئی سواری مل جائے گی۔ رب راکھا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پلٹ کر چلا گیا۔ بندوق اس کے کاندھوں پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر میری

www.pdfbooksfree.pk

طرف نہیں دیکھا۔

بندیا نے سفرخرچ کے لیے ازراہ کرم مجھے کچھ رقم بھی دے دی تھی۔ میں نے چھوٹا سا بیگ سنبھالا اور سڑک کی طرف چل پڑا، لیکن میں پوری طرح محتاط تھا۔ میں نے سڑک پر کھڑے رہنے کی بجائے درختوں اور ٹیلوں کی آڑ میں چھپ کر انتظار کرنا مناسب سمجھا تھا۔

کافی دیر گزر گئی مگر کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ آخر میں نے ایک گاڑی کی آواز سنی۔ یہ کوئی بھاری گاڑی تھی۔ آواز قریب آئی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کسی بس یا ٹرک کی آواز ہے، پھر ٹرک بھی سامنے نمودار ہو گیا۔ وہ درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے تقدیر آزمانے کا فیصلہ کیا اور جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ ٹرک تیز رفتاری سے نہیں آ رہا تھا، مگر پھر بھی احتیاطاً میں سڑک کے وسط میں جا کر کھڑا ہو گیا اور ٹرک کو روکنے کے لئے اشارے کرنے لگا۔

ٹرک کی رفتار کم ہو گئی اور پھر وہ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر رک گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ ٹرک میں ایک ڈرائیور کے سوا کوئی نہ تھا۔ ٹرک ڈرائیور مضبوط جسم کا مضبوط اور طاقتور آدمی تھا اور مجھے سوالیہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک چلا گیا۔ وہ کلین شیو تھا مگر بڑی بڑی مونچھیں اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہی تھیں۔

"مجھے کسی قریبی قصبے یا شہر تک لفٹ مل سکتی ہے؟"

"کون ہو تم۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟ یہاں ویران جنگل میں کیا کر رہے ہو؟" اس نے تابڑ توڑ کئی سوالات کر دیئے۔

"میں مختلف لوگوں سے لفٹ لیتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ بالکل بے ضرر آدمی ہوں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ لو دیکھ لو۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اونچے اٹھا دیئے۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو مصیبت زدہ لگتے ہو۔ آؤ۔ ٹرک میں بیٹھ جاؤ۔"

میں نے خوش ہو کر ٹرک کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر داخل ہو گیا۔ ہر طرف تمباکو کی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ایک سستا سا سگریٹ اس کے منہ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے قریب سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس کچھ رقم بھی ہے۔ کہو گے تو تمہیں ادا کر دوں گا۔"

وہ پھر ہنسنے لگا۔ "بابو جی۔ یہ بس نہیں ٹرک ہے اور اس وقت میں اس کا مالک ہوں۔ قیمت اپنے پاس رکھو۔ بس مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

ٹرک ڈرائیور کافی باتونی اور دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح بلا رکے چلتی رہی۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہا تھا جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تھکا ہوا تھا۔ ٹرک کے ہچکولوں نے لوری اور پنگوڑے کا کام کیا اور میری آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا۔ یکا یک ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑا۔ شاید اس سے پہلے بھی وہ مجھے آوازیں دیتا رہا تھا۔

"لو جی۔ دینہ آ گیا۔ اب مجھے رات تک ادھر ہی ٹھہرنا ہے۔ تم اپنی کہو کیا صلاح ہے؟"

"بہت مہربانی بڑے بھائی۔ میں تمہارا احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ بس اب میں چلوں گا۔ رب راکھا۔"

اس نے بڑے خلوص سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں ٹرک سے اترا اور بس سٹینڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں ٹیکسیاں بھی کھڑی ہوئی تھیں۔

دو دن بعد میں اپنے شہر میں تھا۔

سیدھا شوکت کے پاس واپس پہنچا۔ دروازے پر دستک دیئے بغیر میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ پھر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے گلے لگا لیا۔

"تم ایک دم کہاں سے آ گئے۔ اتنی دیر تک کہاں رہے؟ خبر کیوں نہیں دی؟"

میں ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "شکر کرو کہ آ گیا ہوں۔ کئی بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بال بال بچا ہوں۔"

اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا۔ "حلیے سے تو ایسے ہی لگتے ہو جیسے دوسرے جہاں سے آئے ہو۔ اپنی حالت تو دیکھو۔ بڑھی ہوئی شیو بے ترتیب بال۔ انتہائی خستہ اور میلا لباس۔"

"بس یار۔ میں فوراً نہا کر اور کھانا کھا کر سونا چاہتا ہوں اور دیکھو جب تک میں خود نہ اٹھوں مجھے ہرگز نہ جگانا۔"

"فکر نہ کرو۔" شوکت ہنسنے لگا۔ "دوسری دنیا سے آئے ہو۔ ابھی تو جیٹ لیگ سے بھی گزرنا پڑے گا۔ تمہیں کوئی نہیں جگائے گا۔ چلو، گھر چلتے ہیں۔" وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فون پر سیکرٹری کو کچھ ہدایات دیں اور بریف کیس سنبھال کر میرے ساتھ چل پڑا۔

گھر وہی تھا۔ ہر چیز وہی تھی۔ میں بھی وہی تھا اور شوکت علی بھی وہی پھر بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا ہے۔

مجھے غسل خانے میں دھکیل کر شوکت نے باورچی کو کھانے کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ کافی عرصے بعد غسل خانے میں شاور کا گرم و سرد پانی نصیب ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔

باہر سے شوکت نے پکارا۔ "یار اب باہر نکل آؤ۔ کیا نہاتے نہاتے ہی خرچ ہو جاؤ گے۔"

اپنا باتھ روم، اپنا بیڈ روم اور اپنا کمرہ، یہ سب چیزیں گزشتہ دنوں کے واقعات کے بعد بہت بڑی نعمت لگ رہی تھیں۔

کھانا بہت اشتہا انگیز تھا۔ بھوک بھی بہت زور کی لگ رہی تھی۔ میں فاقہ زدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ جب کافی کی پیالی سامنے آئی تو میں ایک نارمل انسان بن چکا تھا۔ اب غم اور غمِ جاناں دونوں کا مجھے احساس تھا۔

میں نے شوکت سے بے تابی سے پوچھا۔ "عاشی کے خط تو آتے ہوں گے؟ میں اس کے سارے خطوط ایک ساتھ پڑھنا چاہتا ہوں۔"

شوکت علی نے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"کیا بات ہے شوکت؟ خیریت تو ہے؟" میں نے بیتابی سے پوچھا۔

"ہاں۔ خیریت ہی سمجھ لو۔"

"سمجھ لو کیا مطلب؟"

"انگریز کہتے ہیں کہ نو نیوز از گڈ نیوز۔ عاشی کی طرف سے کوئی خط یا پیغام نہیں ملا۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ بہت خطوط لکھے۔ ٹیلی گرام بھی دیئے مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ خطوں اور ٹیلی گرام کا جواب کیوں نہیں دیتی۔ جب کوئی خیر خبر نہیں ملی تو میں خود اس کی تلاش میں انڈیا چلا گیا مگر وہ لوگ اپنا گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کس حال میں ہیں۔"

میں یہ واضح کر دوں کہ اگر عاشی میری پہلی اور آخری محبت تھی تو شوکت دنیا میں میرا بہترین اور قابل اعتماد دوست تھا۔ میرے ہر غم اور ہر خوشی میں شریک تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری خاطر وہ اپنی جان کی بازی بھی لگا دے گا۔ اس کا

www.pdfbooksfree.pk

ثبوت اس نے عملی طور پر فراہم کر دیا تھا۔ اس کو بخوبی احساس تھا کہ میں عاشی کو دیوانہ وار چاہتا ہوں۔ جنون کی حد تک اس سے محبت کرتا ہوں۔ جب عاشی کے خطوط کی آمد بند ہوگئی تو شوکت میری حالت زار دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے زندگی کے کسی مشغلے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میں ایک پژمردہ اور مایوس انسان تھا جس کے لیے دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔

شوکت نے میرے دکھ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر عاشی سے رابطہ کرنے اور اسے تلاش کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کو ڈھونڈنے کے لیے بذات خود جعلی پاسپورٹ حاصل کر کے بھارت چلا گیا تھا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا جس کی وجہ سے آسانی سے بھارت کا ویزا حاصل نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے میری خاطر جعل سازی سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ پھر یہ خوف بھی تھا کہ اگر وہ بھارت میں پکڑا گیا تو اس کا بہت برا حشر ہوگا، لیکن اس نے میرے پیار اور دوستی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ ایسے مخلص اور محبت کے پروانے دوست کسی خوش قسمت کو ہی ملتے ہیں اور مجھے احساس تھا کہ میں اس معاملے میں واقعی خوش نصیب انسان ہوں۔

شوکت بھارت سے بے نیل ومرام واپس لوٹ آیا تھا جس کی وجہ سے میری بے تابی، مایوسی اور غم والم میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ عجیب عجیب وسوسے مجھے تنگ کرتے رہتے تھے۔ آیا عاشی زندہ بھی ہے یا اس دنیا میں نہیں رہی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس نے مجھ سے رابطہ کیوں قطع کر دیا ہے۔ کیا اس نے میری محبت کو بھلا کر کسی اور کے پیار میں پناہ لے لی ہے؟ یہ تصور ہی میرے لئے انتہائی تکلیف دہ اور سوہانِ روح تھا۔

میں دنیا سے قطعی بے تعلق اور کنارہ کش ہو چکا تھا۔ میرا بیشتر وقت خاموشی سے خلا میں گھورنے میں صرف ہوتا تھا۔ راتوں کی نیند میری آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ دن کا چین میرے نصیب میں نہیں رہا تھا۔ نہانے، لباس تبدیل کرنے اور کھانے پینے کا مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔ میں ہر چیز سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ دنیا میرے لئے ایک بے معنی شے اور زندگی ایک بے مقصد تضیع اوقات بن کر رہ گئی تھی۔ میری شیو عام طور پر بڑھی رہتی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

شوکت کے لیے میری یہ حالت انتہائی پریشان کن تھی۔ میں اس کے جذبات سے بخوبی واقف تھا لیکن مجھے خود اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی پریشانی اور تفکر کو دور کرنے میں ناکام تھا۔

جب حالات انتہائی بدترین شکل اختیار کر گئے تو شوکت نے میری توجہ عاشی کی جانب سے ہٹانے اور دوسری دلچسپیوں میں شامل ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

ایک روز اس کے پُر زور اصرار پر میں شیو بنا کر اور نہا دھو کر اس کے ساتھ باہر جانے کے لیے رضا مند ہو گیا۔ اس نے میرے لئے بہترین لباس کا انتخاب کیا تھا اور بے حد اصرار کے بعد مجھے وہ لباس پہننے پر مجبور بھی کر دیا تھا۔

ہم ایک بارونق اور مشہور کلب میں چلے گئے جہاں ہر طرف رنگ ونور اور حسن وشباب کی فراوانی تھی۔ حسین طرحدار حسینائیں بھی تھیں اور رومانی، خوابناک ماحول بھی موجود تھا مگر میرے لئے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

شوکت نے کھانے کا آرڈر دیا۔ وہ میری پسند کے بارے میں پوچھ رہا تھا مگر میں نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا۔

کھانا آنے میں ابھی کچھ وقت تھا اس لئے ہم ٹھنڈا مشروب منگوا کر اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

یکا یک ایک ریشمی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

پلٹ کر دیکھا تو ایک دلکش اور پُرکشش لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اسے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر اس بے تکلفی کا اظہار کیا معنی؟ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دراصل شوکت سے مخاطب تھی۔ شوکت اس کو دیکھتے ہی کرسی

سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''آؤ روزی۔ بہت عرصے بعد نظر آئی ہو؟'' شوکت نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں۔ میں ملک سے باہر گئی ہوئی تھی۔ کچھ بزنس اور کچھ سیر وسیاحت، کافی اچھا وقت گزر گیا۔''

اس اثنا میں میری نگاہیں اس لڑکی کا جائزہ لے رہی تھیں جسے شوکت نے روزی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ ایک دراز قد، متناسب جسم اور انتہائی حسین نقش رکھنے والی گوری رنگت کی لڑکی تھی۔ اس کے ترشے ہوئے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک خوبصورت جدید لباس میں ملبوس تھی۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ درحقیقت ایک پُرکشش اور خوبصورت لڑکی تھی۔

''یوسف ان سے ملو۔'' شوکت نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ مس روزی ہیں۔ بہت بڑے اور دولت مند خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ صورت شکل تم دیکھ ہی رہے ہو مگر یہ سوچ کی بھی بہت اچھی ہیں۔ میری پرانی واقف کار ہیں بلکہ دوست کہہ سکتے ہو۔'' پھر وہ روزی سے مخاطب ہوا۔ ''کہو روزی میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ دلنوازی سے مسکرائی اور سر کو جھٹکا دیا۔ اس کی سنہری زلفیں اس کے چہرے کے گرد لہرا کر رہ گئیں۔

''روزی۔ ان سے ملو یہ میرے بہترین دوست بلکہ بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ مسٹر یوسف۔''

روزی نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کا نرم وگرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما تو ایک برقی رو میرے جسم میں دوڑ گئی۔

''آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی۔'' اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''شوکت پہلے بھی آپ کے بارے میں باتیں کرتے رہے ہیں اور آپ کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو محبت ہے ان کی۔''

''مگر انہوں نے صحیح بندے سے محبت کی ہے۔'' روزی شرارت سے مسکرائی۔

''روزی! اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو ہمارے ساتھ کھانا کھا سکتی ہو؟''

''بڑی خوشی سے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ''اگر مصروفیت ہوتی بھی تو ایسی خوبصورت کمپنی کی خاطر اسے ملتوی کر دیتی۔''

اس کی شربتی نگاہیں مسکرا رہی تھیں میں ان خاموش مسکراتی ہوئی آنکھوں کا پیغام بخوبی سمجھ گیا تھا۔

روزی واقعی ایک دلچسپ ودلکش اور ذہین لڑکی تھی۔ جتنی دیر بھی ہم ساتھ رہے وہ مختلف موضوعات کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔ زندگی کی ہر حسین چیز میں اسے دلچسپی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گذارنے کی قائل تھی۔

''دیکھئے نا مسٹر یوسف۔ زندگی تو صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ پھر اسے جی بھر کر کیوں نہ انجوائے کیا جائے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر بعض لوگ اسی زندگی کو کسی ایک کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔''

''دنیا بہت بڑی اور رنگین جگہ ہے۔ اس کو ایک یا چند چیزوں تک محدود نہیں رکھنا چاہئے۔'' وہ شوخی سے مسکرائی۔

میں نے کوئی جوب دینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

وہ دن ہم نے ایک ساتھ ہی گزارا اور مجھے احساس ہوا کہ روزی ایک زندہ دل اور خوش باش لڑکی ہے۔ وہ زندگی

www.pdfbooksfree.pk

کے ہر لمحے سے لطف اٹھانے کی قائل تھی۔

ہم رخصت ہوئے تو روزی کی شخصیت مجھے کافی حد تک متاثر کر چکی تھی۔

شوکت کے ذریعے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی روزی کے ساتھ وقت گزارنے لگا، لیکن اس میں جذبات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ شوکت نے بھی باتوں باتوں میں اسے عاشی کے ساتھ میری دیوانہ وار محبت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میرا سرد مہری کا رویہ بھی دیکھ چکی تھی یہاں تک کہ ایک بار ہم نے ''محبت'' کے موضوع پر کافی تفصیل سے گفتگو کی تو میں نے اس کو عاشی سے اپنی دیوانگی کی حد تک محبت کے بارے میں بتا دیا۔

''دنیا ایک انسان تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کسی ایک کے نام پر گزاری جا سکتی ہے۔ آپ کے پیار کی شدت کا مجھے احساس ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایسے شخص کو دیکھ لیا جن کے بارے میں اب تک کہانیاں ہی پڑھتی آئی ہوں۔''

دو دن بعد شوکت نے بہت سنجیدگی سے مجھے بتایا کہ روزی مجھ سے شادی کی خواہش مند ہے۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا ''مگر شوکت......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''وہ تمہارے اور عاشی کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اور تمہارے جذبات اور وفا پرستی کی معترف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں اپنا شریک حیات بنانا چاہتی ہے۔''

میں نے اس بارے میں اگلے دن روزی سے کھل کر بات کی۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ شوکت میری بے کیف زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے یہ سب جتن کر رہا تھا۔ مجھے اس کے خلوص اور دوستی کا پاس تھا، لیکن عاشی کو بھلانا میرے بس میں نہ تھا۔

روزی نے کہا۔ ''یوسف۔ مجھے فخر ہے کہ تم جیسا وفادار سچا اور مخلص انسان میری زندگی میں آیا ہے۔ مجھے تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں صرف تمہاری زندگی کا ایک مختصر سا حصہ مانگ رہی ہوں۔ اگر اس کے بعد بھی تم عاشی کو بھلانے میں کامیاب نہ ہوئے تو بھی مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

شوکت کا بھی یہی اصرار تھا کہ میں اپنی زندگی سایوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے ضائع نہ کروں۔ میں نے بہت پس و پیش کی۔ عذر پیش کیے مگر بالآخر ایک دوست کے اصرار اور روزی کے پیار کی انتہا کے آگے ہار ماننے پر مجبور ہو گیا۔

ایک دن روزی میری شریک حیات بن گئی۔ اس نے اپنا تمام کاروبار اور دولت میرے قدموں میں ڈال دی مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ شوکت ہمارے کاروبار کو وسعت دینے کے لیے روزی کو بزنس پارٹنر بنانے کے حق میں تھا۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے خاموش رہا۔

روزی ایک ایسی عورت تھی جسے پا کر انسان کو کسی اور چیز کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اس کی وفا، اس کی خدمت، اس کا بے پناہ پیار۔ اس کے ناز و ادا کسی بھی شخص کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان بنانے کو کافی تھے۔ مگر میرے سر سے عاشی کی محبت کا بھوت نہ اتر سکا۔

روزی ایک بے مثال محبوبہ اور لاجواب بیوی تھی لیکن عاشی کے ساتھ یہ معاملہ تھا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

یہ روزی کی عظمت تھی کہ وہ عاشی کی یادوں کی سوکن کے ساتھ بھی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کو تیار تھی۔ اس نے مجھے زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے ہر ممکن جتن کیا اور میں کافی حد تک آدم بیزاری اور دنیا سے بیگانگی کے تاثر سے باہر نکل آیا، لیکن عاشی کی محبت کو اپنے دل سے کھرچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

روزی کو اس پر کوئی شکوہ تھا نہ پچھتاوا۔ کبھی کبھی تو میں خود اپنی جگہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا لیکن میری حالت ایک بے بس معمول جیسی تھی جسے اپنے اوپر اپنے دل پر مطلق اختیار نہیں ہوتا۔

اس دوران میں شوکت نے بزنس کو اور بھی زیادہ وسعت دے دی تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے مجھے بھی کاروباری مصروفیات میں شامل کر لیا تھا۔

ایک روز ایک اہم کاروباری بات چیت کے مسئلے میں شوکت نے مجھے بتایا کہ وہ ضروری مصروفیات کے باعث شہر چھوڑنے سے معذور ہے اس لیے میں فی الحال دوسری پارٹی سے معاہدے کے سلسلے میں بروقت شیخ برکت سے مذاکرات شروع کرنے کے لیے پہنچ جاؤں وہ پہلی فرصت میں ہوٹل امپیریل پہنچ جائے گا۔ شیخ برکت کے ساتھ ایک بہت بڑے منصوبے کے سلسلے میں کچھ عرصے سے ہماری بات چیت چل رہی تھی جس میں شوکت حسب معمول پیش پیش تھا۔ سارا کاروبار عملی طور پر شوکت ہی نے سنبھال رکھا تھا اس لیے میں بے فکر اور بے تعلق تھا۔

شوکت نے میری بکنگ کرانے کے بعد ٹکٹ بھی میرے حوالے کر دیا تھا۔ اسے فوری طور پر اسلام آباد جانا تھا جہاں سے وہ میرے پاس پہنچنے والا تھا۔ وہ میری روانگی سے ایک دن پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ امپیریل ہوٹل میں میرے اور اس کے کمروں کی بکنگ ہو چکی ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ جلد فارغ ہو کر مجھ سے پہلے ہی امپیریل ہوٹل پہنچ جائے۔

اگلی صبح میں جب ائرپورٹ پہنچا تو روزی حسب معمول مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے میرے ہمراہ تھی۔

اس نے کہا۔ ''دیکھئے بلاوجہ دیر نہ لگائیے گا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی چلے آئیے گا۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی شربتی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

''پاگل مت بنو۔'' میں نے اس کا گال تھپک کر کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں کسی اور جگہ بلاضرورت ایک لمحے بھی نہیں رہ سکتا۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔''

وہ بہت دیر تک کھڑی ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کرتی رہی۔

ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی میں نے معاہدے کی دستاویزات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ ایک بہت جامع اور فائدہ مند منصوبہ تھا۔ شوکت کی خواہش تھی کہ یہ جلد سے جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

ہوٹل امپیریل

ایک شاندار اور آرام دہ ہوٹل تھا جہاں زیادہ تر غیر ملکی اور مقامی دولت مند لوگ ہی قیام پذیر ہوا کرتے تھے۔ عملے میں لڑکیوں کی خاصی تعداد تھی جو خاصی خوش شکل اور خوش اطوار تھیں۔ میں نے ریسپشن پر کھڑی لڑکی سے شوکت کے بارے میں گفتگو کرنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے اس سے میں شوکت علی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔ شوکت نے واضح طور پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں میرے لیے بھی کمرہ بک کرا دے گا اور خود بھی ہر صورت یہاں پہنچ جائے گا۔ شوکت کا مجھ سے پہلے پہنچنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے ایک مقامی کمپنی کے ساتھ کافی عرصے سے مذاکرات چل رہے تھے اور کچھ دن قبل ہی ہم نے اس معاہدہ کرنے کے سلسلے میں ضروری معاملات طے کیے تھے۔ یہ ایک منافع بخش معاہدہ تھا جس کے ذریعے ہم آئندہ ہر ماہ میں کم از کم بارہ لاکھ روپیہ منافع حاصل کر سکتے تھے۔ اس لیے بھی شوکت کا نہ پہنچنا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

میں ریسپشن میں موجود دراز قد اور سمارٹ لڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ مسکراتے ہوئے میرے نزدیک آئی۔

''دیکھئے۔ میرے ایک دوست شوکت علی کو یہاں پہنچ کر میرے لیے بھی کمرہ بک کرانا تھا، لیکن آپ کی دوسری ساتھی نے

www.pdfbooksfree.pk

مجھے بتایا ہے کہ شوکت علی نام کے کوئی مہمان اس ہوٹل میں مقیم نہیں ہیں اور نہ ہی محمد یوسف کے نام پر کسی کمرے کی بکنگ کرائی گئی ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر مزید تصدیق کر لیں۔ ہو سکتا ہے شوکت نے میرے نام سے دونوں کمروں کی بکنگ کرائی ہو۔ اگر زحمت نہ ہو تو میری مدد کر دیجیے۔"

وہ مسکرائی۔ "سر۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ چند منٹ انتظار فرمائیں۔ میں آپ کو تمام معلومات حاصل کر کے بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے گوشے کی طرف چلی گئی۔ اس نے مہمانوں کی بکنگ کے تمام کاغذات چیک کیے، اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ ایک دو ٹیلی فون کیے اور پھر چند لمحے بعد میرے نزدیک آئی تو بدستور مسکرا رہی تھی۔ استقبالیہ کے عملے کو غالباً ہر صورت میں مسکرانے کی ہدایت ہے کیونکہ چاہے کتنی ہی خراب خبر وہ آپ کو کیوں نہ سنائیں اُن کے چہرے کی مسکراہٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

"سوری سر۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "میں نے پوری طرح چیک کر لیا ہے۔ ہمارے ہوٹل میں اس نام کے کوئی مہمان نہیں ٹھہرے اور نہ ہی انہوں نے اپنے یا آپ کے نام سے کوئی کمرہ بک کرایا ہے، لیکن اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کے لیے کمرہ بک کرا دوں؟"

ظاہر ہے کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ایک تو مجھے رات بہر صورت یہاں گزارنا تھی۔ دوسرے میں شوکت کا انتظار بھی کرنا چاہتا تھا۔ ممکن ہے وہ بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر وقتِ مقررہ پر نہ پہنچ سکا ہو اور کسی قدر تاخیر سے آئے۔ چنانچہ میں نے نہ صرف اپنے لیے کمرہ حاصل کر لیا بلکہ احتیاطاً ساتھ والا کمرہ بھی شوکت کے نام پر ریزرو کروا لیا۔ اُن دنوں ہوٹل میں مہمانوں کا بہت زیادہ رش تھا اور میں یہ چانس نہیں لینا چاہتا تھا کہ شوکت آئے تو اسے ہوٹل میں کوئی اچھا کمرہ نہ ملے۔ لڑکی نے پانچ سو سترہ نمبر کی چابی لوڈر کے حوالے کی اور اُسے ہدایت کی کہ مجھے سامان سمیت کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ پانچ سو اٹھارہ نمبر شوکت کے لیے مخصوص تھا جس کی چابی میں نے استقبالیہ میں ہی چھوڑ دی تھی۔

کمرہ نمبر پانچ سو سترہ خاصا شاندار اور آرام دہ تھا۔ اگرچہ ہوٹلوں میں قیام عارضی ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا کمرہ حاصل کیا جائے اور اس سلسلے میں ذرا بھی بخل سے کام نہ لیا جائے۔ کاروبار کے سلسلے میں آئے دن مجھے اور اکثر میرے ساتھ شوکت کو بھی سفر کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی تھی، لیکن میری ہمیشہ یہی کوشش اور خواہش ہوتی تھی کہ اگر محض ایک رات کے لیے بھی کمرہ حاصل کیا جائے تو وہ تمام تر آسائشوں سے آراستہ ہو۔ ہوٹل اور گھر میں یہی تو فرق ہے کہ گھر سے آپ مانوس ہو جاتے ہیں اور اگر آپ کی پسند کے خلاف کچھ چیزیں ہوتی بھی ہیں تو اُن کے ساتھ گزارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہوٹل میں اس قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔ ہوٹل میں اگر آسائش اور بہترین سروس نہ ہو تو پھر گھر اور ہوٹل میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ مسکراتے ہوئے چہرے، مستعد عملہ، حکم بجا لانے والے ویٹر اور دوسرے لوگ باادب باملاحظہ قسم کا چوکیدار اور پھر رنگ و روشنی کی بہتات۔ اِن تمام چیزوں ہی کے لیے تو لوگ محض ایک دن کے قیام کے لیے ہوٹلوں میں اتنا خرچ کر دیتے ہیں جو گھر میں اُن کے نصف مہینے کا خرچہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ لوڈر ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میرا سامان ایک طرف رکھنے اور کھڑکیوں کے پردے ہٹا دینے کے بعد اُس نے چابی میز پر رکھ دی اور مؤدب لہجے میں پوچھا۔ "کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے سر؟"

میں نے ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور وہ شکریہ ادا کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا شام کے چار بج رہے تھے۔ میں شیخ برکت سے فون پر رابطہ قائم کر سکتا تھا مگر شوکت کے بغیر معاہدے پر دستخط نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے میں نے شیخ برکت کو فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں نے ٹیلی فون اٹھایا اور اپنے گھر کا نمبر ملانے کی درخواست کی۔ نمبر فوراً ہی مل گیا۔ چند بار گھنٹی بجی اور پھر روزی کی سُریلی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

"ہیلو روزی۔" میں نے کہا۔

"ہیلو۔" روزی کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ یوں لگا جیسے میرا ٹیلی فون سن کر کچھ حیران رہ گئی ہے۔ شاید وہ اس وقت میرے فون کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ "کیسے ہیں آپ؟" اُس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ یہ بتاؤ کہ شوکت یہاں کیوں نہیں پہنچا۔ تمہیں کوئی پیغام تو نہیں دیا اُس نے۔"

"بالکل نہیں۔" وہ ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ "کیوں۔ کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا۔ نہ وہ ہوٹل میں ہے اور نہ اس کا کوئی پیغام یا پتہ ہے۔ میرے لیے کمرہ بھی بک نہیں کرایا اُس نے۔ اب میں پریشان بیٹھا ہوں کہ کیا کروں؟ گھر فون کر کے معلوم کر لوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ "نسیم ابھی میرے پاس سے گئی ہے۔ سارے دن میرے ساتھ رہی اگر شوکت یہاں ہوتے تو اسے خبر نہ ہوتی؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تو پھر وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں راستے میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ وہ کار ہی سے آرہا تھا نا؟"

وہ بولی۔ "یہ تو میں نے نسیم سے نہیں پوچھا۔ اگر انہوں نے آپ کو کار سے پہنچنے کا بتایا تھا تو کار ہی سے گئے ہوں گے۔"

"بھئی میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں چلا گیا۔ یا راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"ان کا انتظار کیجئے۔ ویسے آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟" اس نے کہا۔

"وہیں۔ میرا مطلب ہے امپیریل ہوٹل میں۔ پانچ سو سترہ نمبر کا کمرہ ہے میرا۔ اس کے لیے بھی ایک کمرہ ریزرو کرا لیا ہے میں نے۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ اگر مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔ ویسے آپ واپس کب آرہے ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب تک شوکت نہیں آئے گا میں شیخ برکت سے معاہدہ سائن نہیں کر سکتا — معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ہم دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اب کل صبح میں شیخ برکت سے بات کروں گا اچھا روزی. خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" اس نے جواب میں کہا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے فون بند کر دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ آخر شوکت کو ہو کیا گیا؟ اس سے پہلے کبھی شوکت نے ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ وقت اور اپائنٹمنٹ کا وہ بہت پابند تھا بلکہ مجھے بھی تاکید کرتا رہتا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی احساس تھا کہ شیخ برکت کو ایک دو روز کے اندر ملک سے باہر چلا جانا تھا۔ اگر ہم نے مقررہ وقت کے اندر معاہدے پر دستخط نہ کیے تو پھر یہ معاہدہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ بہرحال۔ اب اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟

میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور کمرے میں بور ہونے کی بجائے ہوٹل کی لابی میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وقت گزاری کے لیے فی الحال کوئی اور پروگرام میرے پیشِ نظر نہیں تھا۔

ہوٹل کی لابی میں خوب چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ زیادہ تعداد غیر ملکی مردوں اور عورتوں کی تھی۔ یہ غیر ملکی عموماً بچوں کے بغیر سیر و تفریح کو نکلتے ہیں۔ اس وقت بھی لابی میں مجھے ایک بھی بچہ نظر نہیں آرہا تھا۔ نوجوان جوڑے البتہ کافی تعداد میں تھے یا پھر بڑی عمر کے بوڑھے تھے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں مصروف تھی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انہیں دنیا میں کسی قسم کی فکر نہیں ہے۔ میں ایک گوشے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور کافی کا آرڈر دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

کوشش کے باوجود میں شوکت کی غیر حاضری کے مسئلے کو فراموش نہیں کر سکا تھا۔ نہ جانے کیوں میں ایک اَن جانے خوف اور وسوسے کا شکار ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ شوکت کاروباری معاملات میں بہت ہوشیار بلکہ کسی حد تک لالچی تھا۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شوکت تاخیر سے پہنچ کر بلا وجہ بارہ لاکھ روپے کے منافع سے ہاتھ دھونا پسند کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اس منافع سے محروم ہونا گوارا نہیں کرے گا اور ہر صورت میں معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے بروقت پہنچ جائے گا۔ معاہدے پر سائن کرنے کے لیے دراصل آج کا دن متعین تھا لیکن کوئی فلائیٹ ایسی نہیں تھی جو مجھے دفتری اوقات میں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی اسی لیے شوکت نے کار کے ذریعہ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر شیخ برکت سے بات کرے گا اور پھر ہم دونوں اگلے روز معاہدے پر دستخط کر کے اسے قانونی شکل دے دیں گے۔

یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور میری نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک غیر مُلکی پر پڑی جو بغور میری طرف دیکھ رہا تھا، لیکن جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں چُرا لیں۔ ایک اخبار اُس کے ہاتھ میں تھا جیسے ہی میں نے اسکی طرف دیکھا اس نے ایک دم اخبار اپنے چہرے کے سامنے رکھ لیا جیسے اخبار بینی میں مصروف ہے۔ اس کا یہ اضطراری عمل میرے لیے تعجب انگیز تھا۔ بھلا وہ کون شخص ہو سکتا تھا؟ اگر وہ میری طرف دیکھ رہا تھا تو میرے دیکھنے پر گھبرا کیوں گیا تھا۔ ویٹر کافی لیکر آیا اور میرے سامنے میز پر رکھ کر خاموشی سے رُخصت ہو گیا۔ میں نے کافی بنائی، لیکن ایک عجیب سی اُلجھن نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے ذرا گہری نظروں سے اس غیر مُلکی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک صحت مند، بُلند قامت اور مضبوط جسم کا مالک تھا اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلے رنگ کی تھیں۔ بظاہر دیکھنے میں وہ ایک عام غیر مُلکی نظر آتا تھا، لیکن اس کی اس حرکت نے مجھے خواہ مخواہ مشکوک کر دیا تھا۔ اب وہ میری طرف سے بالکل بے نیاز اور بے پرواہ بیٹھا ہوا تھا جیسے میں ہال میں موجود ہی نہیں ہوں۔ میں نے گرم کافی کا گھونٹ بھرا تو ایک آسودگی بخش طمانیت میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ ہو سکتا ہے یہ محض ایک اتفاق ہی ہو اور اس کی یہ حرکت دانستہ نہ ہو۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ یکایک اس نے اخبار کو تہہ کر کے سامنے کی میز پر رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بارے میں میرا پہلا اندازہ بالکل دُرست تھا۔ وہ ایک تنومند اور جسیم آدمی تھا۔ میری جانب نگاہ ڈالے بغیر وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا مگر مجھے ایک اُلجھن اور کشمکش و پیچ میں ڈال گیا۔

"سر۔ آپ کا نام یوسف علی ہے؟" ویٹر نے مؤدب انداز میں میرے پاس آکر پوچھا۔

"ہاں کیا بات ہے؟"

"آپ کے لیے فون ہے — اُدھر ریسپشن پر!"

ہو نہ ہو یہ شوکت کا فون ہوگا۔ یہ سوچکر میں تیزی سے اُٹھا، لیکن شوکت نے فون کہاں سے کیا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ راستے میں کار کی خرابی یا کسی اور اُفتاد کی وجہ سے کہیں رُکنے پر مجبور ہو گیا ہو۔ یا پھر وہ کسی اور ہوٹل میں قیام پذیر ہو۔

"ہیلو۔ میں یوسف بول رہا ہوں۔" میں نے ٹیلی فون اُٹھا کر کہا۔

"ہیلو۔ مسٹر یوسف۔ آپ کے لیے میرے پاس ایک پیغام ہے۔" ایک زنانہ اور انتہائی سُریلی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

"جی فرمایئے۔" میں اپنی حیرانی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"آپ آج رات کو آٹھ بجے ویسٹ اینڈ روڈ کے بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں پہنچ جائیں۔"

"لیکن آپ کون بول رہی ہیں اور یہ پیغام کس نے دیا ہے؟"

جواب میں اسکی مترنم ہنسی کی آواز مجھے سنائی دی۔ "مجھے آپ نہیں جانتے اس لیے نام بتانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا لیکن

اتنا یاد رکھیے کہ اگر آٹھ بجے اس پتے پر نہ پہنچے تو آپ کو نقصان ہو سکتا ہے۔"

"مگر مجھے وہاں کس نے بُلایا ہے اور کس سلسلے میں؟"

"یہ تو میں نہیں جانتی۔" وہ پھر آہستہ سے ہنسی۔ شاید بات کرتے ہوئے ہنسنا اُسکی عادت تھی ورنہ میرے سوال میں ہنسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ "مجھے صرف اتنا ہی پیغام دینے کو کہا گیا تھا۔ خدا حافظ۔"

میں "ہیلو ہیلو" کہتا رہ گیا مگر دوسری طرف سے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ میں نے مجبوراً فون کا ریسیور نیچے رکھا تو سامنے وہی خوش اندام افسر مہمانداری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جواب میں اخلاقاً میں بھی مسکرایا، مگر پھر مجھے فون پر ملنے والا پیغام یاد آ گیا۔ میں اس شہر سے زیادہ واقف نہ تھا اور نہ ہی مجھے یہاں کی سڑکوں اور مختلف علاقوں کے بارے میں — کچھ علم تھا۔

"سُنیے۔" میں اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"فرمایئے۔!" جواب میں اس کا مُسکراتا ہوا چہرہ مجسّم سوال بن گیا۔

میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ جب وہ مُسکراتی تھی تو اس کے دونوں گالوں میں خوشنما گڑھے پڑ جاتے تھے جن کی وجہ سے اسکی مُسکراہٹ اور زیادہ دلکش ہو جاتی تھی۔ میں اس کے گالوں میں پڑنے والے خوبصورت گڑھوں کو دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ اسے دوبارہ مجھ سے پوچھنا پڑا۔ "سر۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟"

"ہاں ہاں۔" میں چونک پڑا۔ کسی لڑکی کو یوں گھورنا صریحاً بد تہذیبی میں داخل تھا اور میں نے پہلے کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ "میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ ویسٹ اینڈ روڈ شہر کے کس علاقے میں ہے اور یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"ویسٹ اینڈ روڈ۔" وہ ہولے سے مسکرائی اور اپنے گال پر ایک اُنگلی رکھ کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ "جی ہاں۔ یاد آ گیا ہے ویسٹ اینڈ روڈ ریس کورس کے پاس ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر ایسے بنگلے ہیں جن میں ریس کے سیزن میں ریس کے گھوڑے رکھے جاتے ہیں اور اسی کاروبار سے تعلق رکھنے والے لوگ ان بنگلوں میں اقامت پذیر ہوتے ہیں۔"

"مگر آج کل تو ریس کا سیزن نہیں ہے؟"

"جی نہیں اسی لیے اکثر بنگلے خالی ہو جاتے ہیں۔ ملازموں اور چوکیداروں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں رہتا۔ مگر بعض بنگلوں میں ایسے خاندان بھی رہتے ہیں جن کا ریس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ ان بنگلوں کے مستقل مکین ہیں۔"

"یہاں سے کتنے فاصلے پر ہو گی یہ ویسٹ اینڈ روڈ؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً چار میل کے فاصلے پر۔ آپ فرمائیں تو میں آپ کے لیے پرائیویٹ ٹیکسی کا انتظام کر دوں؟" وہ پھر مسکرائی۔

"شکریہ۔ مجھے ابھی جلدی نہیں ہے۔ ضرورت پڑی تو آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔" میں استقبالیہ سے ہٹ کر دوبارہ اپنے صوفے کی طرف گیا تو میری اُلجھن میں ایک اور اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ سُریلی اور دلکش آواز کس خاتون کی تھی؟ وہ کون تھی اور مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ وہ کون شخص ہے جو رات کو آٹھ بجے بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہے؟ پھر مجھے شوکت پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ مجھے یہاں مِل گیا ہوتا تو میں شاید ان واقعات سے دوچار نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی تو ہم دونوں مِل کر ان معمّوں کا کوئی حل تلاش کر لیتے مگر فی الحال میں اس شہر میں اکیلا تھا اور ان ہونے واقعات بہت تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ بِل پر سائن کرنے کے بعد میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے مقصد ٹہلنے لگا مگر میرا ذہن مجھ سے زیادہ تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ وہ پُراسرار آواز کس کی تھی؟ اور وہ کون ہے جو بنگلہ نمبر دو سو بارہ میں مجھ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ اس نے مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی؟ ہو سکتا ہے یہ سب مذاق ہو مگر ایسا انوکھا مذاق میرے ساتھ کون کر سکتا ہے؟ کسی کو ایسے مذاق کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس شہر میں بالکل نوارد تھا۔ مجھے ہوٹل میں کمرہ لیے ہوئے بمشکل ایک گھنٹہ گزرا ہوگا۔ پھر کسی شخص کو میرے نام اور کمرے کے بارے میں کیوں کر علم ہو سکتا ہے؟

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ رات کے آٹھ بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے مگر کیا میرا

www.pdfbooksfree.pk

اُس پُراسرار ملاقاتی تک کے پاس جانا مناسب بھی ہوگا؟ کافی سوچ بچار کے باوجود میں اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ بہت ممکن ہے اس تمام واقعے میں شوکت کی شرارت کو دخل ہو۔ وہ بعض اوقات پریکٹیکل مذاق بھی کیا کرتا تھا، حالانکہ اس قسم کا کوئی مذاق اس نے پہلے کبھی کم از کم میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔ اگر یہ فون شوکت نے نہیں کرایا تو پھر کس نے کرایا ہوگا؟ شیخ برکت؟ مگر نہیں۔ شیخ برکت کو تو میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع ہی نہیں تھی اور پھر وہ یہ کیسے جان سکتا تھا کہ میں امپیریل ہوٹل میں موجود ہوں۔ اس کے علاوہ شیخ برکت کو اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا تو براہِ راست فون کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار کر سکتا تھا۔ یہ سب ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

خدا جانے انہی سوچوں میں کھویا ہوا میں کب ہوٹل کی لابی سے نکل کر صدر دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ہوٹل کا باوردی چوکیدار سر جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"ٹیکسی سر؟!"

"ہاں" میں نے بلا سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اس کے اشارے پر ایک ٹیکسی فوراً میرے سامنے آکر رُک گئی۔ چوکیدار نے انتہائی شائستگی کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔

"کہاں جائیں گے سر؟" چند لمحے تک جب میں نے کوئی ہدایت جاری نہیں کی تو ٹیکسی ڈرائیور نے تنگ آکر مجھ سے سوال کیا۔

کہاں جاؤں گا؟ یہ تو میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا تھا مگر ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد کہیں نہ کہیں جانا بھی ضروری تھا۔

"تم ٹیکسی آہستہ آہستہ چلاؤ۔ میں تمہیں سوچ کر بتاتا ہوں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ٹیکسی حرکت میں آگئی۔ تیزی سے سوچنے کے باوجود میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے؟ جانے کے لیے جگہ بھی کون سی تھی؟ میں اس شہر کے کسی مقام سے واقف نہ تھا۔ نہ ہی یہاں میرا کوئی دوست اور شناسا تھا تو پھر میں ٹیکسی ڈرائیور کو کیا بتاؤں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں واپس ہوٹل جاکر اپنے کمرے میں ٹیلی ویژن پہ اِن ہوم مُوویز سے دل بہلاؤں؟ مگر ٹیکسی ڈرائیور میرے بارے میں کیا سوچے گا؟"

مگر شاید اس اثنا میں ٹیکسی ڈرائیور میرے بارے میں بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ مجھے اگلی سیٹ سے اس کی آواز سنائی دی۔

"سر میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"دیکھو بھئی۔ میں اس شہر میں اجنبی ہوں اور میرے پاس تھوڑا سا وقت فالتو ہے۔ تمہارے خیال میں کون سی جگہ مناسب ہوگی جہاں میں دو تین گھنٹے گزار سکوں؟"

"میں سمجھ گیا سر جی!" ٹیکسی ڈرائیور کی آواز میں ایک دم چمک پیدا ہو گئی۔ "یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کے دل بہلانے کا بندوبست کر دوں گا۔"

"مگر" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آپ فکر ہی نہ کیجئے سر جی۔"

ٹیکسی کی رفتار میں اچانک تیزی آگئی۔ میں نے بھی بلاوجہ سوچنا غیر ضروری سمجھا اور پچھلی نشست سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں کچھ دیر کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔ یہ ایک ارادی کوشش تھی۔ مجھے فوجی ملازمت کے دوران میں یہ تربیت بھی دی گئی تھی کہ ذہنی اُلجھن اور تفکرات کے ہجوم سے بچنے کے لیے میں کچھ وقت کے لیے بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے جسم اعصاب کو سکون پہنچا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے کڑی مشقیں کی تھیں اور مجھے اس عمل پر عبور حاصل ہو چکا تھا۔ چاہے کتنی بھی پریشانیاں اور مسائل ہوں میں جب اور جہاں بھی چاہوں ان سے وقتی طور پر نجات حاصل کر کے اپنے ذہن

جسم اور اعصاب کو سکون پہنچانے کی قدرت رکھتا تھا۔

میں اس عالم میں نہ جانے کتنی دیر رہا اور اس وقت چونکا جب ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے دو تین بار پکار کر ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی ہے۔ اسی لیے بہت دھیمی آواز میں مجھے بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ دانت نکالنے لگا۔ بولا: "معاف کرنا سر جی۔ میں نے آپ کی نیند خراب کر دی۔"

"کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ایک لمبی جمائی لی۔ "کیا بات ہے؟"

"اُتریں سر جی۔ آپ کا سٹیشن آگیا ہے۔"

"سٹیشن؟" میں نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ ٹیکسی ایک صاف ستھری کشادہ سڑک پر فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھی۔ آس پاس شاندار دو منزلہ مکانات تھے جن کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان کے مکین خاصے خوشحال ہیں۔

"آئیے سر جی!" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ہاتھ سے سامنے والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر یہ کون سی جگہ ہے؟ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ آئیے۔ میرے ساتھ آجائیے۔"

میں بلا ارادہ اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جس کے سامنے چھوٹا سا خوبصورت لان تھا۔ پھولدار پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اتنی دیر میں ڈرائیور دروازے پر لگی گھنٹی بجا چکا تھا۔

جس وقت میں دروازے پر پہنچا اُسی وقت دروازہ کھلا اور سامنے ایک سفید وردی پوش بیرے نے مؤدب ہو کر ہمیں سلام کیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ شناسائی کی ایک کیفیت پیدا ہوئی اور پھر اُس نے اشارے سے مجھے سلام کرتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا۔

"اندر آجائیے سر؟" اُس نے نرمی سے مجھے دعوت دی۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر جی؟ مجھے فارغ کریں گے یا میں آپ کا انتظار کروں؟"

ابھی میں جواب دینے نہ پایا تھا کہ باوردی بیرے نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "تم جاؤ۔ دو گھنٹے بعد صاحب کو لینے کے لیے آجانا۔"

ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مجھے اشارے سے سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں احمقوں کی طرح کھلے دروازے کے سامنے کھڑا اُن دونوں کو دیکھتا رہ گیا۔

"آجائیے سر!" بیرے کی آواز میں بے چینی آگئی تھی۔ شاید وہ ہر ہر قدم پر میرے رُک جانے کی وجہ سے اُکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ دروازے کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ ہو سکتا ہے یہ کوئی پرائیویٹ کلب ہو جہاں مجھ ایسے پردیسی کچھ دیر کے لیے وقت گزارنے آجاتے ہوں مگر مکان پر ایسی کوئی علامت دیکھنے میں نہیں آرہی تھی جس سے اندازہ ہو کہ وہ کوئی کلب یا تفریح گاہ ہے، البتہ سامنے والے دروازے پر انگریزی میں ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر "پرائیویٹ" لکھا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا: "یہ کون سی جگہ ہے۔ کیا کوئی پرائیویٹ کلب ہے؟"

"جی ہاں سر۔ یہ بہت ہی پرائیویٹ کلب ہے۔ آپ میرے ساتھ اِس طرف آئیے سر۔"

میں اس کے کہنے کے مطابق دروازے میں داخل ہوا تو میرے پیچھے دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ سامنے ایک مختصر سی لابی تھی اور اس کے دونوں اطراف گیلریاں تھیں جن میں دروازے تھے۔ فرش پر سُرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ باوردی بیرا لابی سے چلتا ہوا ایک گیلری کی طرف بڑھا۔ جب میں لابی سے گزرا تو میرے کانوں میں کچھ مردوں اور عورتوں کے ہنسنے اور

www.pdfbooksfree.pk

باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ وہ لوگ سرگوشی میں گفتگو کر رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بلند آواز سے بے اختیار ہنس پڑتا تھا۔ ایک گیلری سے گزر کر ہم ایک محراب نما دروازے میں پہنچے۔ یہ نیچے جانے والی سیڑھیوں کا راستہ تھا۔ گویا اس مکان میں ایک زیر زمین تہہ خانہ بھی تھا۔ ویسے بھی باہر سے یہ مکان جتنا بڑا نظر آتا تھا اندر داخل ہونے کے بعد اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ثابت ہوا۔ سیڑھیوں پر بھی سرخ قالین بچھا ہوا تھا اور فضا میں مختلف قسم کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر ہم پھر ایک مختصر سی لابی میں پہنچے جس میں مختلف سمتوں میں دروازے تھے۔ بیرے نے ایک بند دروازے پر دستک دی اور پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں دروازے کے اندر داخل ہوا تو بیرے نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اب میں ایک کمرے کے اندر تھا جس میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال گزرا کہ شاید میں کمرے میں اکیلا ہوں مگر جب آنکھیں اس مدھم روشنی سے مانوس ہوئیں تو پتہ چلا کہ میرے علاوہ اس کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ اس کمرے میں دیوار تا دیوار قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر کے نام پر ایک چھوٹی میز، کرسی اور ایک نشستی صوفے کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔ میں میز کی طرف بڑھا تو مجھے میز کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت بھی نظر آگئی۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک خوش جمال خاتون تھی جس نے چست سفید لباس پہن رکھا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں اس پر کسی ہسپتال کی نرس کا گمان گزرتا تھا۔ مجھے اپنے نزدیک پا کر وہ دلنواز انداز میں مسکرائی اور پھر مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب میں واضح طور پر کمرے کی ہر چیز دیکھ سکتا تھا، لیکن اس طرح دار عورت کے سوا کوئی اور دیکھنے کی چیز اس کمرے میں موجود نہ تھی۔ دیواریں ہر قسم کی آرائش سے محروم تھیں۔ کمرے کی واحد کھڑکی پر کوئی پردہ نہیں تھا۔ کوئی تصویر، پینٹنگ، گلدان قسم کی شے اس کمرے میں نہیں تھی۔ بس ایک صوفہ تھا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا یا وہ میز اور کرسی تھی جس پر نرس نما خاتون براجمان تھی۔

"آپ کس قسم کی تفریح پسند کریں گے؟" اس عورت نے مجھے مخاطب کیا۔ تو میں چونک پڑا۔ اس سے پہلے کمرے میں مکمل خاموشی کا راج تھا۔ اس کی آواز نے خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دیا تھا۔ اس کی آواز باریک نہیں تھی، لیکن بھاری ہونے کے باوجود اس میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ تھی اور اس آواز کو بار بار سننے کو جی چاہتا تھا۔

"آپ کے ہاں کون کونسی تفریح ہے؟" میں نے جواب میں دریافت کیا۔

وہ خالص کاروباری انداز میں بولی: "آپ ٹرکش باتھ لینا پسند کریں گے یا مساج کرائیں گے؟ آپ کے ذہنی اور جسمانی سکون کے لیے دوسرے طریقے بھی ہیں۔"

اوہو۔ یہ تو کوئی مساج گھر ہے۔ میں نے سوچا۔ بیرونی ملکوں میں اس قسم کے فیشن ایبل مساج گھروں کا تو مجھے علم تھا، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ خود ہمارے ملک میں بھی اس قسم کی تفریح گاہیں موجود ہیں۔ کیا حرج ہے اگر مساج کرانے کا تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔ یہ خیال کر کے میں نے اسے بتایا: "میں مساج کرانا پسند کروں گا۔"

اس نے میز پر لگا ہوا کوئی بٹن دبایا اور مکان میں کہیں ایک مترنم گھنٹی کی آواز گونجی۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور نرس نما عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک لمبی تڑنگی، صحت مند عورت تھی جو سفید فراک پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"دیکھو لوسی۔ مہمان کو مساج کے لیے لے جاؤ۔ کون سا کمرہ خالی ہے؟"

"گیارہ نمبر۔" لوسی نے مختصر جواب دیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور نہایت شستہ انگریزی میں کہنے لگی: "کیا آپ میرے ساتھ آنا پسند کریں گے؟"

میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم دوبارہ لابی میں پہنچے اور وہاں سے گیلری میں داخل ہوئے۔ ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر لوسی رک گئی۔ میں بھی جو اس کی بل کھاتی ہوئی چال کو دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا

یکلخت رک گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میرے اندر داخل ہونے کا انتظار کیے بغیر خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

یہ مناسب سائز کا کمرہ تھا جس میں ایک طرف آرام دہ دیوان رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی دیواروں کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ کمرے میں موجود دیوان اور اس پر پڑی ہوئی ریشمی چادر بھی نیلے رنگ کی تھی۔ کمرے میں خاص روشنی تھی، لیکن ایک جانب رکھے ہوئے خوبصورت لیمپ میں ایک نیلا بلب بھی روشن تھا۔ فرش پر ہلکے نیلے رنگ کا پھولدار قالین تھا۔ ایک جانب مختصر سی سنگھار میز رکھی ہوئی تھی اور سامنے باتھ روم کا دروازہ تھا، کیونکہ بیٹھنے کے لیے کوئی اور فرنیچر نہیں تھا اس لیے میں دیوان پر نیم دراز ہو گیا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دیوان پر نیم دراز ہونے کے بعد میری نظر اس ٹیلی ویژن اور وی سی آر پر پڑی جو سامنے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ یکایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازے میں جو لڑکی داخل ہوئی تھی اسے دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایسا لباس پہنے ہوئی تھی جو مغربی خواتین غسل کے لیے ساحل سمندر پر پہنتی ہیں، بلکہ یہ لباس کچھ اور بھی زیادہ مختصر تھا۔ اس کے بازو پر ایک نیلے رنگ کا تولیہ لٹک رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں ابھی تک حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر تولیہ دیوان کے سرہانے رکھ دیا اور پھر فراخدلی سے مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

"آپ مساج کرائیں گے؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

وہ پھر مسکرائی اور بولی: "ظاہر ہے کہ آپ لباس پہن کر مساج نہیں کرا سکتے اس لیے لباس اتار دیں۔ میں اتنی دیر میں تیاری کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ٹی وی کی طرف بڑھی اور اس نے ایک سوئچ آن کر دیا۔ یکایک ٹیلی ویژن میں جان پڑ گئی اور پھر ایک انتہائی بے ہودہ اور عریاں فلم چلنے لگی۔

"بند کر دو یہ فلم۔" میں نے بے اختیار چلا کر کہا۔ وہ اچھل پڑی اور حیران نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"سنا نہیں تم نے۔ بند کر دو یہ فلم۔" میں نے دوبارہ غصے میں کہا۔

اس نے ٹیلی ویژن بند کر دیا اور انتہائی حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی: "آپ مساج نہیں کرانا چاہتے؟" اس نے بڑی معصومیت سے مجھ سے دریافت کیا۔

"شکریہ۔" میں دیوان سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا: "مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں اس قسم کا مساج ہوتا ہے۔" اسے حیران کھڑا چھوڑ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ بدستور حیران، پریشان اور ساکت کھڑی پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔

میں لابی میں پہنچا تو باوردی بیرا سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ "سنو۔" میں نے اسے پکارا اور وہ نہایت ادب کے ساتھ رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"مجھے اپنے آفس لے چلو۔"

"آفس؟" اس نے حیران ہو کر دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا: "آپ مس نشاط کے پاس جانا چاہتے ہیں جن کے پاس میں آپ کو لے کر گیا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے وہیں لے چلو۔"

وہ خاموشی سے ایک طرف چل پڑا اور میں نے اس کی پیروی کی۔ مس نشاط کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی، لیکن میں نے انتظار گوارا نہ کیا اور بے دھڑک کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ جوں کا توں تھا اور مس نشاط بھی بدستور اپنی جگہ پر تشریف فرما تھیں۔ مجھے سامنے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئیں۔

"کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا؟" اس نے انگریزی میں مجھ سے سوال کیا۔

www.pdfbooksfree.pk

"یہ کس قسم کا مساج گھر ہے" میں نے غصے میں کہا "تم لوگ شریف آدمیوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ میں تمہاری شکایت کروں گا۔"

"شکایت؟" وہ آنکھیں جھپک کر معصومیت سے بولی "کس بات کی؟"

میں نے کہا "تم لوگوں نے یہاں غیر قانونی طور پر فحاشی کا اڈہ قائم کر رکھا ہے۔"

وہ خاموش مجھے دیکھتی رہی۔

"مگر یاد رکھو میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ میں آوارگی کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں تو وقت گزاری کے لیے آیا تھا۔"

"ہم اپنے گاہکوں کو پوری طرح مطمئن رکھتے ہیں سر، کیا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہو گیا ہے؟" اُس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا۔ "یہ ایک انتہائی پرائیویٹ کلب ہے جہاں صرف آپ جیسے شریف اور معزز لوگوں ہی کو آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔"

"معاف کرنا۔ میں اس قسم کا معزز آدمی نہیں ہوں جیسے لوگ تمہارے کلب میں آتے ہیں۔ میں جا رہا ہوں مگر لوگوں کو گناہ کے جال میں پھنسانے سے پہلے تمہارا فرض اوّلین ہے کہ انہیں اپنے کلب کے بارے میں پوری معلومات فراہم کر دو۔"

یہ کہہ کر میں واپسی کے لیے مڑا، مگر ابھی دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ اسکی ملائم آواز سنائی دی "مجھے افسوس ہے سر کہ آپ کو ہمارا کلب پسند نہیں آیا مگر کیا میں اُمید رکھوں کہ آپ جانے سے پہلے پانچ ہزار روپے فیس ادا کر دیں گے؟"

"پانچ ہزار؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "کس بات کے پانچ ہزار روپے؟ میں تمہاری سہولتوں سے فائدہ اٹھائے بغیر واپس جا رہا ہوں۔"

"معافی چاہتی ہوں سر، لیکن ایک بار جو شخص کلب کے اندر قدم رکھ لے اس پر یہ فیس واجب ہو جاتی ہے۔"

"جہنم میں جاؤ" میں نے غصے میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ لیکن ابھی گیلری تک ہی پہنچا تھا کہ سامنے والا دروازہ آہستگی سے کھلا اور اُس میں سے دو دیو قامت آدمی برآمد ہوئے۔ وہ دونوں انتہائی جسیم اور بلند قامت تھے اور ان کی قمیصوں کی آدھی آستینوں میں سے ان کے مضبوط پلے ہوئے جسم جھانک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے رحمانہ مسکراہٹ تھی اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لوہے کا پنجہ تھا جسے وہ بار بار اپنے دوسرے ہاتھ پر مار رہا تھا۔

"معاف کرنا سر" ان میں سے ایک اپنی گونجدار مکروہ آواز میں بولا۔ "آپ فیس ادا کرنا بھول گئے ہیں۔"

"میں نے تمہاری کسی سہولت سے فائدہ نہیں اُٹھایا" میں نے غصے میں کہا "اس لیے میں فیس دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"یہاں جو بھی ایک بار آ جاتا ہے وہ فیس کی رقم ادا کیے بغیر باہر نہیں جا سکتا اور کیونکہ آپ نے ہمارے کلب کی توہین بھی کی ہے اس لیے آپ کو پانچ ہزار روپے جرمانہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ یعنی ٹوٹل دس ہزار روپے دیئے بغیر آپ یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

میرا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "کون روکے گا مجھے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ نے سیدھی طرح رقم ادا نہیں کی تو پھر ہمیں دوسرے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں پہنے ہوئے آہنی پنجے کو اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا جو صاف اور واضح طور پر میرے لیے ایک دھمکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اگر میں نے ان کا مطالبہ منظور نہیں کیا تو وہ تشدد کا راستہ اختیار کریں گے۔ یہ زبردستی مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں تھی۔ میرا غصہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا مگر میں بلا وجہ کوئی ناخوشگوار صورت پیدا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

"دیکھو" میں نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی پوری کوشش کی تھی "مجھے دھوکہ دے کر یہاں لایا گیا ہے۔ میں اپنی مرضی اور خواہش سے یہاں نہیں آیا تھا۔ بہرحال۔ یہ ایک غلط فہمی تھی جس کے لیے میں کسی کو الزام دینا ضروری نہیں سمجھتا، لیکن میں اس فریب کے جال میں پھنس کر کوئی رقم ادا کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔ میرا راستہ چھوڑ دو اور مجھے واپس جانے دو۔" یہ کہہ کر میں آہستگی سے آگے بڑھا۔

www.pdfbooksfree.pk

دیو قامت آدمیوں میں سے ایک دو قدم آگے بڑھ کر میرے نزدیک آگیا۔ وہ قد میں مجھ سے اُونچا اور بہت زیادہ تنومند تھا۔ اپنا ایک فولادی ہاتھ بڑھا کر اُس نے میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی، لیکن گریبان تک پہنچنے سے پہلے میں نے دونوں ہاتھوں میں اسکی کلائی تھام لی اور ایک جھٹکا مارا۔ ہڈّی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور وہ دوسرے ہاتھ سے کلائی تھام کر زمین پر گر پڑا مگر اسی اثنا میں دوسرا دیو ہیکل غنڈہ ایک طوفانی آفت کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کا ایک گھونسہ میں نے جھکائی دے کر خالی جانے دیا۔ اس نے میرے چہرے کو نشانہ بنایا تھا، لیکن اگر وہ میرے چہرے پر پڑ جاتا تو یقیناً میرا حلیہ بگڑ جاتا۔ میرے جھکتے جھکتے بھی وہ گھونسہ میرے بائیں کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ وہ اپنی جسامت کے مقابلے میں کہیں زیادہ سُبک اور پھرتیلا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ کر اپنے آہنی پنجے سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس بار بھی اس کا نشانہ میرا چہرہ ہی تھا۔ اس کا چہرہ غصّے کی وجہ سے اور زیادہ بھیانک ہو گیا تھا اور وہ ہر صورت میں مجھے کچل کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ میرے پاس بچاؤ کے لیے فوری طور پر کوئی صورت نہیں تھی سوائے اس کے کہ میں دیوار کی طرف ہٹ کر اسکا وار خالی کر دوں۔ لیکن میرے حرکت کرنے سے پہلے وہ اپنا رُخ بدل کر مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ وہ بہت تیزی سے میری طرف لپکا مگر فرش پر پڑے ہوئے اس کے ساتھی کے جسم سے ٹھوکر کھا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور جھونک میں آکر اوندھے مُنہ گر گیا اور اس کا آہنی پنجہ پوری قوت سے قالین میں پیوست ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ میری ایک ٹھوکر اس کے چہرے پر پڑی اور دوسری پسلیوں پر۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا بایاں پیر بڑھا کر اس کے آہنی پنجے والے ہاتھ پر رکھ دیا اور پورے جسم کا زور اس پر ڈال دیا۔ وہ تکلیف سے چلّایا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کو وہیں چھوڑ کر میں نے اطمینان کے ساتھ دروازے کا رُخ کیا۔ یکایک میرے بائیں جانب کا دروازہ کھلا اور اس میں سے مس نشاط کا سدا مُسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ دونوں قوی ہیکل دیو قامت غنڈوں کو فرش پر تکلیف سے بلبلاتا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں اور اُس نے پھُرتی سے دروازہ بند کر دیا۔

میں اس عمارت سے باہر نکلا تو ٹیکسی ڈرائیور کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے دو گھنٹے بعد آنا تھا اور شاید اس اثنا میں وہ کوئی اور شکار تلاش کرنے چلا گیا تھا۔ کچھ دُور تک میں پیدل چلتا رہا۔ کچھ کاریں اور ٹرک نہایت تیز رفتاری کے ساتھ میرے برابر سے گزر گئے۔ اس علاقے میں ٹیکسی کا حصول خاصا دُشوار نظر آرہا تھا اس لیے میں نے وقت کی بچت کی خاطر کسی کار والے سے لفٹ لینے کا ارادہ کر لیا۔ میں بدستور پیدل چلتا رہا لیکن اس دوران میں نزدیک سے گزرنے والی کاروں سے اشارے سے لفٹ بھی طلب کرتا رہا۔ اب شام خاصی جھک چکی تھی اور فضا میں اندھیرے پھیلنے لگے تھے۔ یکایک ایک کار تیزی سے میرے برابر سے گزری لیکن کچھ فاصلے پر جاکر بریک چلّائے اور کار ڈرائیور نے کار کو روک لیا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ زیادہ نہ تھا اس لیے میں تیزی سے چند قدم اُٹھانے کے بعد کار تک پہنچ گیا۔ کار کا سٹیرنگ کے ساتھ والا اگلا دروازہ کھلا اور میں "تھینک یو" کہتا ہوا اندر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اپنے محسن کی طرف متوجہ ہوا جو پہلے ہی میری طرف متوجہ تھا۔ ہم دونوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں حیران و ششدر رہ گئے۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ چہرہ تھا جسے کوشش کے باوجود میں بھلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ جس کی تلاش اور جستجو میں میں نے مُلک کا گوشہ گوشہ چھان مارا تھا مگر اس کا پتہ حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جو میری آرزوؤں کا مرکز، میری خواہشوں اور تمناؤں کی منزل تھا۔ یہ چہرہ عاشی کا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد یوں اچانک عاشی کو اپنی نگاہوں کے سامنے پاکر میں ساکت رہ گیا تھا۔ خود عاشی بھی حیرانی اور بے یقینی کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری ملاقات کافی طویل عرصے کے بعد ہوئی تھی لیکن اس میں ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح خوبصورت، پُرسکون اور تروتازہ تھی۔ اس کے نرم و ملائم سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل کر کچھ اور بڑی ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے کی دلکشی اور رعنائی میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی۔ وہ میرے خوابوں کی تعبیر تھی۔ میری آرزوؤں کی معراج تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی

جو میری پہلی اور آخری محبت تھی۔ روزی سے شادی کے باوجود میں عاشی کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکا تھا اور اس حقیقت سے روزی بھی پوری طرح باخبر تھی۔ ہماری شادی سے پہلے میں نے اس سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خود شوکت بھی عاشی کے بارے میں میری دیوانگی سے پوری طرح واقف تھا اور یہ اس کی تجویز تھی کہ اس کو بھلانے کے لیے میں روزی سے شادی کر لوں۔ اگرچہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں تھا کہ میں عاشی کو بھلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر شوکت میرا بہترین دوست تھا۔ وہ دنیا میں میرا سب سے بڑا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ میری زندگی سے عاشی کے نکل جانے کے بعد صرف شوکت ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے مجھے جینے کا سہارا بخشا تھا۔ عاشی کی تلاش میں اس نے میرے ساتھ زمین آسمان ایک کر دیا تھا۔ جب اچانک عاشی کے خطوط آنے بند ہو گئے تو شوکت نے نہ صرف ہندوستان میں اپنے دوستوں کو عاشی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی بلکہ بذاتِ خود بھی جعلی پاسپورٹ کے ذریعے سرحد پار چلا گیا اور میری خاطر اس نے اپنی زندگی اور عزّت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ وہ فوجی رہ چکا تھا اور اس اعتبار سے اس کے لیے ہندوستان کا ویزا حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا لیکن اس کے باوجود اس نے محض میری دوستی اور خوشی کی خاطر ایک جعلی نام سے پاسپورٹ اور ویزا حاصل کیا اور عاشی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس کے باوجود ہم عاشی کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی گمشدگی نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو گئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اگر حالات اسی طرح رہے تو کچھ عرصے بعد میں ہوش و حواس سے مکمل طور پر بیگانہ ہو جاؤں گا میری دیوانگی شوکت کو گوارا نہ تھی۔ وہ میرا غم بٹانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کے اور اس کی بیوی نسیم کے توسط سے میری ملاقات روزی سے ہوئی اور میرے حالات سے آگاہی حاصل کرنے اور میری دیوانگی جاننے کے باوجود روزی نے میری شریکِ حیات بننا گوارا کر لیا۔ میں اس شادی کے حق میں نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ ساری عمر کوئی دوسری لڑکی میری زندگی میں کبھی بھی عاشی کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ میں اپنی باقیماندہ زندگی عاشی کی تلاش اور یاد میں بسر کرنے کا خواہش مند تھا لیکن شوکت کا دوستانہ اصرار اور روزی کی بے لوث محبت کے آگے ایک دن میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح روزی بیوی بن کر میری زندگی میں داخل ہو گئی لیکن مجھے سکونِ قلب پھر بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ احساس ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں ہوا کہ روزی سے شادی کرنے میں عاشی سے بے وفائی کا مرتکب ہوا ہوں۔ اگرچہ اس کے ملنے کا ایک فیصد امکان بھی باقی نہیں رہا تھا لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں اپنی زندگی اور اپنے دل میں کسی اور کو عاشی کی جگہ براجمان کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن شوکت کی ضد اور روزی کی محبت کے آگے ایک دن مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے باوجود عاشی کی یادوں کو میں اپنے دل سے جدا نہیں کر سکا تھا۔ شوکت نے مجھے اپنے ساتھ بزنس میں شامل کر لیا جس کے لیے روزی نے سرمایہ فراہم کیا تھا۔ میں اس تجویز کے حق میں نہیں تھا لیکن اُن دونوں کی دلیل یہ تھی کہ جب تک میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو مصروف نہیں کروں گا میری دیوانگی میں کمی نہیں آئے گی۔ پھر ویسے بھی فوجی ملازمت چھوڑنے کے بعد مجھے زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا اور شوکت کے ساتھ مل کر کاروبار کرنا میرے لیے ایک نادر موقع تھا۔

یہ تمام خیالات پَل بھر میں میرے ذہن میں آکر رُخصت ہو گئے۔ میری بے تاب نگاہیں بدستور عاشی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس پر اب خوشی اور حیرانی کی جگہ ناخوشی اور بیزاری کے تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ مجھے اچانک غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر جو بے کراں مسرّت جلوہ گر ہوئی تھی وہ اس بات کا کھلا ثبوت تھی کہ چاہے زمانے نے ہمارے ساتھ کوئی بھی چال چلی ہو وہ مجھے فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور پہلی محبّت کی چنگاریاں ابھی تک راکھ میں تبدیل نہیں ہوئی تھیں۔

جب میں کچھ دیر کے بعد اپنے ہوش و حواس میں واپس آکر اور بولنے کے قابل ہوا تو میرے منہ سے نکلا "عاشی تم! میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم سے یوں اچانک ایک دن ملاقات ہو جائے گی اور تم اتنی آسانی سے مجھے مل جاؤ گی"

عاشی خاموش تھی۔ اس کی نظریں سامنے سٹیرنگ پر جمی ہوئی تھیں اور صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش

www.pdfbooksfree.pk

میں مصروف ہے۔ وہ مجھے خلافِ توقع اپنے سامنے پا کر بکھر سی گئی تھی اور اب اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی جدّوجہد میں مصروف تھی۔ چند اور طویل لمحے اسی طرح گزر گئے اور وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

میں نے کہا۔ "عاشی، آخر تم کہاں چلی گئی تھیں۔ اچانک کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اگر تم اس ملک میں واپس آ گئی تھیں تو تم نے مجھے خبر کیوں نہیں کی!"

وہ شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی: "ڈرامہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوسف! تم اس وقت جہاں بھی جانا چاہتے ہو میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے کار سٹارٹ کردی۔ وہ خاموشی سے کار چلا رہی تھی اور اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا جو میں اس سے پہلے بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔ عالمِ خواب و خیال میں بھی میں بارہا عاشی کو اسی طرح کار چلاتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ نظارہ میری آنکھوں اور حافظے میں ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک دو بار پھر کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش رہی۔ اس کے گلابی نازک ہونٹ مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے پر جمے ہوئے ہیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہنے کے لیے کافی کوشش اور جدّوجہد کر رہی ہے۔ اس کی مسلسل اور دانستہ خاموشی نے مجھے بھی خاموش کر دیا۔ میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا اور دل میں سوچتا رہا کہ اگر تقدیر میرا ساتھ دیتی تو یہ نظارہ مستقل طور پر میرا مقدّر بن گیا ہوتا اور میری زندگی یوں بے معنی اور بے کیف ہو کر نہ رہ جاتی۔ کاش عاشی اچانک ہندوستان نہ جاتی۔ کاش وہ میرے خطوں کا باقاعدگی سے جواب دیتی رہتی۔ کاش وہ یوں گم نہ ہوتی۔ کتنے بہت سے کاش میری زندگی کا ایک حصّہ بن کر رہ گئے تھے۔ کاش کتنا معمولی اور سادہ سا لفظ ہے لیکن کس قدر سنگدل اور بے رحم ہے۔ اس ایک لفظ نے بے شمار زندگیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ کاش یہ لفظ ہم انسانوں کی زندگی میں شامل نہ ہوتا تو یہ دنیا کتنی حسین اور خوشیوں سے معمور ہو جاتی!

کچھ دیر ہم دونوں خاموشی سے سفر کرتے رہے یہاں تک کہ شہر کے بارونق حصّے میں پہنچ گئے۔

"کہاں اُتاروں تمہیں؟" عاشی نے انتہائی سرد اور رسمی لہجے میں دریافت کیا۔ میں اُس کی بے تکلفی اور بے نیازی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنے گہرے دیرینہ رابطے اور تعلق کے بعد دو انسان یوں بھی ایک دوسرے سے دُور اور اجنبی ہو سکتے ہیں؟

"عاشی!" میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "کیا تم میرے لیے چند منٹ بھی نہیں نکال سکو گی؟ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہنے کے لیے اب باقی کیا رہ گیا ہے؟" اس کا لہجہ اور آواز برف میں لگا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کہنے کے لیے تو بہت کچھ ہے مگر شاید تم سُننے کے لیے تیار نہیں ہو۔ پھر بھی میری درخواست ہے کہ کسی جگہ چل کر چند لمحے میرے ساتھ گزار دو۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے یوسف۔" وہ بے رحمی سے بولی۔ "اور پھر یہ مت بھولو کہ اب تم ایک شادی شدہ آدمی ہو۔ مجھ سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

"کیا شادی شدہ آدمی کو کسی سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ عاشی۔ میں تمہیں گزرے ہوئے لمحوں کا واسطہ دیتا ہوں۔ اُن بیتے ہوئے دِنوں کی قسم جب ہم ایک دوسرے سے نزدیک ترین تھے۔ خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرنا عاشی پلیز۔" میری آواز شدّتِ جذبات سے کانپنے لگی۔ اگر کچھ دیر اور گزر جاتی تو شاید میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ "صرف چند لمحے!؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ انتہائی سرد لہجے میں بولی۔ "لیکن یاد رکھو۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کار کا رُخ ساحلِ سمندر کی طرف موڑ دیا۔

یہ نہایت پُرفضا مقام تھا۔ موسم بھی انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ اس نے کار پارک کی اور ہم دونوں کار سے باہر نکلے تو مجھے وہ سماں یاد آ گیا جب ایسے ہی ایک مقام پر ہم دونوں دوسری بار ملے تھے۔

"کہیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اُس نے یخ بستہ آواز میں پوچھا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

خدایا۔ میرے کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اسی عاشی کی آواز ہے جو کسی زمانے میں میرے لیے رُوح پروری کا سامان تھی۔

"سنو عاشی۔" میں نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ کانپ کر رہ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

"خدا کے لیے عاشی اتنی غیریت کا برتاؤ نہ کرو میرے ساتھ۔" میں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تمہیں خدا پر یقین ہے تو اسی کی قسم کھا کر میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس وقت سے تم مجھ سے جدا ہوئی ہو بخدا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو اور تمہاری تلاش میں سرگرداں نہ رہا ہوں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے میرے خطوط کا جواب نہیں دیا۔ میرے ٹیلی گرامز کے جواب میں چپ سادھے رہے؟"

"یہ غلط ہے عاشی۔ یقین کرو یہ جھوٹ ہے۔ میں نے تمہیں سینکڑوں خط بھیجے۔ درجنوں ٹیلی گرامز روانہ کیے یہاں تک کہ جب تمہاری طرف سے کوئی رسید نہیں ملی تو میں نے اپنے عزیز اور مخلص ترین دوست شوکت کی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہیں ڈھونڈنے کے لیے ہندوستان بھیجا۔ تمہارے بتلائے ہوئے پتے پر اس نے تمہاری کھوج لگانے کی کوشش کی مگر تمہاری خبر نہیں ملی۔"

"حیرت انگیز!!" عاشی کی آواز میں پوشیدہ بے یقینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اور کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم نے دولت کی لالچ میں ایک امیر غیر ملکی لڑکی سے شادی کر لی جس نے تمہیں کاروبار کے لیے سرمایہ دیا اور اس طرح تم نے اپنے آپ کو اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔"

"جھوٹ ہے۔ بخدا یہ جھوٹ ہے۔ صرف اتنا سچ ہے کہ میں نے ایک لڑکی سے شادی کر لی جو ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتی تھی مگر صرف اُس وقت جب میں تمہاری طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ مگر میں نے تمہارے بارے میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ جانتی ہے کہ تم ہی میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ یہ درست ہے کہ میں نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا ہے جس کے لیے سرمایہ میری بیوی نے فراہم کیا، لیکن میں نے اس کے ساتھ کوئی سودا نہیں کیا۔ اگر مجھے تمہارے زندہ سلامت رہنے کا علم ہوتا تو تم سے ملنے کی ایک فیصد بھی آس ہوتی تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ خدا کی قسم میں عمر بھر تمہارا انتظار کر سکتا تھا، لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تم لاپتہ ہو اور تمہیں تلاش کرنا بے سُود ہے۔"

وہ خاموش نظروں سے مجھے گھورتی رہی، لیکن اس کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات سے میں یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین آنے لگا ہے۔

"عاشی۔ یقین جانو تمہارے بغیر ہر سانس ایک عذاب ہے اور ہر لمحہ اذیت۔ کاش میں تمہیں اپنی ذہنی اور دلی کیفیت دکھا سکتا۔"

وہ بدستور اپنی گود میں ہاتھ رکھے خاموش بیٹھی رہی۔ یہ اس کا مخصوص انداز ہے۔ جب وہ کچھ سوچتی ہے تو اسی طرح چُپ چاپ بیٹھ جاتی ہے۔ میں نے اس کے آگے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ اس کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے اور رہ بھی کیا گیا تھا؟ میں نے اسے حالِ دل سنا دیا تھا۔ اب میں اس کی عدالت میں سر جھکائے فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گویا ہوئی تو اس کی آواز نہایت مدّھم تھی اور ہلکی سی لرز رہی تھی۔ "یوسف۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم جھوٹے نہیں ہو۔ چلو میں نے تمہاری باتوں کا اعتبار کر لیا۔"

میں خوشی سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "عاشی۔ تو کیا تم نے واقعی مجھے معاف کر دیا ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

"جب تم نے کوئی قصور ہی نہیں کیا تو معافی کس بات کی؟" وہ ہولے سے بولی "تقدیر نے ہمارے ساتھ عجیب مذاق کیا ہے۔ قصور نہ تمہارا ہے اور نہ میرا۔ پھر بھی ہم دونوں ہی سزا بھگت رہے ہیں۔"

میں فرطِ جوشِ جذبات سے کانپنے لگا۔ الفاظ میرے ذہن سے نکل گئے اور کوشش کے باوجود میرے لبوں سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ عاشی کا یوں اچانک مل جانا اتنا آسان ہوگا اور اس کو اپنے احوال کا قائل کرنا اس سے بھی آسان تر ہوگا۔ یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ ہندوستان سے کب واپس آئیں۔ تمہارے بھائی منصور کا کیا حال ہے؟" میں نے پے درپے کئی سوال کر ڈالے۔

وہ اُداسی سے مسکرا کر بولی "تم نے تو ایک سانس میں بے شمار سوال کر ڈالے۔ میں تو چھ مہینے بعد ہی ہندوستان سے واپس آگئی تھی۔ تم سے ملنے گئی تو تم وہ گھر کیا شہر ہی چھوڑ چکے تھے۔"

"اوہ میں نے کتنی بڑی حماقت کر دی۔ کاش میں کچھ عرصہ اور صبر کرتا اور اپنا گھر اور شہر نہ چھوڑتا۔" مارے تاسف اور پشیمانی کے میرا جی چاہتا تھا کہ اپنا منہ نوچ ڈالوں۔

"جو ہونا تھا ہو چکا۔ قسمت کو یہی منظور تھا۔"

"اتنی جلدی ہار مان گئیں؟!" میں نے کہا "قسمت نے ہمیں دوبارہ خلافِ توقع ایک دوسرے کے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قسمت دوبارہ ہم پر مہربان ہوگئی ہے!"

"تم ہمیشہ کی طرح خوش فہم ہو۔" وہ غمگین آواز میں بولی۔ "بگڑے ہوئے کام اور ٹوٹے ہوئے رشتے اتنی آسانی سے دوبارہ نہیں بنتے۔"

"نہیں عاشی۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ....."

"شیخ چلی کی طرح مت سوچو۔" اس نے میری بات کاٹ دی اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "اب ہم دونوں کی راہیں الگ ہو چکی ہیں۔ میں نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

معاً ایک شبہ تیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہوگیا۔ "عاشی!" میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "تم نے شادی تو نہیں کر لی؟"

جواب میں وہ خاموش رہی۔ ایک معصوم سی مسکراہٹ اس کے خوبصورت ہونٹوں کے کناروں پر مچل کر رہ گئی۔

"عاشی!!" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"سنو یوسف۔ زندگی گزارنے کے کئی طریقے ہیں۔ کئی ڈھنگ ہیں۔ عقلمند لوگ وہی ہوتے ہیں جو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔"

"نہیں نہیں نہیں۔" میں بے اختیار چلایا۔ "یہ ظلم ہے۔ ناانصافی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ آہستہ سے اپنی کار کی طرف چلنے لگی۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ہم کار کے پاس جا کر رُک گئے۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑی رہی پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "یوسف۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"ایک نہیں۔ ہزار وعدے کرنے کو تیار ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ تم مجھے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دو گے۔"

"عاشی!" میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"وعدہ کرو کہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ میرا پیچھا نہیں کرو گے۔ اپنی موجودہ زندگی کے ساتھ مصالحت کر لو گے۔"

دفورِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جی چاہا کاش سانس رُک جائے۔ دم نکل جائے۔ "اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ بولو۔ وعدہ کرو گے نا؟" میں نے نگاہیں اُٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا جو آج بھی اتنی رعنائی، شادابی اور دلکشی میں یکتا تھا۔ اُن آنکھوں میں جھانکا۔ جو جھیل سے زیادہ گہری اور خوبصورت تھیں۔

"بولو بولتے کیوں نہیں؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں عاشی۔" میری آواز خود میرے کانوں کو بالکل اجنبی لگ رہی تھی۔ "مگر تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"اگر زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔"

"اگر تمہیں ضرورت پڑی اور ساری دُنیا نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی تم مجھے اپنا ہمدرد پاؤ گے۔" اُس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا اور پھر اپنی کار کا دروازہ کھول کر کھڑی ہوگئی "یہاں سے تمہیں ٹیکسی مل جائے گی اس لیے خدا حافظ۔ شاید ہم زندگی میں دوبارہ نہ مل سکیں۔" میں ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا جس پر ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا "یہ میرا فون نمبر ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ تمہیں اس کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اس نے کار سٹارٹ کی اور ایک بار پھر میری طرف دیکھے بغیر رُخصت ہوگئی۔ میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔ میری حالت اس بچے کی طرح تھی جس سے اچانک ڈھیر سارے کھلونے دیکر واپس چھین لیے جائیں۔

یکا یک کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ٹیکسی سر!!" میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو وہی ٹیکسی ڈرائیور میرے سامنے کھڑا تھا جو مجھے پرائیویٹ کلب لے گیا تھا۔ مگر اس وقت وہ تنہا نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر تین قدآور غنڈے کھڑے ندیدوں کی طرح مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبا شکاری چاقو تھا۔

"مجھے بلاوجہ تنگ نہ کرو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تنگ تو تم نے ہمیں کیا ہے۔" وہ یکسر بدلے ہوئے دُرشت لہجے میں بولا "میڈم نے تمہیں پکڑ کر لانے کا حکم دیا ہے۔ سیدھی طرح چلو گے یا زبردستی کرنی پڑے گی۔"

میں سخت اُکتایا ہوا تھا اور میرے پاس فضول اور فالتو وقت بھی نہیں تھا چنانچہ میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ میرے پہلے فائر پر چاقو والے غنڈے کے ہاتھ سے چاقو زمین پر گر گیا اور وہ اپنا زخمی ہاتھ تھام کر رہ گیا۔

دوسرے دو فائر میں نے دونوں غنڈوں کے پیروں کے پاس کیے اور انہیں وہاں سے نو دو گیارہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کے بعد میں ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوا جو خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ مجھ سے نظر ملی تو وہ خوفزدہ نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے گھڑی دیکھی جس میں سات بج رہے تھے۔ "اب تم آ ہی گئے ہو تو مجھے ہوٹل سی پہنچا دو۔"

اس نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا، مگر اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ زخمی غنڈے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے عجب سے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

ساحل سمندر سے ہوٹل تک کا سفر پُرسکون تھا۔ میں نشست کی پشت سے سر ٹکائے عاشی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی عاشی سے ملا ہوں۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ تمام واقعہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سوتے جاگتے کا عالم تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

گالوں میں ڈمپل والی لڑکی ابھی تک ڈیوٹی پر موجود تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرے کمرے کی چابی میرے حوالے کی۔ میں لفٹ کی بجائے سیڑھیوں کے راستے اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا لیکن کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ کمرے کا سارا سامان بے ترتیب اور اُلٹا ہوا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بہت عجلت میں سامان کی تلاشی لی ہے۔ سوٹ

www.pdfbooksfree.pk

کیس میں کپڑے اور نقدی موجود تھی۔ میں نے یہ جاننے کے لیے ہر طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔ آئینے والی میز کے سامنے رکھا ہوا میرا بریف کیس جس میں تمام ضروری کاغذات تھے، غائب تھا۔

فون کی اچانک بجنے والی گھنٹی کی آواز سے میں چونک کر اُچھل پڑا۔ فون پر دوسری طرف وہی پُراسرار زنانہ آواز تھی: "ہیلو۔" وہ سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "سویٹ ہارٹ۔ تمہارا آٹھ بجے ایک ضروری اپائنٹ منٹ ہے۔ یاد ہے نا؟!"

"میں انجان لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے غصے میں جھلا کر کہا۔ "آخر تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ تم کون ہو؟ اور وہ کون شخص ہے جو ویسٹ اینڈ روڈ پر مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟"

"اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔" وہ نیم مزاحیہ انداز میں بولی۔ "یاد رکھو اگر وہاں نہیں پہنچو گے تو پچھتاؤ گے۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون کا رابطہ کٹ گیا۔

میں حیران کھڑا سوچتا رہ گیا کہ کیا مجھے اس پُراسرار ملاقاتی سے ملنے کے لیے جانا چاہیئے یا نہیں۔؟"

لیکن اس سے پہلے مجھے ایک عدد مسئلہ حل کرنا تھا۔ میرے غائب ہونے والے بریف کیس میں دوسرے ضروری کاغذات کے علاوہ ایگریمنٹ کا ڈرافٹ بھی موجود تھا جس کی نقل شوکت کے پاس بھی نہیں تھی۔ اس ڈرافٹ کی گمشدگی کی صورت میں ملک برکت سے معاہدہ سائن کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ معاہدے پر غور کرنے کے لیے میرے پاس اگلی صبح تک کا وقت تھا۔ اب فی الحال مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ دو سو بارہ ویسٹ اینڈ روڈ جانا میرے لیے سود مند ہوگا یا نقصان دہ؟

ایک اَن دیکھے مقام پر کسی مکمل انجان شخص سے ملنے کی ضرورت تو نہیں تھی، لیکن پھر میری مہم جُو اور خطر پسند فطرت نے مجھے اُکسایا اور میں نے فون اُٹھا کر استقبالیہ کا نمبر ملایا اور فوری طور پر ایک ٹیکسی طلب کرنے کی ہدایت کی۔ اپنے کھلے ہوئے سُوٹ کیس کو دوبارہ مقفل کر کے میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیکن یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی کہ سوٹ کیس میں رکھی ہوئی رقم کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ تلاشی لینے والے کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی اور چیز کی تلاش میں تھا۔ کیا اسے ایگریمنٹ کے کاغذ کی ضرورت تھی۔ لیکن کسی کو اس ایگریمنٹ کے کاغذات سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یہی سوچتا ہوا میں لابی سے گزر کر ٹیکسی تک پہنچ گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور

درمیانی عمر کا ایک دُبلا پتلا آدمی تھا جو دیکھنے میں ایک کاہل اور سست الوجود شخص نظر آتا تھا۔ جب اس نے بڑھ کر میرے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو ہر کام مطمئن ہو کر سکون کے ساتھ کرنے کا عادی ہے اور کوئی بڑی سے بڑی ایمرجنسی بھی اسے تیز رفتار نہیں بنا سکتی۔ اس کی ٹیکسی بھی پُرانے ماڈل کی ایک پیکارڈ کار تھی۔ جو اپنی لمبائی اور چوڑائی کی وجہ سے خاصی بارُعب تھی اور اس کے اندر بیٹھنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کی دیکھ بھال بھی کافی سلیقے سے کی گئی تھی۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟" ڈرائیور نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دریافت کیا۔

"دو سو بارہ ریس کورس روڈ۔"

گاڑی خاصی تیز رفتاری سے ایک جھٹکے کے ساتھ چلنا شروع ہوئی جو ٹیکسی ڈرائیور کے ظاہری حُلیے کے بالکل برعکس تھا۔ بعض اوقات لوگوں کے حُلیے اور شکل و صُورت بھی ان کی اصلیت سے کتنے متضاد ہوتے ہیں۔

"سنو!" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا: "یہ جگہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"زیادہ دُور نہیں ہے جناب۔ دس بارہ منٹ کا راستہ ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ میں وقت مقررہ پر وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اگرچہ میں ایک انجان اور اَن دیکھے مُلاقاتی سے ملنے کے لیے جا رہا تھا لیکن پھر بھی اپنی عادت کے مطابق وقت کی پابندی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا سر ٹیکسی کی آرام دہ پچھلی

نشست سے ٹکا دیا اور ہوٹل میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا سامان اپنی جگہ موجود تھا اور بریف کیس کے سوا کوئی اور چیز گم نہیں ہوئی تھی لیکن اوّل تو یہ بات بذاتِ خود تشویشناک تھی کہ کسی کو میرے سامان کی تلاشی لینے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ دوسری قابلِ غور بات یہ تھی کہ میرے بریف کیس کو چوری کرنے سے کوئی شخص کیا حاصل کر سکتا تھا۔ اس میں کاغذات اور معاہدے کے مسوّدے کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر چیز نہ تھی۔ معاہدہ میرے لیے بہت اہم تھا لیکن کسی دوسرے آدمی کے لیے اس کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ بریف کیس میں موجود دوسرے کاغذات بھی کسی اور کے کسی کام کے نہ تھے۔ جو شخص بریف کیس اُٹھا کر لے گیا ممکن ہے وہ اس اُمید پر لے گیا ہو کہ اس کے اندر قیمتی اشیاء اور نقد روپیہ ہوگا لیکن اس کے برعکس میرے سوٹ کیس میں رکھے ہوئے نقد روپے کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر وہ پیسے کا متلاشی ہوتا تو سوٹ کیس سے حاصل ہونے والا نقد روپیہ بھی اس کے لیے کم نہیں تھا گویا جو شخص بھی میرا بریف کیس اُٹھا کر لے گیا تھا وہ لازمی طور پر اس سے کوئی فائدہ یا مقصد حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

میں نے اس تمام واقعے کی اطلاع ہوٹل انتظامیہ کو نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ لامحالہ پولیس تک بات پہنچتی اور مجھے پولیس کی تفتیش کے باعث اپنے قیام کو طول دینا پڑتا جس کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ اوّل تو گم شدہ بریف کیس کی دستیابی کی ہی سرے سے کوئی اُمید نہ تھی اور اگر بفرضِ محال پولیس یہ بریف کیس حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتی تو اس میں رکھے ہوئے کاغذات ہرگز دستیاب نہ ہوتے۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ ہوٹل انتظامیہ کو اس کیس میں ملوث نہ کروں۔

میں بظاہر بہت مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا لیکن میرے ذہن کے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہوٹل میں پیش آنے والے واقعے کے علاوہ ایک انجان اور گمنام شخص سے ملاقات کا تصور بھی میرے لیے پریشانی اور الجھن کا سبب تھا۔ وہ شخص کون ہو سکتا ہے اور کیا اس سے ملاقات کرنا میرے لیے ضروری تھا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ میں ہوٹل کے کمرے میں آرام کرتا اور شوکت کی آمد کا منتظر رہتا۔ شوکت کی طرف سے بھی مجھے فکر لگی ہوئی تھی لیکن اب اس میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا۔ شوکت اگر آ بھی جائے تب بھی بریف کیس میں رکھے ہوئے معاہدے کے مسوّدے کی غیر موجودگی میں ہم ملک برکت سے ایگریمنٹ سائن نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ دوبارہ عدالتی کاغذات حاصل کر کے نئے سرے سے معاہدہ لکھا جائے۔ معاہدے میں بعض ایسے اعداد و شمار بھی درج تھے جو مجھے زبانی یاد نہیں تھے۔ گویا معاہدے کی تیاری کے لیے مجھے دوبارہ واپس جا کر اپنے کاغذات کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ غرضیکہ ایک عجب گورکھ دھندا تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

میری سوچوں کا سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب اچانک ٹیکسی ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ ہمارے سامنے ایک بلند و بالا آہنی دروازہ تھا جو اپنی مضبوطی کے اعتبار سے کسی قلعے کا دروازہ لگتا تھا۔ اس سیاہ رنگ کے آہنی دروازے کے پیچھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور یوں بھی اتنے اُونچے دروازے اور چار دیواری کے ہوتے ہوئے دوسری طرف دیکھنا ممکن نہ تھا۔ کار کے ہارن کے جواب میں ایک طرف چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک چوکیدار نے باہر جھانک کر دیکھا۔

"کون ہے؟"

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا اور بولا: "ہم کو باہر آنے کا آرڈر نہیں ہے سر۔ آپ اپنا شناخت بتاؤ۔"

میں اپنی شناخت کیا بتاتا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس دروازے کے پیچھے کون رہتا ہے نہ میں اپنی آمد کا کوئی سبب بیان کر سکتا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بتانا تو ضروری تھا

"ان کو بولو امپیریل ہوٹل سے یوسف صاحب آئے ہیں۔" میں نے اُونچی آواز میں پکار کر کہا۔ تبھی کھڑکی بند ہو گئی اور دروازہ

www.pdfbooksfree.pk

پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بیزاری سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں چٹخانے میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹ خاموشی رہی اور پھر بڑا آہنی دروازہ کسی آواز کے بغیر آہستگی سے کھلنے لگا۔ میں نے ڈرائیور کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہماری ٹیکسی دروازے کے اندر داخل ہو کر ایک بل کھاتی ہوئی لمبی سی ڈرائیو وے پر چلنے لگی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آہنی دروازہ دوبارہ بند ہو چکا تھا اور وہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہمارے سامنے بھی تاریکی ہی تھی۔ یہ ایک پختہ راستہ تھا جس کے دونوں طرف باغ تھا اور اونچے اونچے درخت ایستادہ تھے۔ اس سڑک پر روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ ٹیکسی کی روشنی میں ہم اس طویل راستے پر آگے بڑھتے رہے لیکن، یہ پُراسرار ماحول اب میرے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس ماحول سے خوش نظر نہیں آتا تھا۔ جب کچھ اور نہ سوجھی تو وہ بے تابی سے پوچھنے لگا: "سر ابھی ہمیں کتنی دور اور جانا ہے؟"

"بھائی میں بھی تمہاری طرح پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ تم رفتار ذرا تیز کر دو۔ عمارت اب یہاں سے زیادہ دور نہیں ہو گی۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور ہم اچانک مہذب اور بارونق دنیا میں پہنچ گئے۔ ہمارے سامنے ایک پُرشکوہ اور خوبصورت دو منزلہ عمارت تھی جس کے کشادہ برآمدوں میں بجلی کے قمقمے جل رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے شاندار پورچ تھا جس میں دو قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ پورچ کے سامنے ایک خوشنما لان تھا جسے روشن کرنے کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوشنما دودھیا روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تمام ماحول بے حد خوابناک اور دلکش تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ باہر سے ویران اور بے رونق نظر آنے والی یہ جگہ اندر سے اس قدر دلکش اور نظر فریب ہو گی۔ پورچ کے سامنے ہماری ٹیکسی رُک گئی۔ نہ جانے کہاں سے ایک سفید وردی پوش ملازم برآمد ہوا اور اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر مجھے سلام کیا۔ ملازم سمارٹ اور نوجوان شخص تھا اور اس نے سفید وردی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں بھی سفید دستانے پہن رکھے تھے۔

میں نے ٹیکسی سے باہر نکل کر عمارت کا جائزہ لیا۔ یہ ایک قدیم عمارت تھی لیکن اس کی نگہداشت اس طرح کی گئی تھی کہ یہ قدیم طرز کی بالکل نئی تعمیر شدہ عمارت نظر آتی تھی۔ کشادہ اور اونچے اونچے برآمدوں میں بید کے صوفے ترتیب اور قاعدے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف اونچی سی سنگھار میز تھی جس پر ٹوپیاں اور کوٹ لٹکائے جا سکتے تھے۔ پہلی نظر میں اس پر کسی نواب یا راجہ کی رہائش گاہ کا گمان گزرتا تھا۔

ابھی میں نے قدم آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی آواز نے میرے اُٹھتے ہوئے قدم روک لیے۔

"سر، میرے لیے کیا حکم ہے؟" وہ مجھ سے دریافت کر رہا تھا۔ "مجھے فارغ کر دیں گے یا میں آپ کا انتظار کروں؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ یکایک مجھے ایک خیال سوجھا۔ ٹیکسی کا یہاں کھڑا رہنا مناسب نہ تھا اور میں اس دور دراز علاقے میں رات کی تاریکی میں سواری کے لیے کسی دوسرے کا محتاج رہنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے باوردی ملازم کو دیکھا جو تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا مجھ سے کافی آگے جا چکا تھا۔ ٹیکسی کے پاس جا کر سو سو روپے کے پانچ نوٹ میں نے ڈرائیور کے حوالے کئے تو حیرت اور خوشی کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تھینک یو سر" اس نے بڑی کوشش سے اپنی آواز نکالی: "مگر....."

"یہ تمہارا کرایہ بھی ہے اور انعام بھی۔" میں نے دبی زبان میں کہا: "تم جاؤ اور بڑے گیٹ سے کچھ فاصلے پر کسی درخت کی آڑ میں ٹیکسی کھڑی کر کے میرا انتظار کرو۔ یہ خیال رہے کہ سڑک پر سے گزرنے والوں کی نظر تمہاری ٹیکسی پر نہ پڑے۔"

"کتنی دیر تک انتظار کروں سر؟" اس نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے تمہیں ساری رات وہاں کھڑا رہنا پڑے۔ میں اس سے پہلے بھی فارغ ہو سکتا ہوں۔ بہرصورت جب

تک میں تمہارے پاس نہ پہنچوں تمہیں میرا انتظار کرنا ہے۔ واپسی پر میں تمہیں اتنی ہی رقم اور دوں گا۔"

اسے مزید لالچ میں مبتلا کرنے کے بعد اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں اسے حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر برآمدے کی طرف چل پڑا جہاں وردی پوش ملازم میرا منتظر تھا۔ میرے نزدیک پہنچنے پر اس نے آگے بڑھ کر چوبی دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں بلا جھجک دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ میرے پیچھے بے آواز بند ہو گیا اور ملازم دروازے کے باہر ہی رہ گیا۔ میرے سامنے ایک وسیع اور خوبصورت ہال کمرہ تھا جس کی دیواروں پر قیمتی پینٹنگز اور تصاویر سجی ہوئی تھیں۔ لکڑی کے خوبصورت فرش پر یہاں وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے اور اس ہال کمرے کے فرنیچر کو دیکھ کر قدیم زمانے کی انگریزی فلموں کے سیٹ یاد آ جاتے تھے۔ میں اس عالیشان کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کس طرف جانا ہے۔ میری یہ مشکل ایک بغلی دروازے سے اندر داخل ہونے والی خاتون نے حل کر دی۔ یہ سیاہ لباس میں ملبوس گورے رنگ اور متناسب جسم کی ایک خوش شکل عورت تھی جو سر پر انگریز خادماؤں کی طرح سفید کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجی: "کیا میں مسٹر یوسف سے مخاطب ہوں؟"

"ظاہر ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا: "اتنے کڑے چوکی پہرے کے اندر اور کون داخل ہو سکتا ہے؟"

"میرے ساتھ آئیے۔" اس نے میری شگفتہ گفتگو کا نوٹس لیے بغیر سنجیدگی سے کہا اور میرے آگے آگے چل پڑی۔ اگر اس کمرے میں تیز روشنی نہ ہوتی تو اس عورت پر کسی روح کا گمان گزرتا۔ وہ بالکل بے آواز قدموں کے ساتھ لچکتی ہوئی قیمتی قالینوں پر چل رہی تھی۔ سیاہ لباس اور سفید چہرے کی وجہ سے وہ کوئی پُراسرار آسمانی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کا دراز قد اور متناسب جسم سیاہ لباس میں اور زیادہ دلآویز نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے میری طرف دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ طویل کمرے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے اور ایک مختصر سے زینے پر چڑھنے لگے۔ راہداری کے علاوہ سیڑھیوں کی دیواروں پر بھی قیمتی اور خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں جن سے مکان کے مالک کی خوش ذوقی اور امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ سیڑھیوں پر ہلکے نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دس بارہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ بائیں جانب ایک گیلری میں مڑ گئی۔ جو زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن بہت دور تک چلی گئی تھی، مگر شکر ہے کہ اس نے مجھے گیلری کے آخری سرے تک لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ گیلری میں تیسرے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ رُکی اور دروازہ کھول کر مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا تو وہ میرے ساتھ ہی اندر آ گئی۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ اب ہم ایک وسیع اور خوبصورت بیڈ روم میں تھے۔ اسے بیڈ روم کہنا صرف اس لیے مناسب تھا کہ ایک جانب بہت کشادہ بیڈ موجود تھا۔ ورنہ اس کمرے کے سائز اور وہاں موجود قیمتی اور بے اندازہ فرنیچر کی موجودگی کی وجہ سے وہ ڈرائنگ روم بھی کہلا سکتا تھا۔ یہ کمرہ بھی قالینوں، پردوں اور تصاویر سے آراستہ تھا۔ کمرے میں صرف دو فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں جن پر بیک وقت سفید باریک پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس بیڈ روم کی آرائش جدید طرز کی تھی اور اس میں بیس سے زائد افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ بیڈ روم کے ایک گوشے میں کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے سجی ہوئی شراب کی بوتلیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس جگہ کو بار کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چھت پر قیمتی جھاڑ اور فانوس لگے ہوئے تھے اور دودھیا روشنی کی وجہ سے کمرے میں ایک عجیب طلسمی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

میں ابھی کمرے کا جائزہ لینے سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ میری راہبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ انتہائی نرم اور زیرِ لب آواز میں مجھ سے مخاطب تھی۔

"سر، آپ کے آرام کی ہر چیز یہاں موجود ہے اس کے باوجود اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو سامنے بیل موجود ہے۔"

اب مجھ سے مخاطب ہوئی تو پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

"مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔" میں نے صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔

"فرمایئے؟"

"اس شخص کی، جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں آرام کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ شاید تمہیں علم ہوگا کہ میرا یہاں آٹھ بجے ایک اپائنٹ منٹ ہے۔"

"سوری سر۔ میں نہیں جانتی مجھے یہی ہدایت ملی ہے کہ آپ کے آرام کا بندوبست کر دوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

یہ کہہ کر اس نے سر جھکا کر سلام کیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں تیزی سے صوفے سے اُٹھا اور دروازے پر پہنچ کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ میری توقع کے برعکس دروازہ مقفل نہیں تھا۔ دروازہ کھول کر میں نے باہر گیلری میں جھانکا تو وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اتنے کم وقت میں وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میرے سامنے صرف یہی ایک گیلری نہیں تھی۔ چاروں سمتوں میں مختلف گیلریاں تھیں اور متعدد دروازے۔ خدا جانے اس پُراسرار محل نما عمارت میں کتنے کمرے اور کتنی گیلریاں اور راہداریاں تھیں۔ میں کچھ دیر دروازہ کھول کر کھڑا رہا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ مجبوراً میں نے دوبارہ کمرے میں داخل ہو کر بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا۔ میرے قدم کھڑکیوں کی طرف بڑھے۔ سفید باریک پردوں کے پیچھے ایک خوبصورت لان نظر آ رہا تھا۔ تاریکی کے باعث میں اس کے نقش و نگار دیکھنے سے قاصر تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بھی عمارت کے باقیماندہ حصوں کی طرح قابلِ دید ہوگا۔ کھڑکی کی بلندی زمین سے زیادہ نہیں تھی۔ میں کھڑا یہ اندازہ لگاتا رہا کہ اگر مجھے اس کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی ضرورت پیش آئی تو کیا مجھے زیادہ مشکل پیش آئے گی؟ لیکن کھڑکی کے باہر پہنچنے کے بعد بھی اس قلعہ نما عمارت سے باہر نکلنا کچھ آسان نہ تھا یقیناً اس کی حفاظت کا بھی مناسب بندوبست ہوگا اور خدا جانے کتنے محافظ اس کی نگرانی پر مامور ہوں گے۔

ایک مترنم ہنسی کی آواز نے میرے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بار کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک خوش جمال عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دیکھنے میں وہ غیر ملکی نظر آتی تھی۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ ایک خوشنما مغربی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کے تراشیدہ سنہرے بال اس کے شانوں پر سونے کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا جو بدستور بند تھا۔ اگر دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوتا تو یقیناً مجھے اس کا احساس ہو جاتا لیکن اگر یہ عورت کمرے کے اندر موجود تھی تو مجھے اس کا علم تک نہ ہو سکا تھا۔

وہ میری حیرت کا اندازہ لگا کر محظوظ ہو رہی تھی۔ ایک دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی نیلی آنکھیں بلور کے ٹکڑوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن میرے پیر مجھے کشاں کشاں اس کے پاس لے گئے۔

وہ جب مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا لب و لہجہ خالص دیسی تھا اور اس میں غیر ملکی زبان اور لہجہ کا شائبہ تک نہ تھا۔

"مسٹر یوسف مجھے اپنے سامنے دیکھ کر آپ حیران ہو رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے" میں نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

وہ دلکشی سے اپنے بالوں کو جھٹک کر مسکرائی اور الماری سے ایک گلاس اُٹھاتے ہوئے بولی: "آپ کس چیز کا شوق فرمائیں گے۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس الماری میں دنیا بھر کی مشہور و معروف شرابیں موجود ہیں۔"

"جی ہاں۔ بوتلوں کی تعداد سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے لیکن مجھے ان کی اقسام کا علم نہیں ہے۔ شراب کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

وہ دوبارہ مسکرائی: "یہاں ہر قسم کی شراب کے ساتھ ان کے بارے میں معلومات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ جب آپ یہاں

سے رخصت ہوں گے تو آپ کی یہ کمی دور ہو چکی ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بوتل اُٹھائی۔

میں نے کہا "شاید آپ بھول رہی ہیں مس کہ میں یہاں شراب نوشی کرنے یا شراب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں ایک مصروف اور کاروباری آدمی ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ مہربانی ہوگی اگر مجھے جلد فارغ کر دیا جائے۔"

"آپ بہت جلدی میں نظر آتے ہیں۔" وہ ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ کر بولی: "لیکن کیا ہمارے مشرقی آداب اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ کسی معزز مہمان کی خاطر مدارات کے بغیر اسے رخصت کر دیا جائے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ان فضول روایات کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔ جب کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں بہت مصروف آدمی ہوں اور ضروری بات چیت کے بعد جلد سے جلد اس جگہ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔" پھر میں نے رُک کر اس کے سراپا پر نظر ڈالی۔ وہ ایک شاداب اور تندرست عورت تھی اور دیکھنے میں اس پر کسی مغربی عورت کا گمان گزرتا تھا "بائی دی وے" میں نے اسے مخاطب کر کے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں آٹھ بجے بلانے کا مقصد کیا ہے اور کون صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے وہ کوئی صاحب نہ ہوں بلکہ صاحبہ ہوں۔" وہ شرارت سے مسکرائی "اور پھر آپ یہ کیوں کر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو کوئی آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا وہ میں نہیں ہوں۔"

میں اس کے اندازِ گفتگو سے حیران رہ گیا۔ وہ پہیلیوں میں باتیں کر رہی تھی اور خواہ مخواہ بات کو طول دینا چاہتی تھی۔

"چلیئے۔ مان لیا کہ آپ ہی مجھ سے ملاقات کے لیے بے تاب تھیں۔ کیا اب آپ مجھے اس ملاقات کی غرض و غایت بتانا پسند کریں گی۔" "آپ جیسے لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔ میں کچھ وقت آپ کی کمپنی میں گزارنا چاہتی تھی اور پھر سنا ہے کہ آپ کی زندگی حوادث اور حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا آپ اپنی کسی مہم کا قصہ سنانا پسند کریں گے؟"

میں غصے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا: "دیکھئے محترمہ۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں یہاں مذاق کا نشانہ بننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ نہ میں کوئی داستان گو ہوں جو قصے کہانیاں سنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا لیکن جب میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو یہ دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا کہ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے میں اسی دروازے کو کھول کر باہر گیلری میں جا چکا تھا۔ میں نے برہمی سے پلٹ کر دیکھا تو وہ بار کے کاؤنٹر پر کھڑی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر یوسف" وہ شانے ہلا کر بولی: "میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ ہمیں مہمان نوازی کا موقعہ دیئے بغیر آپ یہاں سے رخصت نہیں ہو سکیں گے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے۔" میں نے برہمی سے پوچھا "کیا میں یہاں قیدی ہوں؟"

"ارے ارے۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اور قیدی؟ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ تو ہمارے معزز مہمان ہیں۔ اب آپ کچھ دیر کے لیے آرام اور سکون سے بیٹھ کر ہمیں اپنی خاطر تواضع کرنے کا موقعہ دیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بٹن دبایا اور کمرہ گھنٹی کی نقرئی آواز سے گونج اُٹھا۔ ایک باوردی ملازمہ کمرے میں داخل ہو کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔

"مہمان کے لیے کافی لاؤ۔ مگر بہت اچھی۔" اس نے ملازمہ کو حکم دیا اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے دروازہ پھر باہر سے مقفل ہو چکا ہوگا۔

بار کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت آہستگی سے چلتی ہوئی میرے نزدیک آگئی: "آپ تشریف رکھئے مسٹر یوسف۔ کچھ دیر

www.pdfbooksfree.pk

بعد آپ یہاں سے جانے کے لیے آزاد ہوں گے۔"

مَیں غصّے کو ضبط کرتے ہوئے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنی حکمتِ عملی میں تبدیلی پیدا کرنی چاہیے۔ اب جبکہ مَیں خود کو ایک محبوس قیدی محسوس کر رہا تھا یہ ضروری تھا کہ مَیں ان لوگوں کو دُرست بنانے کی کوشش کروں۔ مَیں نے صوفے کی پُشت سے ٹیک لگائی اور مُسکرا کر پُوچھا: "حیرت کی بات ہے کہ آپ نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"آپ نے پُوچھا ہی نہیں تو کیسے بتاتی۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

"چلیے۔ اَب تو پُوچھ لیا۔" مَیں نے مُسکرا کر کہا۔

"تو چلیے ہم بھی بتائے دیتے ہیں۔" وہ دلکش انداز میں اُوپر کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر مُسکرائی: "مُجھے صبوحی کہتے ہیں۔"

مجھے فقرہ چُست کرنے کا موقعہ مل گیا۔ مَیں نے کہا: "تو پھر صبوحی ہی رہیں۔ رات کے وقت لوگوں کو مخمور بنانے کی کوشش نہ کیا کریں۔"

وہ خاموشی سے مُسکراتی رہی۔

مَیں نے کہا۔ "غالباً آپ کے والدین کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ بڑی ہو کر آپ میخانہ بدوش ہو جائیں گی۔ تب ہی تو انھوں نے آپ کا نام صبوحی رکھا۔"

اس نے میری بات کا مطلق بُرا نہیں منایا۔ کہنے لگی: "نام تو محض نام ہی ہوتے ہیں مسٹر یوسف۔ ورنہ آپ کے والدین آپ کا نام یوسف نہ رکھتے۔"

"کیوں؟" مَیں نے بُرا ماننے کے انداز میں کہا: "کیا کمی ہے مجھ میں۔ صورت شکل سے یوسف نہیں لگتا؟"

"بہت غلط فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔" وہ شوخی سے بولی۔ اس اثناء میں دروازہ ایک بار پھر کھُلا اور مُلازمہ ایک ٹرے میں کافی لے کر اندر داخل ہوئی۔ "میز پر رکھ دو۔" صبوحی نے کہا: "ہم خود بنا لیں گے۔"

مُلازمہ کے جانے کے بعد وہ میز کے پاس جا کر کافی بنانے لگی۔ اس طرح کہ اس کی پُشت میری طرف تھی اور کافی کی ٹرے میری نظروں سے اُوجھل ہو گئی تھی۔

"کتنی چینی" اس نے چہرہ گھُما کر میری طرف دیکھا۔

"دو چمچے۔"

"اتنی زیادہ چینی پیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اتنی مٹھاس ہے آپ کی باتوں میں۔" وہ میری پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے بولی۔

مَیں صوفے سے اُٹھ کر میز کے پاس چلا گیا اور مَیں نے اپنی کافی کی پیالی ہاتھ میں اُٹھا لی۔ اس نے اپنی پیالی میں بھی دو چمچے اُنڈیلے اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ مَیں گول شیشے کی میز کے پاس قالین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ شرارت سے بولی: "ارے ارے۔ آپ تو قدموں میں ہی بیٹھ گئے۔ مَیں اتنی زیادہ عزت کی مستحق تو نہیں ہوں۔"

مَیں نے کہا: "ہو سکتا ہے مَیں ٹانگ کھینچنے کے لیے بیٹھا ہوں۔"

وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسی تو اسے اچانک اُچھو ہو گیا۔ پیالی کو میز پر رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف لپکی۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر مَیں نے اپنی پیالی اس کی پیالی سے بدل لی۔ یہ بات نہیں کہ مَیں نے اسے پیالی میں کچھ ملاتے ہوئے دیکھ لیا تھا بلکہ مَیں اپنی احتیاط پسند عادت سے مجبور تھا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ سُرخ انار کی طرح ہو رہا تھا۔ ی نے اس کی سُرخ و سفید رنگت کو کچھ اور زیادہ نکھار دیا تھا۔ مَیں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ ایک خوبصورت اور دار عورت کو اس طرح ضائع ہوتے دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہونے لگا تھا۔ مَیں نے آہستگی سے اپنی کافی کی پیالی

اُٹھائی اور اسے اپنے مُنہ تک لے گیا۔ لیکن پھر مَیں نے چمچہ ہلانے کے بہانے کافی کا گھونٹ لیے بغیر پیالی کو واپس میز پر رکھ دیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے کسی ہیجان یا اضطراب کا اظہار نہیں ہوا۔ یا تو وہ بے گناہ اور معصوم تھی اور یا پھر وہ ایک اعلیٰ درجے کی اداکارہ تھی۔ اس کے طرزِ عمل کے پیشِ نظر ان کے علاوہ کوئی اور رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ مُسکراتی ہوئی قالین پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس نے اپنی پیالی اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی۔ اس کے چہرے کے تاثر میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ چند گھونٹ میں اس نے کافی کی پیالی خالی کر دی۔ پھر میری طرف دیکھا اور حیرت سے بولی: "ارے۔ کیا آپ کو کافی پسند نہیں آئی؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" مَیں نے بہانہ کیا "مَیں دراصل کافی اور چائے کو ٹھنڈی کر کے پینے کا عادی ہوں۔"

"بہت چالاک ہیں آپ!" اس نے قالین سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ایک لمبی سی جماہی لے کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس نے بلّی کی طرح دو تین جماہیاں لیں اور پھر میز پر اپنا سَر رکھ دیا۔ چند لمحے بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت بالکل نارمل تھی۔ اس کے تراشے ہوئے سنہرے بال اس کے شانوں اور میز پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ اپنے ایک ہاتھ پر اپنا رخسار ٹکائے محوِ خواب تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی سریع الاثر بیہوشی کی دوائی کی برکت تھی جو یقیناً میرے لیے تیار کی گئی تھی۔ اگر مَیں اپنی احتیاط پسندی کے پیشِ نظر کافی کی پیالیاں نہ بدل لیتا تو اس وقت اس کی جگہ میں میز پر سَر رکھے سویا ہوتا لیکن وہ مجھے بے ہوش کیوں کرنا چاہتی تھی؟ اور وہ کون شخص تھا جس نے مجھے محض بیہوشی کی دوا پلانے کے لیے یہاں مدعو کیا تھا؟ مجھے بیہوش کرنے سے اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا؟ یہ سوالات میرے ذہن میں کُلبلا رہے تھے لیکن مَیں ان کا جواب نہیں پا سکا تھا۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ مَیں دبے پیر دروازے کی طرف گیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفّل تھا۔ کھڑکی کا جائزہ مَیں پہلے ہی لے چُکا تھا۔ یہ کھڑکی زمین سے زیادہ اُونچائی پر نہ تھی اور کھڑکی سے باہر کُودنا بھی دُشوار نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس پُراسرار محل نما مکان کے باہر اور کون کون سی قیامتیں میری منتظر تھیں؟ اور کیا مَیں اتنی آسانی سے اس محل نما زنداں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو سکتا تھا!

ابھی مَیں کھڑکی کے نزدیک کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ مَیں لپک کر بار کاؤنٹر کے نزدیک پہنچ گیا۔ بار کے عقبی حصّے کی دیوار کھسکتی ہوئی نظر آئی اور وہاں ایک چھوٹا سا دروازہ نمودار ہو گیا۔ گویا یہی وہ دروازہ تھا جس میں سے صبوحی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ میرے لیے حرکت کرنے کا موقعہ باقی نہیں رہا تھا اس لیے مَیں نے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہونے میں ہی عافیت جانی۔ دروازے کے اندر پہلے ایک مردانہ سَر نمودار ہوا اور پھر ایک ہٹّا کٹّا مرد اس میں داخل ہوا۔ وہ مسلّح تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک پستول تھام رکھی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نظر سب سے پہلے سامنے والی میز پر پڑی جس پر سَر رکھے ہوئے صبوحی مدہوش پڑی ہوئی تھی۔ صبوحی کو اس عالم میں دیکھ کر وہ بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے کسی اور طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اگر وہ گردن موڑ کر دیکھ لیتا تو تھوڑے ہی فاصلے پر مَیں اسے نہتّا اور بے سہارا کھڑا ہوا نظر آ جاتا۔ لیکن اس کی تمام تر توجہ صبوحی کی طرف مبذول تھی اور یہ میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے کہیں زیادہ پھُرتیلا اور چُست تھا۔ کسی سپرنگ دار گیند کی طرح اُچھلتا ہوا وہ صبوحی کے نزدیک جا پہنچا اور جُھک کر اس کو دیکھنے لگا۔ یہی موقعہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ مَیں نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور جس وقت اسے میری موجودگی کا احساس ہوا مَیں اس کے بالکل نزدیک پہنچ چُکا تھا۔ مَیں نے اسے پلٹنے کی مُہلت نہیں دی۔ میرے کھُرے ہاتھ کی ضرب اس کی گردن پر لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ مَیں نے تیزی سے مُڑ کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دروازے میں کوئی اور نہیں تھا لیکن اس دروازے کے راستے میرا باہر جانا کسی طرح بھی قرینِ عقل نہ تھا۔ یہ راستہ یقیناً ان لوگوں کے بھٹکنے تک جاتا ہو گا اور میرا اس راستے سے باہر جانا کسی طرح بھی سود مند ثابت

www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہو سکتا تھا۔ مَیں لپک کر دروازے کی طرف گیا اور مَیں نے دروازہ بند کر دیا۔ تلاش کرنے پر نچلے حصّے میں مجھے ایک کھٹکا بھی نظر آ گیا جسے لاک کرنے سے یہ دروازہ اندر سے بند ہو سکتا تھا۔ مَیں فی الحال کسی اور نووارد کی آمد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے دروازہ بند کرنے کے بعد مَیں بے ہوش آدمی کے پاس پہنچا اور اس کا پستول اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ پستول بھرا ہوا تھا اور بوقتِ ضرورت میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

مَیں صوفے کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے فرار کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یکایک مجھے ایک ترکیب سُوجھی۔ مَیں نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کہیں دُور نقرئی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد کمرے کا مین دروازہ کھُلا اور سیاہ چُست لباس میں ملبوس خادمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا مگر جب اس کی نظر مجھ پر اور میرے پستول پر پڑی تو حیرت اور خوف سے اس کا سانس رُک گیا۔ مَیں نے اس کے مُنہ پر احتیاطاً ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ چیخ مار کر سب کو ہوشیار نہ کر دے۔ اس نے ذرا بھی جدّوجہد نہیں کی۔ دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد مَیں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"سَر" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "آپ مجھ سے ناراض کیوں ہو گئے؟"

مَیں نے اس کے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ "ابھی تو ناراض نہیں ہوں لیکن اگر تم نے آواز نکالی یا کوئی چالاکی کی تو میری یہ ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے کافی ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے چُپ چاپ دیکھتی رہی۔

"یہ بتاؤ کہ حفاظت اور اطمینان کے ساتھ اس گھر سے باہر جانے کا راستہ کون سا ہے اور مَیں اس عمارت کی چار دیواری کے باہر کیسے جا سکتا ہوں؟"

وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو۔ مَیں نے پستول کی نالی اس کی پسلیوں میں چھبو دی تو وہ اُچھل پڑی: "جلدی بولو۔ مَیں باہر جانا چاہتا ہوں۔ مَیں ایسا راستہ چاہتا ہوں جہاں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔"

"آئیے میرے ساتھ" وہ دبی زبان میں بولی اور مَیں اس کی متوالی چال دیکھتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے دروازے کا لاک کھولنا چاہا تو مَیں نے اسے روک دیا: "یہ کیا کرتی ہو۔ باہر خطرہ ہے۔"

"باہر اس طرف کوئی نہیں ہے سَر" اس نے دھیمی آواز میں کہا: "مجھ پر بھروسہ رکھئے اور میرے ساتھ آئیے۔"

مَیں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں سچائی کی تحریر پڑھ لی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ دروازے سے باہر نکل کر ہم گیلری میں پہنچے اور وہاں سے زینہ اُتر کر بڑے ہال کی طرف جانے لگے۔ ابھی تک ہمارا کسی اور سے سامنا نہیں ہوا تھا لیکن مَیں ہر لمحہ ہوشیار تھا۔ اچانک جنوبی سمت کا ایک دروازہ کھُلا اور مجھے اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ چھُپنے کی جگہ تلاش کرتا۔ میرے قدم اسی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے اور پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ دروازے سے اندر آنے والا ایک تنومند اور جسیم محافظ تھا جو ہتھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں دو پستول لٹک رہے تھے، ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ پتلون کی بیلٹ میں دو دستی بم بھی مجھے نظر آ گئے تھے۔ اس شخص نے مجھے اور خادمہ کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں پھر وہ ادب سے سر جھکا کر سامنے والے ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لیے میرے قدموں اور ہاتھ پیروں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میرے ہاتھ پیر بالکل بے جان اور سرد ہو گئے تھے۔ اگر وہ شخص گڑبڑ پر آمادہ ہو جاتا تو میرے لیے جان بچانے کی گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن وہ مجھے نظر انداز کر کے یوں گزر گیا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس کا یہ رویّہ میرے لیے حیرانی کا باعث تھا لیکن خادمہ نے مجھے مزید غور کرنے کی مہلت نہیں دی اور مجھے ادب سے اشارہ کر کے دوبارہ میرے آگے آگے چلنے لگی۔ دو تین کمروں اور گیلریوں سے گزرنے کے بعد ہم بڑے برآمدے میں آ گئے۔ یہ وہی برآمدہ تھا جس کے سامنے کچھ دیر پہلے دو تین قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہاں صرف ایک کار موجود تھی۔ چوکیدار قسم

www.pdfbooksfree.pk

کی کوئی چیز آس پاس موجود نہ تھی۔ خادمہ نے مجھے کار کے پاس پہنچا کر چھوڑ دیا اور خود پلٹ کر واپس جانے لگی۔

"رُک جاؤ۔" میں نے اسے پستول کی زد میں لے لیا۔" تم ابھی نہیں جا سکتیں جب تک کہ میں گھر سے باہر نہ پہنچ جاؤں۔"

اتنا کہہ کر میں نے اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سٹیرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ چابی کار کے اندر ہی لگی ہوئی تھی۔ خادمہ کسی پس و پیش کے بغیر کار کی اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئی تھی۔ اس کا پُرسکون اور مطمئن انداز میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے قطعاً خوف زدہ نہیں ہے۔ اس کے چہرے سے حیرانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی گاڑی سٹارٹ بھی نہیں کی تھی کہ برآمدے میں ایک دروازہ کھلا اور بٹلر نما ملازم نکل کر باہر آیا۔ وہ سیدھا کار کی طرف آیا۔ میں اس موقعہ پر کسی کی مداخلت اور کسی بھی قسم کی تاخیر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے کار سٹارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھائی۔ بٹلر کار کے نزدیک آچکا تھا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اس نے میری راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میں بلا دریغ اس پر کار چڑھا دوں گا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جب کار تیزی سے اس کی طرف بڑھی تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور کُود کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر اس نے چند لمحے کی بھی تاخیر کر دی ہوتی تو وہ یقیناً کار کی زد میں آجاتا لیکن اس نے مجھے روکنے یا شور مچانے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ بلکہ حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

کار تیزی سے مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر چوکیدار نے دروازہ کھولنے میں پس و پیش کیا تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ چوکیدار پوری طرح مسلح تھا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے پستول کا استعمال ضروری تھا لیکن جب کار مین گیٹ کے نزدیک پہنچی تو میں نے چوکیدار کو دیکھا جو جھانک کر کار میں سوار مسافروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھنے کے بعد کسی تاخیر کے بغیر خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔ یہ مرحلہ اتنا آسان ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ شاید یہ میرے برابر بیٹھی ہوئی خادمہ کی موجودگی کی برکت تھی کہ بٹلر اور چوکیدار دونوں نے بلا روک ٹوک ہمیں جانے کی اجازت دیدی تھی۔ مین گیٹ سے باہر پہنچ کر میں نے ایک دم کار کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ لیکن سامنے سے آنے والی کاروں کی تیز روشنیوں کو دیکھ کر مجھے رُک جانا پڑا۔ میں نے احتیاط کے طور پر اب تک کار کی روشنیاں نہیں جلائی تھیں اور یہ میرے لیے سود مند ثابت ہوا۔ میں نے تیزی سے کار کو ایک طرف موڑ کر سڑک سے نیچے اُتارا اور درختوں کی آڑ میں کھڑا کر دیا۔ پستول پر میری گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خادمہ کو وارننگ دینا بھی ضروری سمجھا۔" دیکھو۔ کان کھول کر سُن لو۔ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی یا آواز نکالنے کی کوشش کی تو تمہاری جان کی خیر نہیں ہے۔"

خادمہ نے بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد سامنے سڑک پر سے دو پولیس کاریں تیزی سے گزریں اور اس عمارت کی طرف غائب ہو گئیں جہاں سے میں ابھی آیا تھا۔ پولیس کا اس پُرسکون اور پُرشوکت محل نما مکان میں کیا کام ہو سکتا تھا اور اسے کس نے اور کس غرض سے طلب کیا تھا؟ یہ سوچنا ضروری تھا لیکن میں وقت ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس لیے اپنی کار کو اسی جگہ چھوڑ کر میں باہر نکلا۔ میں نے کار کے ایک پہیئے کی ہوا نکال دی اور پھر خادمہ سے مخاطب ہوا۔" جب تک میں دوبارہ نہ آؤں تم خاموشی سے اسی جگہ بیٹھی رہنا۔ اگر میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ سمجھ گئیں۔"

"جی سر۔" وہ سر ہلا کر بولی۔" لیکن سر یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور......"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا اور وہ سہم کر رہ گئی۔ میں نے پستول ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور تیزی سے سڑک کے کنارے اس طرف بڑھا جہاں میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی کو ہونا چاہئے تھا۔ ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے اس ٹیکسی ڈرائیور نے میری بات کو اہمیت نہ دی ہو اور واپس چلا گیا ہو۔ ایسی صورت میں عقلمندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں کار کو استعمال کروں لیکن پولیس کو دیکھ کر میں نے اس فیصلے پر نظر ثانی کر ڈالی۔ پولیس چوری کی کار کو تلاش کرتی ہوئی

میرے تعاقب میں آسکتی تھی جب کہ ٹیکسی میں سوار ہونے کی صورت میں میرے پولیس کی نظروں میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ چنانچہ میں نے یہ رسک لینے کو ترجیح دی۔ کار سے کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ میں ذرا سا بھی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ زیادہ دُور نہیں گیا تھا جب میری تیز نظروں نے ایک طرف درختوں کی اوٹ میں کھڑی ہوئی ٹیکسی کو دیکھا اور میں خوش ہو کر ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ ٹیکسی اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی اور سڑک پر سے گزرنے والوں کے لیے اس کو دیکھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تمام شیشے چڑھائے ہوئے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کو جگانے کے لیے مجھے زور زور سے شیشوں پر دستک دینی پڑی۔ وہ گھبرا کر بیدار ہو گیا مگر جب ہوش و حواس بحال ہوئے اور مجھے دیکھا تو اس نے مسکرا کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"فوراً۔ بہت تیزی سے ہوٹل واپس چلو۔" میں نے پچھلے شیشے میں سے جھانکتے ہوئے اسے ہدایت دی اور وہ دوسرے ہی لمحے ہَوا ہو گیا۔ شاید وہ بھی اب میری پُراسرار حرکات سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکسی چلاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ رقصاں تھی۔

میں بار بار مُڑ کر پیچھے دیکھتا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی کار ہمارے تعاقب میں نہ آرہی ہو لیکن یہ معمّہ ابھی تک میری فہم سے باہر تھا کہ آخر پولیس کو کس نے طلب کیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ گھریلو ملازموں یا بٹلر نے پولیس کو فون کر کے بُلایا ہو مگر اتنے کم وقت میں پولیس کا وہاں پہنچ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم غیر آباد اور ویران راستوں سے گزر کر شہر کے بارونق نواح میں داخل ہو گئے۔ ایک ریسٹورنٹ کی چمکتی ہوئی روشنی دیکھ کر میں نے ٹیکسی روکنے کی ہدایت کی اور ریسٹورنٹ کے اندر چلا گیا۔ مجھے گرم چائے یا کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہوٹل میں براہِ راست پہنچنے سے پہلے میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں جانے میں میرے لیے کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ پہلی ہی بیل پر ڈمپل والی لڑکی نے فون اُٹھا لیا۔" ہیلو ہوٹل امپیریل۔" میں نے اپنا تعارف کرایا اور پُوچھا کہ کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا۔

وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔" سر ہوٹل سے آپ کے چیک آؤٹ ہونے کے بعد کوئی آپ سے ملنے نہیں آیا۔ نہ کوئی فون آیا۔"

"چیک آؤٹ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

وہ ہنس پڑی۔" چیک آؤٹ سے کیا مطلب ہو سکتا ہے سر۔ آپ کے دوست آپ کا بل ادا کر کے آپ کا سامان لے گئے تھے۔ میں نے آپ کو باہر کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ کم از کم خدا حافظ کہنے ضرور آئیں گے مگر شاید آپ جلدی میں تھے۔"

اس کی شوخ آواز میں شکایت تھی لیکن اس وقت اس کی شکایت سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ میرے لیے یہ خبر بہت اہم تھی کہ کوئی شخص میرا دوست بن کر ہوٹل سے میرا سامان لے کر رُخصت ہو گیا تھا اور وہ ہوٹل والوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں بذاتِ خود باہر کار میں موجود ہوں لیکن وہ کون شخص ہو سکتا ہے؟ کیا یہ وہی آدمی ہے جس نے ہوٹل میں میرے کمرے کی تلاشی لی تھی اور میرا بریف کیس لے کر رُخصت ہو گیا تھا۔ یا یہ کوئی دوسرا کیریکٹر تھا؟ لیکن کسی شخص کو ہوٹل سے میرا سامان لے جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ سوٹ کیس میں کچھ رقم موجود ضرور تھی لیکن اس رقم کی خاطر کوئی شخص اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"ہیلو سر۔ آر یو آن دی لائین؟" لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں ہاں۔ آف کورس۔" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"میں سمجھی تھی آپ نے فون بند کر دیا۔ اگر ہم لوگوں سے کوئی شکایت ہے تو ہمیں معاف کر دیں سر۔ اگلی بار ہم آپ کی شکایت

www.pdfbooksfree.pk

دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔" وہ کھنکھناتی ہوئی آواز میں مجھ سے مخاطب تھی۔

"اوہ نہیں۔ بالکل نہیں۔ شکایت کی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل مجھے فوری طور پر واپس جانا پڑ رہا ہے اس لیے....."

"آپ کے دوست نے بھی یہی کہا تھا سَر۔ ان کے ہاتھ میں تو رات کی فلائیٹ کے ٹکٹس بھی تھے۔"

میرا دوست؟ فلائٹ کے ٹکٹس!! میرے فوری واپس جانے کا بہانہ؟! میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال۔ رسمی گفتگو کے بعد مَیں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ لڑکی مجھ سے خاصی بے تکلف ہو کر باتیں کر رہی تھی لیکن میرا ذہن کسی اور گورکھ دھندے میں اُلجھا ہوا تھا۔

فون بند کرنے کے بعد مَیں نے کافی کا آرڈر دیا اور گذشتہ چند گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ شوکت کا وقتِ مقررہ پر نہ پہنچنا۔ ہوٹل میں میرے کمرے کی تلاشی اور بریف کیس کا غائب ہو جانا۔ پُراسرار ٹیلی فون کال اور اس پُراسرار محل نما مکان میں جانے کی دعوت۔ اُس گھر میں مجھے کافی میں ڈال کر بیہوشی کی دوا پلانے کی کوشش اور پھر ہوٹل سے میرے دوست کے بہروپ میں کسی کا میرا سامان لے کر چلا جانا۔ یہ سب مسائل غور طلب تھے لیکن باوجود کوشش کے میرا ذہن ان کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان میں سے کسی سوال کا بھی میرے ذہن کے پاس جواب نہیں تھا۔ گرم کافی کی دوسری پیالی پینے کے بعد بھی میرا ذہن رواں نہیں ہوا تو مَیں نے سوچنے کی کوشش ہی بند کر دی۔

ٹیکسی والا کابلی کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مجھے نہ جانے کس قسم کا آدمی سمجھ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے مَیں اس کے خیال میں کوئی سی۔آئی۔ڈی افسر تھا یا پھر کوئی جرائم پیشہ شخص کیونکہ میرا تمام برتاؤ پُراسرار اور غیر معمولی تھا۔ مَیں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو روپے نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"تھینک یو سَر" وہ خوش ہو کر چہکا۔ "اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" اتنی معقول رقم وصول کرنے کے بعد وہ میرے لیے ہر خدمت بجا لانے کو کمربستہ نظر آرہا تھا۔

"مجھے کسی ہوٹل میں چھوڑ دو۔" مَیں نے پُرسکون آواز میں کہا

"مگر سَر۔ آپ کا وہ ہوٹل۔"

"فضول سوالات مت کرو" مَیں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں کس نے بتایا کہ مَیں اُس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں؟"

وہ بوکھلا گیا: "کسی نے بھی نہیں سَر۔ یوں ہی میرا خیال تھا۔"

"اپنے خیالات اپنے پاس رکھو اور مجھے کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں پہنچا دو!" مَیں نے ڈانٹ کر کہا۔

"بہتر ہے سَر" وہ مؤدب ہو کر بولا۔

اور ہم نے دوبارہ آبادی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یکایک دو کاریں نہایت تیزی کے ساتھ برابر سے گزریں اور اچانک ہماری ٹیکسی کے سامنے پہنچ کر رُک گئیں۔ اگر ٹیکسی کی رفتار کم نہ ہوتی اور ڈرائیور پوری طرح چوکنّا نہ ہوتا تو ہماری ٹیکسی یقیناً کاروں سے ٹکرا جاتی۔ مَیں نے غصّے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ کاروں میں سے چار انتہائی تنومند اور طاقت ور آدمی باہر نکلے اور تیزی سے ٹیکسی کی طرف آئے۔ ان میں سے دو کے پاس پستول اور ایک کے پاس سٹین گن تھی۔

"باہر نکلو" ان میں سے ایک نے دُرشت لہجے میں کہا "جلدی کرو۔"

میرا ایک ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے پستول کی طرف بڑھنے لگا لیکن پھر مَیں نے ارادہ بدل دیا۔ سٹین گن کی نالی میرے چہرے سے محض چند فٹ کے فاصلے پر تھی اور میری ذرا سی حرکت بھی اس خونخوار درندے کو مشتبہ کر سکتی تھی۔ ایسی صورت میں میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور سہم کر دُبکا ہوا بیٹھا تھا۔ مَیں چُپ چاپ ٹیکسی سے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور اس کے اشارے پر

خاموشی سے ایک کار کی طرف چل پڑا۔ مجھے اس نے کار میں بیٹھنے کا حکم دیا اور مَیں نے اس کی تعمیل میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ میرے بیٹھنے کے فوراً بعد سٹین گن والا میرے برابر بیٹھ گیا لیکن اس طرح کہ اس نے سٹین گن اپنے گھٹنوں پر رکھ لی اور جیب سے ایک پستول نکال کر میرے پہلو سے لگا دیا۔ دوسرا پہلوان نما آدمی بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو تیسرے نے کار کا سٹیرنگ سنبھالا اور ہماری کار تیزی سے چل پڑی۔ چوتھے آدمی نے دوسری کار میں ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ مَیں چُپ چاپ بیٹھا اس نئی آفتِ ناگہانی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں اور انھیں میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟ وہ تینوں بالکل خاموش پتھر کے بتوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے

"آپ کے پاس سگریٹ ہو گی؟" مَیں نے اپنے برابر والے سے پُوچھا۔

اس نے انکار میں سَر ہلا دیا۔ باقی دو بالکل خاموش رہے۔ انھیں مخاطب کرنے کے لیے میری پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔

"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" مَیں نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ چھیڑنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی کسی نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی اور اگر مَیں کسی طرح کار کا دروازہ کھول کر چلتی گاڑی سے باہر کودنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تب بھی میرے شدید زخمی ہونے کا امکان تھا اور بفرضِ محال اگر کوئی معجزہ مجھے زخمی ہونے سے بچا لیتا پھر بھی پیچھے آنے والی کار سے بچ نکلنا خاصا دشوار بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ مَیں ان لوگوں کو باتوں میں لگا کر ان سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنے کی فکر میں تھا اس لیے کہ اب تک مَیں اس کارروائی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور نہ مجھے یہ معلوم ہو سکا تھا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو مجھے زبردستی اغوا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس حرکت کا سبب جاننا بھی میرے لیے ضروری تھا۔

"دیکھو بھائی" مَیں نے ایک بار پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی کو مخاطب کیا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مَیں اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں۔ مَیں یہاں کسی سے واقف نہیں ہوں۔ نہ کسی سے میری دوستی ہے اور نہ دشمنی۔ شاید تم نے مجھے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لیا ہے۔"

اتنی لمبی تقریر کے جواب میں بھی خاموشی کے سوا مجھے کچھ اور نہ ملا۔ فی الحال ان کے چنگل سے نکلنے کے تمام راستے مسدود نظر آرہے تھے اور مجھے فرار کی کوئی راہ نہیں سُوجھ سکی تھی۔ مَیں نے ذرا آگے کو جُھک کر یہ ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ پستول کی نالی سے مَیں کس حد تک محفوظ رہ سکتا ہوں۔ میرے حرکت کرتے ہی میرے برابر بیٹھے ہوئے ڈراؤنی شکل کے آدمی نے اپنے دوسرے ہاتھ کو حرکت دیئے بغیر اپنی کہنی میرے پیٹ میں ماری اور یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ تکلیف سے دوہرا ہو گیا۔ مَیں نے ایک تکلیف دہ آہ کو بہت مُشکل سے اپنے ہونٹوں سے خارج ہونے سے روکا۔ مَیں ان پر اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہنی کی یہ ضرب انتہائی زوردار اور مُہلک تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اگر مَیں نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ چُپ چاپ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ جاتا اور آنے والے واقعات کا انتظار کرتا' اور مَیں نے ایسا ہی کیا۔

کار مختلف سڑکوں پر سے گزر رہی تھی جن میں سے کچھ بارونق تھیں اور کچھ ویران۔ تقریباً دس منٹ تک سفر کرنے کے بعد کار ایک نسبتاً کم آباد اور ویران راستے پر پہنچ گئی۔ مَیں نے اپنی گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن مجھے بخوبی علم تھا کہ ہمارے پیچھے دوسری کار بھی ایک مناسب فاصلے سے آرہی ہے۔ چند اور ہیر پھیر کے راستوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی سڑک پر پہنچے جس کے دونوں طرف حدِ نظر تک سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے اور اُونچے اُونچے درخت گویا پاسبانی کے لیے ایستادہ تھے۔ یہ سڑک کچھ دُور جانے کے بعد سبزہ زار میدانوں کے درمیان گھر گئی۔ یہاں تک کہ کچھ فاصلے پر مجھے ایک بُلند و بالا پتھروں کی بنی ہوئی وسیع و عریض حویلی نما عمارت کے آثار نظر آنے لگے۔ اس عمارت

www.pdfbooksfree.pk

کے آس پاس دُور دُور تک سبزہ زار اور ہرے بھرے گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی اور عمارت دُور دُور تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ پُختہ پتھروں اور اینٹوں کی سڑک پر سے ہوتے ہوتے ہماری کار عمارت کے صدر دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گئی۔ پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں آدمی پھرتی سے کُود کر باہر نکلے۔ اب ان میں سے ایک نے سٹین گن سنبھال لی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بدستور پستول تھا۔ مَیں نے بچاؤ کی آخری کوشش کے طور پر پستول والے دیو ہیکل شخص کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ کار سے نکل کر جب ہم عمارت کی طرف بڑھے تو مَیں ان کے آگے آگے تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ پستول والا شخص مجھ سے پانچ قدم پیچھے تھا۔ یکایک مَیں چلتے چلتے رُک گیا اور اس ناگہانی افتاد کی وجہ سے میرے پیچھے آنے والا بے ساختہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ مَیں نے اپنی داہنی کہنی کو حرکت دی اور وہ اس کے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر مَیں نے اس کے پیٹ میں تین چار زبردست گھونسے رسید کئے اور پھر اس کے جبڑے پر کراٹے کا ہاتھ رسید کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر اتنی دیر میں سٹین گن والا آدمی میرے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوا سٹین گن کا دستہ پُوری طاقت سے میری گردن پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ مَیں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر ایک سیاہ اور سُرخ پردہ میری نگاہوں کے سامنے آویزاں ہو گیا اور مَیں بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو مَیں ایک شاندار اور نفاست سے سجے ہوئے وسیع کمرے کے ایک صوفے پر دراز تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر چھت سے لٹکے ہوئے ایک شیشے کے فانوس پر پڑی جو اپنی سجاوٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے لاجواب تھا۔ فانوس میں بلب روشن تھے جس سے مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ مَیں کافی دیر بیہوش رہنے کے بعد رات کے وقت ہوش میں آیا تھا۔ مَیں فوراً صوفے پر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری گردن میں ہلکی سی دُکھن اس بات کی یاد دہانی کرا رہی تھی کہ مجھے کسی نے زوردار ضرب لگائی تھی لیکن اس کے سوا مجھے کوئی اور تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرا لباس صاف ستھرا تھا اور جُوتوں پر گرد کا نام و نشان تک نہ تھا گویا ان لوگوں نے مجھے نہایت حفاظت اور انصرام کے ساتھ اس جگہ لا کر لٹا دیا تھا۔ کمرہ خاصا وسیع اور کشادہ تھا اور جدید ترین آرائش اور فرنیچر کی خوشنما ترتیب نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر قیمتی تصاویر آویزاں تھیں۔ ایک جانب بیڈ نما کوچ بھی پڑی ہوئی تھی۔

میرے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہی ایک عقبی دروازہ کھُلا اور ایک مُلازمہ کمرے میں اس طرح داخل ہوئی جیسے کسی ریموٹ کنٹرول کی مدد سے اسے میرے ہوش میں آنے کا عِلم ہو چکا ہو۔ وہ سَر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس تھی اور ایک تندرست اور خوبصورت عورت تھی۔ وہ مؤدب انداز میں آگے بڑھی اور میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی: "سر۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔ مَیں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

اس کا یکایک یوں نمودار ہونا اور پُر تکلّف زبان میں گفتگو کرنا مجھے اتنا مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ اس سنگین صورتِ حال کے باوجود مَیں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ حیرت سے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتی رہی۔ جب میرا قہقہہ رُکا تو وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی: "سر۔ مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو حکم کریں وہ آپ کی خدمت میں حاضر کر دی جائے گی۔"

مَیں نے ایک لمحہ اسے دیکھا پھر کہا: "مجھے تمہارے مالک کی فوری ضرورت ہے۔ اُنھیں فوراً میری خدمت میں حاضر کرو۔"

وہ پہلے تو مجھے حیرت سے دیکھتی رہی پھر سَر جھکا کر سلام کیا اور کمرے سے رُخصت ہو گئی۔ مَیں دیواروں پر لگی ہوئی بیش قیمت تصاویر دیکھنے لگا۔ ان میں دُنیا کے مختلف عظیم مصوّروں کی بنائی ہوئی پینٹنگز تھیں۔ کچھ تصاویر مناظر سے متعلق تھیں اور کچھ میں خوبصورت خواتین کی تصویر کشی کی گئی تھی لیکن یہ بات قابلِ ذکر تھی کہ زیادہ تر تصاویر نیم عُریاں تھیں۔ اگرچہ اُنھیں "آرٹ" کا نمونہ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ کھُلم کھُلا فحاشی کے ضمن میں آتی تھیں۔ بعض تصاویر اتنی جامع اور مکمل تھیں کہ ان

پر حقیقت کا گُمان گزرتا تھا۔ مَیں ان تصاویر کو دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے ایک بار پھر عقبی دروازہ کھُلنے کی آواز سُنائی نہیں دی۔ خوشبوؤں سے بھرا ہوا ایک جھونکا کمرے میں داخل ہوا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ خوشبو بہت نفیس تھی۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک حسین اور طرح دار عورت کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ درحقیقت ایک بے حد خوبصورت اور دلکش عورت تھی۔ عُمر اس کی تیس بتیس کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن عُمر نے اس کے سراپا میں ایک وقار پیدا کر دیا تھا۔ وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس ایک مجسّمے کی طرح میرے سامنے ایستادہ تھی۔ سیاہ لباس میں اس کا سنگِ مرمر جیسا سفید پیکر ایک دلفریب منظر پیدا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں دوستانہ تاثرات کا پَرتو۔ اس کے کٹے ہوئے سنہری بال اس کے شانوں پر پڑے ہوئے تھے جنہیں وہ تھوڑی دیر کے بعد ایک ہاتھ سے سمیٹنے کی کوشش کرتی تھی اور اس کوشش میں اس کے بال مزید بکھر جاتے تھے۔ زیور کے نام پر اس کے گلے میں ایک سیاہ موتیوں کے لاکٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک سیاہ گھڑی تھی۔ اس کی مُسکراتی ہوئی آنکھوں کی رنگت شربتی تھی۔ وہ ایک سحر آفریں خوشبو میں بسی ہوئی تھی جس سے تمام کمرہ مہک اُٹھا تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھی اور پُوچھنے لگی: "کہئے آپ کا معائنہ مکمل ہو گیا؟ کتنے نمبر ملے ہیں مجھے؟"

اس کی آواز میں ایک انوکھی قسم کی مٹھاس مگر بھاری پن تھا۔ وہ باریک آواز نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس میں ایک دلکشی اور کشش تھی۔ اپنے انداز اور طرزِ گفتگو سے وہ ایک آزاد خیال اور خود مختار عورت معلوم ہوتی تھی جو عام طور پر حکم جاری کرنے میں یقین رکھتی ہیں اور کسی دوسرے کے حکم کی تعمیل کرنے کی عادی نہیں ہوتیں۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" مَیں نے اخلاقاً کہا۔

"مَیں جانتی تھی مُلاقات پر ایسا ہی ہو گا۔ ظاہر ہے تمہیں مجھ سے مل کر خوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور ایک ریشمی صوفے پر براجمان ہو گئی۔ جب وہ چند قدم چلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی چال بھی اس کے باقی سراپا کی طرح دلکش اور خوبصورت تھی۔ وہ ایک حسین عورت تھی لیکن اس کے باوجود اسے نازک اندام نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا متناسب جسم کسی اتھلیٹ کے جسم کی طرح سرو قامت اور مضبوط تھا اور اس کی رنگت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آؤٹ ڈور زندگی کی عادی ہے اور کافی وقت آسمان کے نیچے کھُلے میدانوں میں گزارتی ہے۔ مَیں بعض ایسی عورتوں کو بھی جانتا تھا جو کھیلوں میں دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی عورت کے بارے میں بھی مجھے علم تھا جو شکار کی شوقین تھی۔ یہ خاتون بھی مجھے اسی قماش کی نظر آ رہی تھی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ مَیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔

مَیں خاموش اسے دیکھتا رہا۔

وہ بولی: "اس شہر میں تمہاری آمد کے ساتھ ہی مجھے خبر مل گئی تھی۔ تمہاری مصروفیات کے بارے میں بھی مجھے پَل پَل کی خبر ہے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ تم نے ہوٹل میں قیام کرنے کا فیصلہ کیوں کیا جب کہ تمہیں یہ بھی عِلم ہے کہ تم وہاں زیادہ محفوظ نہیں رہو گے۔"

"ہوٹل میں نہ ٹھہرتا تو اور کہاں جاتا؟"

"اچھا۔ تو یہ بات ہے۔" وہ شرارت سے ہونٹ کو دانتوں میں داب کر مُسکرائی۔ "ہوٹل کے سوا تمہیں کوئی اور رہنے کی جگہ نہ سوجھی۔" اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگی: "اس گھر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ مجھے "تم" سے مخاطب کر رہی تھی جب کہ مَیں نے اسے آپ کہہ کر خطاب کیا تھا۔ اس کا یہ انداز مجھے پسند نہیں آیا۔

"گھر تو بُرا نہیں ہے۔" مَیں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "مگر دُور بہت ہے۔"

"دُوریاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔" وہ پھر مُسکرائی۔ "کوشش کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا اور پھر آج کے جدید

www.pdfbooksfree.pk

زمانے میں تو فاصلہ انسانوں کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان چاند ستاروں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ کونسا فاصلہ ہے جو آج کا انسان طے نہیں کرسکتا۔" وہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں کو جھٹک کر بولی۔" کیا پیو گے؟ کافی، چائے، کوکا کولا یا کوئی ہارڈ ڈرنگ؟"

"میرے لیے کوک ہی کافی ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

"بچوں کے مشروب پینے کے شوقین کب سے بن گئے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے صوفے کے ساتھ فرش پر لگا ہوا بٹن اپنے پیر سے دبایا۔

مجھے اس کی گفتگو سے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ وہ مجھ پر کسی اور کا گمان کر رہی تھی لیکن جب تک مجھے تمام حالات و کوائف کا علم نہ ہو جائے میرے لیے یہی مناسب تھا کہ اس کی غلط فہمی قائم رہے۔

وہی ملازمہ اندر داخل ہوئی جسے میں نے مالک کو بلانے کا حکم دیا تھا۔ "سبینا۔" وہ اس سے تحکمانہ اور بارعب انداز میں مخاطب ہوئی۔" چاشی کو بھیجو۔"

ملازمہ ادب سے سر جھکا کر رخصت ہو گئی۔ اب وہ پاس ہی گملے میں لگے ہوئے ایک خوبصورت اور بیش قیمت درخت کے پتے نوچ رہی تھی اور انھیں ایک ایک کر کے توڑ کر قالین پر پھینکتی جاتی تھی۔

"مجھے تم سے اس برتاؤ کی توقع نہ تھی۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔" میرا خیال تھا کہ یہاں پہنچ کر تم سب سے پہلے مجھ ہی سے رابطہ قائم کرو گے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے مصلحتاً بات کو بڑھایا۔" مگر بعض ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔"

"میرے ہوتے ہی تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔ ہر کام محض حکم دینے سے ہو جائے گا۔ بولو۔ کیا کام ہے تمہیں؟"

میں بات ٹالنے کے لیے مسکرانے لگا۔ اس دوران میں میں اپنے ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر یہ عورت کون ہو سکتی ہے اور مجھے کیوں کر جانتی ہے؟ اگر میں اس سے مل چکا ہوں تو کہاں ملا تھا اور اگر نہیں تو آخر وہ کون شخص ہے جس کی غلط فہمی میں اس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔

"کام اتنا اہم نہیں ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"زبان سے تو کہو۔ ہم کم اہم کام بھی کرا دیتے ہیں پارٹنر۔" وہ بے تکلفی بلکہ قدرے بے باکی سے ہنسی۔" صرف تمہارے زبان ہلانے کی دیر ہے۔"

میرے جواب دینے سے پہلے کمرے کا گیلری میں کھلنے والا دروازہ کسی آواز کے بغیر کھلا اور ملازمہ نے اسے پورا کھول دیا۔ اس کے بعد کمرے میں جو چیز داخل ہوئی اسے دیکھ کر میں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر سکا۔ یہ ایک پستہ قد آدمی تھا جو اپنے چاروں ہاتھوں پیروں کی مدد سے چوپائے کی طرح چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور سفید قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے کالر میں سیاہ بو لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز بات اس کا جانوروں کی طرح ہاتھ پیروں کے بل چلنا تھا۔ مگر اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی چوڑی کمر پر ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں کوک کا ایک گلاس، ایک خالی گلاس، ایک وہسکی کی چھوٹی بوتل اور ایک شیشے کا پیالہ نما برتن تھا جس میں برف کی خوبصورت ترشی ہوئی قاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ نہایت سبک انداز میں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھا اور اس عورت کے صوفے کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ محض سر اٹھا کر عورت کی طرف دیکھا۔ اس لمحے وہ مجھے ایک گھریلو پالتو کتے کی طرح نظر آیا۔ اس میں صرف ایک دم کی کمی تھی۔

"چاشی۔" عورت نے مسکرا کر کہا۔" تم تمیز بھول گئے ہو۔ پہلے مہمانوں کی خاطر کی جاتی ہے۔" وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"سوری میڈم۔" اس کے منہ سے ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی آواز ہی اس قسم کی تھی۔ وہ پیروں اور ہاتھوں کے بل چلتا ہوا میری طرف بڑھا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ اتنی نبک رفتاری اور ہموار انداز میں چلتا تھا کہ اس کی کمر پر رکھی ہوئی مشروبات کے گلاسوں اور بوتلوں میں سے ایک قطرہ بھی چھلک کر نہیں گرتا تھا۔ وہ اپنے انداز کا ماسٹر تھا۔ میرے صوفے کے سامنے کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔" شوق فرمائیے سر۔" یہ کہتے ہوئے وہ دو قدم بڑھ کر ٹی ٹرالی کی طرح میرے صوفے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ گندمی رنگ کا شخص تھا جو چہرے کے نقوش سے جنوب مشرقی ایشیا کی کسی نسل کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں جب کہ اس علاقے کے لوگوں کی آنکھیں عام طور پر بڑی نہیں ہوا کرتیں۔

اپنے سامنے ایک اشرف المخلوقات کو چوپایوں اور جانوروں کے انداز میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں خاموش اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں وہ بے حس و حرکت میرے سامنے کھڑا اپنی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ بالآخر میں نے کوکا کولا کا گلاس ہاتھ میں اٹھا لیا۔

"برف سر۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی تو مجھے بالکل یوں لگا جیسے کوئی حیوان بول پڑا ہو۔

میں نے چمٹا اٹھایا اور برف کے چند ٹکڑے اپنے گلاس میں ڈال لیے۔ وہ اسی سبک رفتاری اور یکسانیت سے چلتا ہوا عورت کے سامنے پہنچ گیا اور سر اٹھا کر پالتو جانوروں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیگ بنایا اور گلاس ٹرے سے اٹھا لیا لیکن چاشی پھر بھی ایک بے جان میز کی طرح اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ میرے لیے یہ نظارہ انوکھا اور ناقابل یقین تھا۔ مگر شاید ابھی کچھ اور منظر بھی مجھے دیکھنے تھے۔

میں نے کوک کا گلاس ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ دروازے پر قدرے شور و غل محسوس ہوا۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ اس بار ایک نیم زخمی آدمی اس دروازے میں سے یوں اندر آیا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر پھینکا ہو۔ وہ شخص دھکے کے زور میں قالین پر اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی اندر داخل ہوئے جو نہایت طاقت ور مضبوط اور قد آور تھے اور چہرے ہی سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زخموں کے نشان ٹرافیوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے فرش پر پڑے ہوئے آدمی کو ایک ٹھوکر رسید کی اور وہ بلبلا کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک تندرست اور توانا آدمی تھا لیکن اس کے جسم اور چہرے پر موجود چوٹوں کے نشانات اس بات کی علامت تھے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ وہ ایک نیکر اور آدھی آستینوں کی میلی کچیلی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

عورت کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹا مگر دوسرے مسلح محافظ نے اسے دوبارہ دھکیل کر عورت کے صوفے کے سامنے پھینک دیا۔ وہ خوبصورت عورت اس تمام واقعے سے یوں بے خبر اور بے تعلق بیٹھی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اس نے بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ مشروب کے چند گھونٹ بھرے اور پھر گلاس دوبارہ انسانی ٹرالی پر دھر دیا۔ اس کے بعد بھی اس نے بدحال قیدی کی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خاموشی سے اس نے برابر کی میز پر رکھا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اس میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اپنے سرخ ہونٹوں میں دبالی۔ ایک نے آگے بڑھ کر لائٹر کی مدد سے سگریٹ جلا دی اور دھوئیں کا ایک چھوٹا سا بادل کمرے میں پھیل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کی خوشبو بھی کمرے میں بکھر گئی۔ مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی عام سگریٹ نہ تھا بلکہ اس کے اندر نشہ آور مادی جرا نا بھی بھری ہوئی تھی۔ کسی عورت کو سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھنا ہی ایک عجیب منظر ہوتا ہے لیکن یہاں تو حیرت پر حیرت زدہ کرنے والی باتیں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ بظاہر ایک مہذب اور خوبصورت عورت نہ صرف سگریٹ نوشی کر رہی تھی بلکہ دُخت رَز سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی اور اس نے محض تمباکو والے سگریٹ پر

www.pdfbooksfree.pk

اکتفا نہیں کیا تھا۔

کمرے میں لایا جانے والا قیدی اَب گھٹنوں کے بَل اس کے سامنے سرنگوں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ معافی طلب کرنے کے انداز میں چہرے کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔ "میڈم۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔ "مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے غلطی ہوگئی مگر مجھے اس کی کافی سزا مِل چکی ہے۔ خدا کے لیے مجھے ایک بار معاف کر دیجیے۔ پھر دوبارہ آپ کو شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔"

میڈم نے تمسخر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور جب بولی تو اس کی دلکش آواز نفرت اور حقارت میں ڈوبی ہوئی تھی: "زندگی صِرف ایک بار ہی ملتی ہے پیٹر، اور انسان مرتا بھی صرف ایک ہی بار ہے۔ دُنیا میں کوئی اہم کام دوسری بار نہیں ہوتا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے میڈم۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"معاف کر دوں؟ تمہیں؟ ایک نمک حرام اور غدّار کو؟ کیا تم جانتے نہیں تھے کہ مَیں اپنے مُلازموں کا ہر جُرم معاف کر سکتی ہوں مگر غدّاری کبھی قابلِ معافی نہیں ہو سکتی۔"

"مجھ سے غلطی ہوگئی میڈم۔"

"تو پھر اس کی سزا بھی بھگتو۔" پھر وہ محافظوں سے مخاطب ہوئی: "لے جاؤ اسے۔ کل صُبح اس کا فیصلہ کر دو۔"

پیٹر گھگھیاتا ہوا گھٹنوں کے بَل چلتا ہوا میڈم کے صوفے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بِنا کتنا مضبوط آدمی بچّوں کی طرح بِلک رہا تھا۔

"مجھے صِرف ایک موقعہ اور دیجیے میڈم۔" اس نے روتے ہوئے میڈم سے درخواست کی۔ وہ عورت اپنی خوبصورت شربتی آنکھوں سے ایک لمحہ اسے دیکھتی رہی پھر اس نے محافظ کو اشارہ کیا جس نے مضبوطی سے پیٹر کو تھام کر باہر لے جانے کے لیے گھسیٹنا شروع کر دیا مگر پیٹر شاید زندگی کی آخری بازی لگانے کی کوشش میں تھا۔ وہ دوبارہ صوفے کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور معافی کے لیے درخواستیں کرنے لگا۔

میڈم بے تعلقی اور بے نیازی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اس کا سگریٹ والا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو پیٹر کے بازو پر مسل کر بُجھا دیا۔ پیٹر کے مُنہ سے ایک چیخ نِکلی اور وہ تڑپ کر صوفے سے دُور ہو گیا۔ محافظوں نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور چیختے چلّاتے، معافیاں طلب کرتے ہوئے پیٹر کو زبردستی اُٹھا کر کمرے سے باہر لے گئے۔ اس کی چیخیں باہر سے بھی سُنائی دے رہی تھیں۔ اَب کمرے میں سینٹ کی خوشبو اور ماری جوانا کی ناگوار بدبُو کے ساتھ ساتھ انسانی گوشت کے جلنے کی بُو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن وہ عورت جسے پیٹر نے میڈم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ نہایت سکون اور بے نیازی کے ساتھ اَب گلاس سے شغل کر رہی تھی۔ اس کے صوفے کے آگے چاشی ایک چار پیروں والے جانور یا چار پائے والی میز کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ انسان نہیں ایک چوبی اور بے جان میز ہے۔

اس منظر نے مجھے اتنا بدمزہ کیا کہ مَیں بے اختیار صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے والی کھڑکی کے قریب جا کر باہر لان کا نظارہ کرنے لگا۔ یہ ایک سرسبز اور تراشا ہوا خوبصورت لان تھا جس میں بیڈمنٹن اور ٹینس کے کورٹس بنے ہوئے تھے۔ ٹینس کورٹ میں ایک عورت کسی مرد کے ساتھ ٹینس کھیل رہی تھی۔ مَیں خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا لیکن دراصل مَیں اپنے دل اور دماغ پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

یکایک خوشبو کے جھونکوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو میڈم میرے نزدیک کھڑی باہر لان میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ میری نئی سیکرٹری میگی ہے۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی: "ٹینس کی اچھی کھلاڑی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بہت اچھی اور بھروسے کے قابل سیکرٹری ہے۔"

"اس کے ساتھ کون کھیل رہا ہے؟" مَیں نے یوں ہی سوال کیا۔

وہ مسکرائی۔ "حیرت ہے۔ تمہیں خوبصورت لڑکیوں کی موجودگی میں مردوں کے بارے میں سوالات کرنے کی عادت کب سے ہوگئی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ شرارت سے مُسکرائی اور میرے اور قریب کھسک آئی۔

"تم اَب میرے مہمان رہو گے۔" وہ گلاس کو گھُما کر دیکھتے ہوئے بولی: "تمہارا کہیں اور قیام کرنا میرے لیے توہین آمیز ہے اور ہوٹل میں ٹھہرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

یکایک مَیں نے کچھ سوچ کر پوچھا: "تو کیا میرے ہوٹل سے میرا سامان تم ہی نے منگایا ہے؟"

"بالکل نہیں۔" وہ جلدی سے بولی: "جب میرے آدمی تمہارے ہوٹل میں پہنچے تو تم اور تمہارا دوست سامان لے کر رُخصت ہو چُکے تھے۔ اُنھوں نے تمہارا پیچھا کیا اور آخرکار تمہیں میرے پاس لے ہی آئے۔"

مجھے اپنی گردن پر لگنے والی ضرب یاد آگئی: "معاف کرنا یہ کسی مہمان کو بُلانے یا لانے کا مہذّب طریقہ نہیں ہوتا۔" مَیں نے اپنی گردن کی پُشت سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ شوخی سے ہنس پڑی۔ "جب مہمان ہی آنکھیں بدل لیں تو پھر کبھی کبھی زبردستی بھی کرنا پڑتی ہے۔ اچھا۔ اَب یہ بتاؤ کہ تم کہیں چلنا پسند کرو گے یا آرام کرو گے۔"

مَیں نے سامنے لان میں تیز دن کی طرح روشن بلبوں کی چمک میں میگی اور اس کے ساتھی کو کھیلتے ہوئے دیکھا اور پھر کہا: "مَیں تھکا ہوا ہوں۔ اگر آرام کرنے کا موقعہ مِل جائے تو مہربانی ہوگی۔"

وہ مُسکرانے لگی اور اس لمحہ وہ ایک انتہائی دلکش اور نرم دِل عورت نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے رونما ہونے والا واقعہ اگر مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو شاید مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ مجسّم نزاکت اور رعنائی کا پیکر اتنا سنگدل اور ظالم بھی ہو سکتا ہے۔

"اچھا۔ تم آرام کرو، صُبح مُلاقات ہوگی۔" اس نے گلاس چاشی کی کمر پہ رکھے ہوئی ٹرے پر رکھ دیا۔ اسی عرصہ میں چاشی بے آواز پیروں ہاتھوں کے بَل چلتا ہوا نہ جانے کب ہمارے پاس آکر ٹھہر گیا تھا۔

"اوکے پارٹنر۔" اس نے دلنواز انداز میں ہاتھ ہلایا۔ "صُبح تک کے لیے گڈ بائے۔" اور لچکتی ہوئی چال چلتی ہوئی کمرے سے رُخصت ہوگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے چاشی بھی کسی پالتو وفادار جانور کی طرح چلتا ہوا رُخصت ہو گیا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ایک بار مڑ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ کیسی بھی عورت تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے کمرے سے رُخصت ہوتے ہی رنگ و بُو کا طوفان بھی رُخصت ہو گیا اور کمرہ خالی خالی اور بے رونق لگنے لگا۔

مَیں نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ میگی اور اس کا ساتھی بھی کھیل ختم کر کے ہنستے بولتے رُخصت ہو رہے تھے۔ میگی کے ہاتھ میں ریکٹ تھا جسے وہ شوخی سے اپنے ساتھی کے بازوؤں پر مار رہی تھی۔ وہ لوگ میرے کمرے کی جانب ہی آ رہے تھے۔ کچھ اور نزدیک آئے تو مَیں نے تفصیل سے ان دونوں کا جائزہ لیا۔ میگی واقعی ایک رعنا اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا جسم کھلاڑیوں کی طرح متناسب اور دِلکش تھا اور چہرہ بھی جسم کی مناسبت سے دلکش اور حسین تھا۔ اس کا ساتھی سفید نیکر اور جرسی میں ملبوس ایک باوقار اور خوبصورت نوجوان تھا۔ جب وہ ہنستا تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگتے تھے۔ وہ دونوں ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک سمت میں چلے گئے۔ انھوں نے ایک بار بھی سَر اُٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا شاید وہ سفید باریک پردے کے پیچھے میری موجودگی سے یکسر بے خبر تھے۔

چند لمحے بعد ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ باہر لان میں بجلی کے قمقمے ابھی تک جگمگا رہے تھے لیکن لان میں کوئی کھیلنے والا موجود نہ تھا۔ وسیع و عریض کمرہ اَب بالکل خاموش اور تنہا تھا۔ میڈم نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا تھا مگر میرا ذہن انتہائی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہی تھا کہ یہ میڈم کون تھی اور میرا اس سے کیا تعلق تھا؟

www.pdfbooksfree.pk

اگر اسے میرے بارے میں غلط فہمی ہورہی ہے تو پھر وہ آخر مجھے سمجھ کیا رہی ہے؟ اور جب اسے میری حقیقت کا علم ہوگا تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ وہ ایک حسین اور نازک عورت ہونے کے باوجود کس قدر ظالم اور پتھر دل تھی اس کا مظاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔ میڈم کوئی بھی تھی لیکن ایک بات طے تھی کہ یہ عورت "انڈر ورلڈ" سے تعلق رکھتی تھی اور مجرمانہ اور خلافِ قانون سرگرمیوں میں مصروف تھی لیکن اسے بھلا میرے ساتھ کیا کام اور واسطہ ہوسکتا تھا؟

پھر میرا ذہن چاشی کی طرف مبذول ہوگیا۔ وہ کون تھا اور میڈم کے پاس اس طرح غیر انسانی زندگی کیوں گزار رہا تھا۔ کیا وہ محض چوپایہ بن کر رہ گیا تھا کہ انسانوں کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا؟ چہرے سے وہ جاپان، کوریا، ویت نام یا تھائی لینڈ میں سے کسی ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ رنگ کی تھیں۔ پھر سب سے قابلِ ذکر بات اس کا صبر اور سکون تھا۔ وہ خاموشی اور بے زبانی سے گھنٹوں بے جان میز کی طرح بے جس و حرکت کھڑا رہنے پر قادر تھا۔ کوئی چوپایہ بھی ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر فوری طور پر ایک پالتو جانور کا تصور ذہن میں پیدا ہوتا تھا اور اسے واقعی ایک انتہائی وفادار پالتو جانور کی طرح سدھایا گیا تھا۔

پھر مجھے میگی کا خیال آیا۔ وہ ایک خوش شکل اور خوش اندام لڑکی تھی۔ تعلیم یافتہ اور مہذب بھی معلوم ہوتی تھی۔ پھر وہ اس ماحول میں کیا کررہی تھی؟ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نرم و گداز بستر پر جا لیٹا۔ اس ماحول اور یہاں کے کرداروں نے مجھے عجیب سی الجھن میں مبتلا کردیا تھا۔ مگر میری ذاتی پرابلم بدستور اپنی جگہ موجود تھی۔ میں جس کاروباری معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے یہاں آیا تھا اس کا مسودہ میرے بریف کیس کے ساتھ گم ہوچکا تھا۔ کسی نے میرے سامان کی تلاشی کے بعد میں مجھے اپنے سامان سے بھی محروم کردیا تھا۔ سب سے قابلِ تشویش بات یہ تھی کہ میرا ساجھے دار، دوست اور معتمد شوکت کا کوئی پتہ نہ تھا۔ شوکت کو کیا حادثہ پیش آیا کہ وہ پروگرام کے مطابق امپیریل ہوٹل میں نہیں پہنچ سکا لیکن اگر شوکت نہیں پہنچ سکا تھا تو ہوٹل ریسپشنسٹ کے بیان کے مطابق میرا وہ دوست کون تھا جو میرے نام پر میرا سامان بھی لے کر غائب ہوگیا تھا اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ میرے سامان میں اس شخص کو کیا حاصل ہوسکتا تھا ماسوائے چند ہزار روپے کیش کے۔ وہ جو کوئی بھی تھا صاف ظاہر تھا کہ محض چند ہزار روپے کے درپے نہ تھا۔ اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ صبح بیدار ہونے کے بعد سب سے پہلے ٹنک برکت کے دفتر جاؤں گا یا اگر جانے کا موقعہ نہ مل سکا تو اس سے فون پر رابطہ قائم کروں گا۔ اس پُراسرار مکان سے اپنے گھر یا شوکت کے گھر فون کرنا میرے نزدیک مناسب نہ تھا۔ اسی یہی منصوبے بناتا ہوا اور مختلف سوچوں میں الجھا ہوا میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

رات کو نہ جانے کس وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں عجیب قسم کی بے چینی اور بے سکونی محسوس کررہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دو بجے تھے۔ کچھ دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند نہ آئی تو اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ رات تاریک تھی، لیکن سامنے پھیلے ہوئے لان اور باغیچے میں بجلی کے قمقموں کی وجہ سے روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ درخت۔ پودے۔ پھول سبھی خاموشی سے نیند کی آغوش میں کھوئے ہوئے لگتے تھے۔ اچانک ایک چیخ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ایک کے بعد ایک کے بعد دیگرے کئی اور چیخیں سناٹے میں گونجیں جنہوں نے ماحول میں تلاطم پیدا کردیا۔ یہ کسی عورت کی چیخوں کی آواز تھی اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی خطرے سے دوچار ہے۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر بستر کی طرف چلا گیا۔ یہ تمام چیزیں میرے لیے انجانی اور دعزیب تھیں۔ مجھے بلاشبہ ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سوچ کر میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ نیند بھی آنکھوں سے دور تھی۔ کمرے میں مطالعے کے لیے کوئی کتاب بھی موجود نہیں تھی۔ سگریٹ کے سوا اور کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سگریٹ سلگا لی۔ لیکن وہی آواز پھر سنائی دی اور اس بار یہ اتنی دلخراش تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے قدم مجھے کشاں کشاں دروازے کی طرف لے گئے۔

دروازہ خلافِ توقع مقفل نہیں تھا۔ دونوں اطراف میں گیلریاں پھیلی ہوئی تھیں اور میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ میں کس طرف جاؤں مگر میری یہ مشکل چیخوں کی آواز کی وجہ سے آسان ہوگئی۔ آوازیں بائیں جانب سے آرہی تھیں۔ میں نے تیزی سے اسی طرف کا رخ کیا۔ آوازیں اب مسلسل ہوگئی تھیں۔ میں آوازوں کی سمت میں چلتا رہا۔ نہ جانے میں نے کتنی راہداریاں اور گیلریاں طے کیں۔ اگر چیخیں میری راہنمائی نہ کرتیں تو شاید میں راستے میں بھٹک جاتا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چیخیں متواتر عمارت میں گونج رہی تھیں، لیکن مکان میں میرے سوا کوئی دوسرا متنفس ایسا نہ تھا جس نے ان پر کان دھرا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری عمارت میں کوئی اور ذی روح موجود ہی نہیں ہے۔

متعدد گیلریوں سے گزر کر میں ایک دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چیخوں کی آوازیں اسی کمرے کے اندر سے آرہی تھیں۔ ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ایک لحیم شحیم محافظ جس کے ہاتھ میں آٹومیٹک بندوق تھی کود کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی اور موٹی گھنی مونچھوں کی وجہ سے اس کا چہرہ اور زیادہ خوفناک نظر آرہا تھا۔ وہ میرے اور بند دروازے کے درمیان سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اور غصے بھری آواز میں بولا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟ چلے جاؤ ادھر سے۔"

میں نے کہا۔ "تم کون ہو اور تم یہاں کیا کررہے ہو؟"

اسی لمحے کمرے کے اندر سے زنانہ چیخ کی آواز پھر سنائی دی جو کافی جگر خراش تھی۔ میں نے محافظ کو سامنے سے ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے بھاری ڈیل ڈول سمیت میری راہ میں حائل تھا۔ "ہم بولا تم چلے جاؤ۔ ورنہ ہمارے ہاتھ سے تمہاری بے عزتی ہوجائے گی۔" اس کا لہجہ انتہائی حقارت بھرا تھا۔ یہ دھمکی دینے کے بعد اس نے بندوق والا ہاتھ اٹھا کر میرے سامنے دروازے پر ٹیک دیا اور مجھے گھورنے لگا۔

چیخوں کی آواز پھر سنائی دی اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے اپنا دائیاں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی اور ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی کلائی کی ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی اور بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور کوئی ہوتا تو تکلیف سے دوہرا ہوکر زمین پر گر جاتا۔ مگر وہ ایک سخت جان آدمی تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوری قوت سے میرے سینے پر اپنے سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ مگر میں تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ میری بجائے وہ پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ کی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو کسی زور آزمائی کے بغیر ہی کھل گیا۔

کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور میں باآسانی سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔ یہ ایک کشادہ بیڈروم تھا جس کے ایک کنارے پر ڈبل بیڈ تھا۔ بیڈ کے سامنے سرخ رنگ کے قالین پر ایک لڑکی گھٹنوں کے بل کھڑی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے مسلا اور پھٹا ہوا تھا۔ اس کے لمبے بال بکھر کر اس کے چہرے اور شانوں پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ بے تحاشہ چیخیں مار رہی تھی۔ اس کی چیخوں کا سبب بھی میری نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ یہ وہی حیوان نما انسان چاشی تھا جسے میں نے میڈم کے سامنے ایک بے جان اور بے زبان شے کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی پشت پر مشروبات کی ٹرے رکھی ہوئی تھی، لیکن اس وقت جو چاشی میری نگاہوں کے سامنے تھا وہ ایک مختلف مخلوق تھا۔ وہ ایک وحشی جانور کی طرح غراتا ہوا لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ اندازہ لگانا دشوار نہ تھا کہ لڑکی کی اس حالت کا بھی وہی ذمہ دار تھا۔ کمرے میں میری موجودگی کا علم پہلے لڑکی کو ہوا اور وہ دیوانہ وار بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل رہی تھیں۔ مجھ سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "مجھے بچاؤ۔ مجھے بچالو۔" اس سے زیادہ وہ مجھ سے کچھ نہ کہہ سکی۔

www.pdfbooksfree.pk

اس اثنا میں چاشی بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ وہ اس وقت بھی کسی چوپائے کی طرح چاروں ہاتھوں پیر کے بل کھڑا تھا لیکن اس وقت وہ کسی پالتو، سدھائے ہوئے بے ضرر جانور کی بجائے ایک خونخوار درندے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ مجھے سامنے دیکھا تو اس کی نگاہوں میں وحشیانہ چمک پیدا ہو گئی اور وہ اپنے منہ سے غرّاہٹ کی آوازیں نکالتا ہوا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اس کے منہ سے ایک حیوانی آواز نکلی: "ہٹ جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ وہ انسانوں کی طرح بول بھی سکتا ہے۔ لڑکی اب خاموش ہو گئی تھی مگر اس کی سسکیوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ یہ تمام منظر میرے لیے غیر حقیقی سا تھا اور میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ یہ لڑکی کون ہے اور چاشی اس کمرے میں کیسے در آیا؟ پھر دروازے کے باہر ایک محافظ کی موجودگی کے باوجود لڑکی کو اس حیوان کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لڑکی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "خدا کے لیے مجھے اس جانور سے بچا لو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔"

چاشی غصے میں بھرا ہوا دو قدم آگے بڑھ کے میرے بالکل سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انتہائی وحشیانہ کیفیت ناچ رہی تھی، لیکن مجھے کم از کم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ چاشی ہر وقت چوپائے کی طرح چلنے پھرنے پر مجبور ہے اور وہ انسانوں کی طرح دو پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔" اس کے منہ سے پھر ایک غرّاہٹ نما آواز نکلی "چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ لڑکی کی طرف بڑھا اور پلک جھپکنے میں اس نے لڑکی کی ایک ٹانگ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ فرش پر گر گئی۔ لڑکی کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی اور اس نے پلٹ کر فرش پر سے اٹھنا چاہا مگر چاشی اتنی دیر میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چاشی کے گھنے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور وہ تکلیف سے چلا کر میری طرف پلٹ پڑا۔ اپنے بال میری گرفت سے آزاد کرانے کے لیے اس نے اپنے سر کو زور زور سے جھٹکنا شروع کر دیا۔ اس کے بال ــــ چکنائی کے باعث میری گرفت سے آزاد ہو گئے اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک بھوکے جانور کی طرح مجھ پر لپکا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا وہ میری دونوں ٹانگیں پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور زمین پر گر گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، وہ جھپٹ کر میرے اوپر آیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ کر دبانے لگا۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ غصے میں اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے اور وہ پوری قوت سے میری گردن کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا اور مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں کتنی قوت ہے۔ اس کی گرفت آہنی تھی اور اس کی انگلیاں فولادی سلاخوں کی طرح میری گردن میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ میں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے چند لمحے اس کے رحم و کرم پر رہا۔ پھر جب میرے ہوش و حواس مجتمع ہوئے تو میں نے دونوں گھٹنے سمیٹ کر اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ اس کی گرفت میں کسی قسم کی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ پے در پے تین چار بار اس کے پیٹ کو نشانہ بنانے کے بعد میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی گرفت کمزور پڑی تو میں نے دونوں کلائیوں کو اس کے ہاتھوں پر مارا اور پوری قوت سے اسے پیچھے دھکا دیا اور وہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ میں اتنی دیر میں اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا، لیکن اس نے مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ جنگلی بھیڑیے کی طرح اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے دونوں پنجے میری آنکھوں کو نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میرے لیے کسی جانور نما انسان سے جنگ آزما ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا اور میں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس سے اسی طرح پیش آنا چاہیے جس طرح کسی جنگلی جانور سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اتنی دیر میں اس کا جسم پوری قوت

کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا اور میں ایک بار پھر لڑکھڑا کر گر گیا، لیکن اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں لوٹ لگا کر دوسری سمت میں چلا گیا۔ وہ جست لگا کر جب اس جگہ پہنچا تو میں بیڈ کے ساتھ کھڑا ہو کر اس کے دوسرے حملے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے میری جانب مڑا۔ اس کے بال جنگلیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ دانت خونخوار انداز میں نمایاں تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔ وہ اس لمحے سر تا پا ایک جنگلی درندہ معلوم ہو رہا تھا جو اپنے شکار کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہو۔ مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ میرے سامنے سر و قد کھڑا نہ ہوتا اس وقت تک میں اس سے مقابلہ کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر وہ پھرتی کے ساتھ سنبھل کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے پیتل کے بھاری گلدان پر نظر پڑی تو میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ اتنی دیر میں وہ چیتے کی طرح چھلانگ لگا کر میرے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ میں نے بائیں جانب ہٹ کر پوری قوت سے بھاری گلدان اس کے سر پر دے مارا۔ میرا خیال تھا کہ گلدان کی ضرب سے اس کا سر پاش پاش ہو جائے گا، لیکن وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس کا سر تو صحیح سلامت رہا البتہ اس بھرپور ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا اور وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کے باوجود میں احتیاطاً اپنی جگہ کھڑا رہا کہ مبادا وہ پھر حملہ کر دے، لیکن اس بار وہ بالکل ساکت ہو چکا تھا۔

میں اس لڑائی کے دوران لڑکی کی طرف سے بالکل غافل ہو چکا تھا۔ جو سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کمرے کے ایک گوشے میں سمٹی کھڑی تھی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چاشی کا حشر دیکھ کر وہ مطمئن ضرور تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے انجام کے ڈر سے لرز رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے نرمی سے پوچھا: "تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام نازی ہے جی۔ میں گامی کی بیوی ہوں۔"

"گامی!!" یہ نام میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ "وہ کون ہے؟"

"وہ میرا خاوند ہے۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"مگر وہ ہے کہاں؟ کیا کرتا ہے؟"

جواب میں وہ رونے لگی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں پھر پوچھا: "ڈرو نہیں نازی۔ مجھے بتاؤ۔ کہاں ہے تمہارا خاوند۔ اور تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

اس نے اپنے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے لباس پر ایک نظر ڈالی اور سمٹ گئی۔ میں نے قالین پر سے اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر اور شانوں پر ڈال دیا۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی۔ وہ ایک صحت مند اور خوش شکل عورت تھی اور اس خراب حلیے کے باوجود اس کی دلکشی میں کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو جواب میں اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "تم کون ہو جی اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ظاہر ہے کہ وہ مجھے اپنا راز دار اور ہمدرد بنانے سے پہلے یہ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ میں اس کی مدد بھی کر سکوں گا یا نہیں۔

"میرے بارے میں فکر مت کرو۔" میں نے اسے بتایا: "میں اس گھر میں مہمان ہوں۔ ان لوگوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اگر میں تمہاری کچھ مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔ اب تم جلدی جلدی اپنے اور گامی کے بارے میں مجھے بتا دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی اور اس طرف آ نکلے۔"

جواب میں نازی نے مجھے جو بتایا وہ ایک ناقابلِ یقین اور تحیّر خیز داستان تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر گامی میڈم کا پرانا ملازم اور نمک خوار ہے۔ میڈم کے لیے اس نے کئی بار اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بہت مشکل کارنامے انجام دیئے۔ وہ ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث رہا اور میڈم کے لیے مختلف فرائض ادا کرتا رہا۔ چند روز قبل

www.pdfbooksfree.pk

میڈم کو یہ اطلاع ملی کہ گامی اس کے ایک مخالف گروہ سے مل گیا ہے اور اُنہیں میڈم کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ میڈم نے گامی کو قید کرکے اُس پر ظلم اور تشدد شروع کر دیا۔ گامی نے اپنے جرم کا اقرار تو کیا لیکن اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ میڈم کا تشدد اور ظلم بھی اس کی زبان نہ کھلوا سکا تو میڈم نے اس کی بیوی کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ وہ چاہتی تھی کہ نازی کو گامی کی سرگرمیوں کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بتا دے اور اُن لوگوں کے نام بھی ظاہر کرے جو گامی کے ساتھ ملے ہوئے تھے، لیکن نازی کو فی الحقیقت اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میڈم نے گامی کو دھمکی دی کہ اگر وہ بدستور اپنی زبان بند رکھے گا تو اس کی بیوی کو بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ اتنا کہنے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"مگر تم اس کمرے میں کیسے آگئیں؟ اور چاشی یہاں کیا کر رہا تھا؟"

"یہ چاشی کا کمرہ ہے جی!" اُس نے مجھے مطلع کیا۔ میں نے حیران ہو کر کمرے پر نظر دوڑائی۔ یہ ایک خوبصورتی سے سجا ہوا آرام دہ کمرہ تھا جس میں آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔

"چاشی اس کمرے میں رہتا ہے؟"

"ہاں جی۔ میڈم اس پر بہت مہربان ہے۔"

"مگر چاشی ہے کون؟ یہ اس طرح جانوروں کی طرح کیوں چلتا ہے؟ کیا یہ سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا؟"

"چاشی کی بھی ایک کہانی ہے جی۔ سُنا ہے کہ چاشی ایک مالدار آدمی شناور کا بیٹا ہے۔ وہ سمگلروں اور مجرموں کا بادشاہ تھا۔ میڈم کو اس راستے پر ڈالنے والا بھی وہی تھا۔ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ میڈم کے باپ سے اس کی دُشمنی ہو گئی تو اُس نے اس کو قتل کرا دیا اور میڈم کو اغوا کر لیا۔ شناور نے میڈم پر بہت ظلم کیے۔ وہ اسے اپنے کلب میں ناچنے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ میڈم کی خوبصورتی پر مرمٹا تھا اور ہر قیمت پر اسے اپنا بنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی کوئی زبردستی میڈم کا دل نہیں جیت سکی۔ مگر کچھ عرصے بعد میڈم نے ہار مان لی اور اُس کے ساتھ مجبوراً شادی کر لی۔ شناور اپنی جیت پر بہت خوش تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک زہریلی ناگن کو اپنایا ہے جو کبھی انتقام لینے سے باز نہیں رہتی۔ شناور کو اپنی اداؤں کے جال میں پھنسا کر میڈم نے آہستہ آہستہ اسے اپنے قابو میں کر لیا۔ ایک وقت ایسا آیا جب وہ میڈم پر پورا بھروسہ کرنے لگا۔ اپنا سارا کاروبار اُس نے میڈم کو سونپ دیا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میڈم اسے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق نشے کا عادی بنا رہی ہے یہاں تک کہ وہ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ اب سارے کاروبار اور گروہ پر میڈم کا قبضہ تھا۔ شناور کو اپنے نشے کے سوا کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا۔ اس طرح اسے ناکارہ بنانے کے بعد میڈم نے اس کے بیٹے چاشی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ چاشی کے گلے میں اس نے زنجیر باندھ دی اور اسے کتوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جہاں بھی جاتی چاشی کُتے کی طرح زنجیر میں بندھا ہُوا اس کے ساتھ جاتا۔ اسے جانوروں کی طرح کھانا دیا جاتا تھا۔ اگر وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ وہ جانوروں کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو گیا۔ وہ پالتو جانور کی طرح ہر وقت میڈم کے سامنے حاضر رہتا۔ کبھی مہربان ہو کر وہ اس کی طرف کھانے کی کوئی چیز پھینکتی تو وہ جانوروں کی طرح اُسے کھانے لگتا۔ میڈم کے لیے یہ نظارہ بہت دلچسپ ہوتا تھا اور وہ ہنسی سے بے قابو ہو جاتی۔

اذیت پہنچانے کے لیے میڈم یہ تماشا شناور کو بھی دکھایا کرتی تھی، لیکن اس بدنصیب کو تو ہوش ہی نہیں تھا۔ ایک سال پہلے شناور کے دل میں درد اُٹھا اور وہ مر گیا۔ اس طرح میڈم نے اس کی جگہ لے لی اور اب وہی ہر چیز کی مالک ہے۔ چاشی ایک وفادار جانور کی طرح اس کا تابعدار ہے اور میڈم کا انتقام پورا ہو گیا ہے۔"

یہ حیرت انگیز کہانی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی، لیکن اس پر یقین کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ جو کچھ میں اب تک اپنی

آنکھوں سے دیکھ چکا تھا وہ اس کہانی کو باور کرانے کے لیے کافی تھا۔ اس روح فرسا کہانی کا کچھ حصہ میں یہاں آنے کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میڈم کے کمرے میں جس شخص کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا وہ نازی کے شوہر گامی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

میں نے پُوچھا "مگر تم چاشی کے کمرے میں کیوں آئی تھی؟"

"میں خود نہیں آئی تھی جی۔ میڈم نے مجھے زبردستی یہاں بھجوایا تھا۔"

"میڈم نے زبردستی بھجوایا تھا؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا "وہ کیوں؟"

نازی کی نگاہیں جھک گئیں اور چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا "میڈم جن عورتوں سے ناراض ہوتی ہے اور اسے سزا دینا چاہتی ہے اُنہیں چاشی کے کمرے میں بھجوا دیتی ہے۔" اس کی آواز نہایت مدّھم تھی، لیکن اس کا مفہوم بالکل واضح تھا۔

میڈم کون تھی؟ یہ میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ اُس نے مجھے زبردستی یہاں بُلا کر کیوں قید کیا تھا؟ یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا، لیکن میڈم کی گھناؤنی اور غیر انسانی زندگی کا ایک اور گوشہ مجھ پر عیاں ہو گیا تھا۔

"تم جانتی ہو کہ گامی کہاں قید ہے؟" میں نے اس سے پُوچھا۔

وہ تیزی سے گردن ہلانے لگی "وہ کمرہ یہاں سے دُور نہیں ہے جی۔ کیا تم مجھے اس کے پاس لے جا سکتے ہو؟" اُس نے اُمید بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

"چلو میرے ساتھ۔ مجھے اس کمرے تک لے چلو۔"

نازی نے خوش ہو کر مجھے دیکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی مگر پھر چاشی کی طرف دیکھ کر اس کے قدم رُک گئے جو قالین پر بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے اسے تسلی دی "اس کی فکر نہ کرو۔ وہ ابھی ہوش میں نہیں آئے گا۔"

ہم دونوں کمرے سے نکلے تو میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کرنے سے پہلے مسلح محافظ کو بھی گھسیٹ کر کمرے کے اندر ڈال دیا۔ میں نے اس کی بندوق اُٹھا لی اور نازی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیروں میں جیسے بجلی کی رفتار پیدا ہو گئی تھی۔ وہ قریب قریب بھاگتی ہوئی میرے آگے چل رہی تھی۔ چند گیلریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک راہداری کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر نازی اچانک رُک گئی۔ ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اس نے مجھے بالکل خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور میرے نزدیک کھسک آئی۔

اُس نے سرگوشی میں کہا "گامی کا کمرہ سامنے ہے مگر وہاں ایک پہریدار ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔"

میں نے اُسے وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود دبے پاؤں آگے بڑھا۔ راہداری کے موڑ پر رُک کر میں نے گردن آگے بڑھا کر دیکھا تو سامنے مجھے پہریدار نظر آ گیا۔ وہ ایک کُرسی پر ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا اور اس وقت سویا ہُوا تھا۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ پہریدار کے نزدیک پہنچ کر میں نے مزید تسلی کرنے کے لیے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دُور دُور تک کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے پہریدار کی بندوق اُٹھا کر اپنے قبضے میں کر لی جو کُرسی سے ٹکی ہوئی رکھی تھی۔ وہ سو ضرور رہا تھا مگر ہوشیار اور چوکس تھا۔ میرے قدم آگے بڑھنے سے پہلے اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنے سر پر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حیرت کے سمندر میں سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نے اُس کی گردن پر ایک ضرب لگائی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا، لیکن اس کی چابی پہریدار کی جیب میں موجود تھی۔ میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو میری نظریں گامی پر پڑیں جو کمرے کے آخری گوشے میں ایک کُرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اسکے ہاتھ اسکی کمر پر بندھے ہوئے تھے اور ٹانگیں کُرسی کے دونوں پایوں سے۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے

www.pdfbooksfree.pk

میڈم کے کمرے میں دیکھا تھا، اس کی حالت دیکھ کر اس ظلم کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا جو ان لوگوں نے اُس پر روا رکھا تھا۔ وہ اپنی بے رونق اور بے جان آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور حرکت کرنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کیا۔ اس کے ہاتھ اور ٹانگیں اتنے اکڑ گئے تھے کہ وہ سیدھا کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بمشکل اس کا ہاتھ تھام کر میں اسے قریباً گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا اور دوسرے ہی لمحے ہم راہداری میں تھے۔ باہر نازی ہماری منتظر تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور آنسو بہانے لگی۔ مگر یہ ان باتوں کا وقت نہ تھا۔ اس لیے میں نے اُسے عمارت سے باہر نکلنے کا راستہ بتانے کے لیے کہا۔ وہ آنسو پونچھ کر تیزی سے ہمارے آگے آگے چلنے لگی۔ گامی کو سہارا دے کر لے چلنے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے تنگ آ کر اسے اپنی کمر پر سوار کر لیا اور تیز قدموں سے نازی کے پیچھے چلنے لگا۔ نہ جانے کتنی گیلریوں اور دروازوں سے گزر کر ہم بیرونی حصے میں پہنچ گئے۔ اب تک ہماری راہ روکنے والا ہمیں کوئی نہیں ملا تھا۔ لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ عمارت کے باہر حفاظت کا کوئی انتظام ضرور ہوگا۔ نازی کی معلومات یہاں بھی کام آئیں۔ وہ ایک ایسے عقبی راستے سے واقف تھی۔ جو باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا اور ہمیں بلند حفاظتی دیوار کے باہر پہنچا سکتا تھا۔ ہم ابھی باغ میں پہنچے ہی تھے کہ مجھے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور ہمارے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ یہ کسی عورت کے ہنسنے اور ایک مرد کے بولنے کی آواز تھی اور رفتہ رفتہ ہمارے نزدیک آ رہی تھی۔ میرے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا، لیکن میں نے اس میں تاخیر نہیں کی۔

میں نے نازی سے سرگوشی میں کہا: "باہر کا راستہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے۔"

"اچھا غور سے سنو۔ ہم سب کا بیک وقت باہر جانا بہت مشکل ہے۔ تم گامی کو لے کر باہر جاؤ اور جتنی جلد ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ دور چلی جاؤ۔ ہو سکتا ہے کچھ فاصلے پر تمہیں ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی ملے گی۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہوگی لیکن تم اسے تلاش کر سکتی ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور سے کہنا کہ تمہیں ہوٹل والے صاحب نے بھیجا ہے اور یہ پانچ سو روپے اسے دے دینا۔ پھر تم جہاں کہو گی وہ تمہیں پہنچا دے گا۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ گامی کے ہاتھ پیر اب کچھ بہتر حالت میں تھے اور وہ ہماری تمام گفتگو غور سے سن رہا تھا۔

"دیر نہ کرو۔" میں نے تاکید کی۔ "میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ اور نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد تمہاری تقدیر۔ اب چلی جاؤ۔" ان دونوں نے تشکر آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی خاموش نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر تیزی سے باڑھ کے پیچھے غائب ہو گئے۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہو کر کھڑا سوچتا رہ گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ اتنی دیر میں ہنسی اور قدموں کی چاپوں کی آواز اور نزدیک آ گئی تھی۔ محافظ کی بندوق میں نے زمین پر ڈال دی اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر میرا کیا انجام ہوگا، لیکن نازی اور اُس کے شوہر کی جان بچا کر مجھے رُوحانی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے ابھی تک پوری طرح یہ یقین نہیں تھا کہ ان دونوں کی جانیں بچ بھی سکیں گی یا نہیں؟

سامنے والی پگڈنڈی پر دو انسانی ہیولے نمودار ہوئے اور جب وہ نزدیک آئے تو میں نے دیکھا کہ وہ میگی اور وہی شخص تھا جسکو میں نے میگی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مرد کا ہاتھ میگی کی نازک کمر کے گرد تھا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے سامنے پا کر وہ دونوں ٹھٹھک کر رُک گئے اور میگی کی کھنکتی ہوئی ہنسی خاموشی میں بدل گئی۔ میگی نے کہنی سے ٹہوکا دیا اور اس شخص نے میگی کی کمر پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

میں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

"گڈ ایوننگ سر۔" میگی نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ "آپ اور اس وقت یہاں۔۔۔ باغ میں۔۔۔؟"

"یہی سوال میں تم سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے بارُعب آواز میں کہا۔ "تم میگی ہو نا؟"

"یس سر۔" وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

"اور یہ تمہارا دوست ہے۔ شاید میڈم نے تمہیں اتنی رات گئے اس طرح گھومنے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

وہ دونوں سٹپٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا: "اپنے دوست سے کہو کہ یہاں سے فوراً چلا جائے۔"

میگی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ اس نے میگی کا ہاتھ چھوڑ کر رُخصت ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے میگی پر نظر ڈالی۔ وہ ایک سفید رنگ کا نائٹ گون پہنے ہوئے تھی۔ سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور میں نے پہلی بار کھڑکی سے دیکھ کر اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس کی اب تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرح دار عورت تھی۔ اس کے گالوں پر سُرخی پھیلی ہوئی تھی جو یقیناً شرمانے کی وجہ سے نہیں تھی۔ میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ ہلکے ہلکے سرور کے عالم میں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں جس طرح گھبرا گئے تھے اس کے پیش نظر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ میڈم کی طرف سے انہیں اس طرح ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر گھبرا گئے تھے۔ میں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میگی بتا سکتی ہو اس وقت میڈم کہاں ہیں؟"

وہ پریشان ہو گئی: "سر۔ وہ مکان سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ کل صبح واپس آئیں گی۔"

"اسی لیے تم ان کی غیر موجودگی میں موج اُڑا رہی ہو۔" میں نے رُعب سے کہا۔

وہ گھبرا گئی۔ "جی سر۔ میں تو۔۔۔۔ ٹی۔ جے میڈم کے دوست ہیں۔ میں تو اُن کا دل بہلا رہی تھی۔"

"کیا اس کے لیے تمہیں میڈم نے کہا تھا؟"

"جی نہیں۔ مگر۔۔۔۔"

میں نے ایک تیر چلایا: "میگی۔ تم جانتی ہو کہ ٹی۔ جے کے بارے میں میڈم کے جذبات کیا ہیں۔ کیا وہ اس سے تمہارا گھُل مل جانا پسند کریں گی؟"

اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا: "سر۔ میں مجبور تھی۔ مسٹر ٹی۔ جے نے مجھے خود اپنے پاس بُلوایا تھا۔ اگر ان کا حکم نہ مانتی تو وہ ناراض ہو جاتے۔"

"تمہیں میڈم سے زیادہ ٹی۔ جے کی ناراضی کا خیال ہے؟ تم محض میڈم کی سیکرٹری ہو۔ تمہیں ان کی غیر موجودگی میں ان کے مہمانوں سے بے تکلف ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔"

"آئی۔ ایم سوری سر۔" وہ سہم کر بولی۔ پھر وہ میرے بالکل نزدیک آ گئی۔ چند لمحے مجھے اپنی سحر آگیں نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر دھیمی آواز میں بولی: "سر۔ فارگاڈ سیک۔ میڈم کو اس بارے میں کچھ نہ بتانا۔ پلیز۔"

اس کی آواز میں لجاجت اور سپردگی تھی۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حسین اور پُرکشش عورت تھی اور میڈم کے پاس اس کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کوئی معصوم اور الھڑ عورت نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً ہوشیار اور چالاک ہو گی، لیکن اس وقت صورتِ حال نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

اس نے میری خاموشی سے کوئی اور مطلب اخذ کیا اور لگاوٹ کے ساتھ میرے اور قریب کھسک آئی۔ "ٹی جے میڈم

www.pdfbooksfree.pk

کے منظورِ نظر ہیں۔ مجھے ان کے پاس نہیں جانا چاہیئے تھا۔ میڈم اس معاملے میں بہت زیادہ جذباتی اور حساس ہیں۔ اگر اُنہیں معلوم ہو گیا تو..... تو... ‘‘ اُس کی آواز گھُٹ کر رہ گئی۔ لیکن میں اس کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ یک لخت میرے ذہن میں ایک خیال کلبلایا اور میں نے موقع سے فائدہ اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

’’سنو میگی‘‘ میں نے رومانٹک لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ’’میں بھی میڈم کا مہمان ہوں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی اور تنہائی نے پریشان کر دیا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا پسند کرو گی؟‘‘

اس کا چہرہ خوشی سے کِھل اُٹھا ’’سر۔ آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہو گی۔‘‘

’’تو پھر ہم لوگ گھومنے کے لیے سمندر کے ساحل پر چلتے ہیں۔‘‘

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی ’’ساحل سمندر پر اس وقت؟!‘‘ گھڑی میں اس وقت رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

’’تو پھر کیا ہوا‘‘ میں نے اپنی آواز میں اور زیادہ مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ’’سمندر کا ساحل اور وہ بھی رات کے وقت میری کمزوری ہے۔ مجھے وہاں جا کر سکون ملتا ہے۔ خوشی ملتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ ہم صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔‘‘ وہ خاموش سوچ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ’’بھروسہ رکھو۔ میڈم کو بالکل پتہ نہیں چلے گا۔‘‘ میرے لہجے میں پوشیدہ دھمکی بالکل واضح تھی۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر مسکرا کر مجھے دیکھا اور بالوں کو جھٹک کر بولی ’’چلیں۔ آپ کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔‘‘

اب تک ہر کام میری مرضی اور آسانی کے مطابق ہو رہا تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس زنداں سے باہر نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ہو جائے گا۔ میڈم گھر میں موجود نہیں تھی۔ جاشی اور دونوں محافظ کمروں کے اندر بے ہوش پڑے تھے۔ میگی میرے اشاروں پر چل رہی تھی۔ ایسے میں میدان بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ علی الصبح ساڑھے چھ بجے ایک فلائیٹ یہاں سے روانہ ہوتی ہے۔ اگر تقدیر یاوری کرے تو میں ان تمام اُلجھنوں سے نجات حاصل کر کے صبح سویرے آزادی کی منزل کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔

میں نے مسکرا کر میگی کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں دُنیا بھر کا خمار بھرے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔

’’کوئی ہمیں اس وقت باہر جانے سے روکے گا تو نہیں؟‘‘ میں نے اپنے خدشات دُور کرنے کی غرض سے پوچھا۔

’’میں میڈم کی سیکرٹری ہوں سَر۔ مجھے بھلا کون روکنے کی جرأت کر سکتا ہے؟‘‘

’’ویری گڈ۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے؟‘‘ میں نے اپنے دھڑکتے دِل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

’’بس مجھے چند منٹ کی اجازت دیجئے۔ میں ابھی آئی۔ آپ یہیں ٹھہریں۔‘‘ وہ ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ مجھے دیکھ کر تیزی سے عمارت کے اندر چلی گئی اور میں تنہا کھڑا اسکو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں اس کی طرف سے مشکوک تھا۔ کوئی عجب نہیں تھا کہ وہ مجھے کسی جال میں پھنسانے کی سازش کر رہی ہو! لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرے لیے اس کا انتظار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ مجھے نازی اور اس کے شوہر گامی کا خیال آیا۔ خدا جانے وہ اس چار دیواری سے باہر نکلنے میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں؟ اگر ٹیکسی ڈرائیور خوش قسمتی سے اُنہیں مل گیا ہو گا تو وقتی طور پر اُن کا بچ نکلنا یقینی تھا۔ گامی کے بارے میں اُس کی بیوی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا۔ اسکی روشنی میں وہ بذاتِ خود ایک بے ضمیر، جرائم پیشہ اور سنگدل انسان تھا۔ لیکن اس کی بیوی کی مظلومیت نے مجھے اس پر بھی ترس کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خدا اور قانون کا مجرم تھا۔ اسے سزا یا جزا دینا بھی ان ہی کے اختیار میں تھا۔ میں ان ہی سوچوں میں گم بیرونی برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ یکایک اونچی ایڑی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ کوئی عورت تیزی سے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ میگی تو نہیں ہو سکتی

اس لیے کہ وہ اونچی ایڑی کے سینڈل نہیں پہنے ہوئے تھی۔ تو پھر یہ کون ہو سکتی تھی؟ ہو سکتا ہے میگی نے مجھے میڈم کے بارے میں غلط بتایا ہو اور یہ وہی ہو! بہر حال۔ ہر چہ بادا باد۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ ٹپ ٹپ کی آواز بالکل نزدیک آ گئی اور پھر میں نے میگی کو نہایت تیزی سے دوڑ کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا وہ اس وقت بدلے ہوئے لباس میں تھی۔ سفید نائٹ گون کی جگہ اب وہ ایک بغیر آستین کا چُست فراک پہنے ہوئے تھی۔ اس کی سینڈل بھی سفید تھی۔ بجلی کی دودھیا روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بھاگتے ہوئے اس کے تراشیدہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس لباس میں وہ کوئی آسمانی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید رنگ کا بیگ تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے نزدیک آئی تو اُس کی سانس بے ترتیب تھی اور چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

’’سر‘‘ وہ اپنے سانس کو قابو میں کرتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرایا؟‘‘

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا ’’اچھے وقت کا انتظار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا میگی۔‘‘

اس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو میرے بازو میں حمائل کر دیا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ نڈر اور بے باک نظر آ رہی تھی اور اس کا سبب مجھے اسکی سانسوں میں بسی ہوئی مہک نے بتا دیا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر اُس نے لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مشروب کی چُسکی لگا کر تازہ دم بھی کر لیا تھا۔

’’کم آن مائی ڈیر سر‘‘ اُس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا اور مجھے لیے ہوئے پورٹیکو میں کھڑی ہوئی سُرخ رنگ کی کھلی چھت کی کار کی طرف چل پڑی۔ میرے لیے اس نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سٹیرنگ سنبھال لیا۔

لمبی بل کھاتی ہوئی ڈرائیو وے کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے ہم بلند و بالا آہنی گیٹ تک پہنچ گئے۔ محافظوں نے کار کو دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا تھا اور اس سے گزرتے ہوئے میگی نے کار کی رفتار کم کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

عمارت کے گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی یہاں تک کہ وہ ۸۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد بھی اس نے ایکسی لیٹر پر اپنے پیر کا دباؤ کم نہیں کیا۔ وہ مدہوش کُن تیز خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا اس کی زُلفیں اُڑا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تیز رفتاری نے میرے ہوش بھی اُڑا دیئے تھے۔ میں بظاہر مطمئن اور بے خوف بیٹھا ہوا تھا، لیکن مجھے اپنے اعصاب اور خوف پر قابو پانے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ مجھے کار کی بڑھتی ہوئی رفتار سے اتنا ڈر نہیں تھا جتنا اس خیال سے تھا کہ وہ اس وقت خمار کے عالم میں تھی اور رات کی شبنم میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا لمحہ بہ لمحہ اس کے خمار میں اضافہ کر رہی تھی۔ ایسے عالم میں تیز رفتار کار کو قابو میں رکھنا خاصا مشکل ہو سکتا تھا۔

میں نے اسے باتوں میں لگانے کے لیے پوچھا ’’ساحل یہاں سے کتنی دُور ہے؟‘‘

’’صرف پچاس میل‘‘ اُس نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ ’’بس ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔‘‘ اس کے بعد اس نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔ ’’سر۔ آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟‘‘

’’ڈرنے کی کیا بات ہے‘‘ میں نے جی کڑا کر کے جواب دیا ’’مگر تم کار کی رفتار پر قابو رکھو۔‘‘

’’اس وقت تو آپ کے سمیت ہر چیز میرے قابو میں ہے سر‘‘ وہ بے تکلفی سے بولی۔ پھر ہنسی ’’کیوں۔ کیا غلط کہتی ہوں؟‘‘

میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ سڑک سنسان اور ویران تھی، لیکن کار کی بڑھتی ہوئی رفتار میرے لیے پریشان کُن تھی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ میگی کے ہوش و حواس رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے اور وہ بہکنے لگی تھی۔ اس کا ثبوت اس

www.pdfbooksfree.pk

کی گفتگو تھی۔ وہ نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہی تھی، لیکن اب اس کی آواز میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی اور اس کی باتوں میں ربط اور معنی کی کمی ہو گئی تھی۔

یکایک سمندر کی بھیگی ہواؤں نے موجوں کا پیغام سُنایا اور مجھے احساس ہو گیا کہ ہم ساحل کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ چند لمحے بعد دُور سے سمندر کی جھلک بھی نظر آنے لگی جو رفتہ رفتہ قریب تر ہو رہا تھا، لیکن میگی نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔ میں نے اسے ٹوکا "میگی۔ ہم ساحل پر پہنچ گئے ہیں۔ کار روک دو۔"

مگر میگی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے قریب ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ شاید نیم خوابی کے عالم میں تھی۔

"میگی میگی!" میں نے اسے جھنجھوڑا "کار روکو۔"

اس نے اچانک مجھے یوں چونک کر دیکھا جیسے خواب سے جاگی ہو۔ اس کی نگاہیں میری طرف تھیں اور ان جانے میں ہاتھ سٹیرنگ پر حرکت کر رہے تھے۔ تیز رفتار کار نے یک لخت رُخ بدلا اور میں نے چیخ کر اسے مطلع کیا "میگی۔ میگی۔ سامنے دیکھو۔"

میگی نے بہت مشکل سے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹا کر سامنے دیکھا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ کار پوری تیز رفتاری سے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میگی نے گھبرا کر دیکھا اور پوری قوت سے بریک پر دباؤ ڈالا۔ کار نے زور زور سے چند جھٹکے لیے، دو تین چکر کھائے اور پھر اُچھل کر قلابازیاں کھاتی ہوئی ایک طرف کو لڑھکنے لگی۔ میگی کے مُنہ سے ایک لمبی چیخ کی آواز نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ موت مجھے صاف طور سے اپنی نظروں کے سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو میری نگاہوں کے سامنے آسمان تھا جس پر بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے ہلکے چاند کی روشنی ان بدلیوں میں سے جھانکتی ہوئی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ساحل سمندر کی بھیگی ہوئی خنک ہوا میرے جسم کو گدگدا رہی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ اسی طرح چُپ چاپ سکون کے ساتھ آسمان پر بدلیوں کا یہ رقص دیکھتے دیکھتے سو جاؤں، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میں ایک کار کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ میں پریشانی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ شکر ہے کہ جسم پر کوئی کاری ضرب نہیں آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کار نے قلابازیاں لگانی شروع کیں تو میں اُچھل کر ساحل کی نرم نرم ریت پر جا گرا۔ میں نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ میگی اور اُس کی کار کو تلاش کرنا بھی ایک ضروری امر ہے۔ پھر مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بیہوش رہا تھا۔ میرے اردگرد نہ تو کار اور اس کے تباہ شدہ ڈھانچے کے کوئی آثار تھے اور نہ میگی کا کوئی نشان تھا۔ میں نے اپنے جسم کو ٹٹولا اور یہ اطمینان کر لیا کہ جسمانی طور پر میں بالکل محفوظ اور فِٹ تھا۔ میرے سامنے حدِ نظر تک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اسکی پُرشور مہیب موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بے نیل و مرام غصے میں جھاگ اُڑاتی ہوئی واپس لوٹ رہی تھیں۔ ہلکی چاندنی میں سمندر کا نیلا جھاگ اُڑاتا ہوا پانی ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا، لیکن میگی کہاں تھی؟ اور اس کی کار کہاں غائب ہو گئی تھی؟

اپنی مکمل خیریت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھائے۔ سمندر کی طرف جانا بے کار تھا۔ ساحل پر کسی قسم کی دیوار یا حد بندی نہیں تھی۔ یہ ایک بہت خوبصورت اور قدرتی بیچ تھی۔ اس لیے میں دیکھ سکتا تھا کہ سمندر میں میگی یا اسکی کار کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ اور باغات کا سلسلہ تھا۔ یہ اُجاڑ اور ویران قسم کے باغ تھے۔ بلکہ اُنہیں جنگل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے

ئیں جانب کے درختوں کی طرف رُخ کیا اور کافی دُور تک چلا گیا۔ یہ گھنا جنگل نہ تھا، لیکن پھر بھی درختوں کے انے پھیلے ہوئے تھے اور اس مدھم روشنی بلکہ نیم تاریکی میں دُور سے کسی چیز کو تلاش کر لینا آسان کام نہ تھا۔ ہاں سے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا وہاں ایک سایہ دار مقام پر میں نے میگی کی کار کو تلاش کر لیا۔ کار جانے کتنی قلابازیاں کھانے کے بعد اب پہلو کے بل پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے یہ ایک چمکدار اور قیمتی کار تھی، لیکن اب اس کی حیثیت کباڑ سے زیادہ نہ تھی۔ میں تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کار بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر اگر کوئی موجود ہوتا تو اس کی ہڈیاں تک سُرمہ بن گئی ہوتیں، لیکن کار خالی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میگی کو بھی کار نے میری طرح اُچھال کر کہیں دُور پھینک دیا تھا۔ کار کو جس نوعیت کا حادثہ پیش آیا تھا اس کے پیشِ نظر اس میں آگ لگ جانی چاہیئے تھی جبکہ وہ آتشزدگی سے بھی محفوظ رہی تھی۔ یہ تمام باتیں اس امر کی نشاندہی کر رہی تھی کہ میگی بھی اس حادثے میں ہلاک نہیں ہوئی ہے اور قدرت کے معجزے کے طور پر زندہ سلامت بچ گئی ہے، لیکن وہ تھی کہاں؟

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور پھر درختوں کے جھنڈ میں جا کر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ قریباً آدھ فرلانگ گیا ہوں گا کہ میرے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ درختوں کے اس سلسلہ کے بعد پھر ساحل شروع ہو جاتا تھا۔ ساحل پر میں کچھ فاصلے پر ایک موٹر بوٹ کا ہیولا صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک اور چھوٹی بوٹ بھی موجود تھی، لیکن کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ابھی تک بے خوف و خطر اور بے دھڑک آگے بڑھ رہا تھا، لیکن اب احتیاط لازم تھی۔ چنانچہ میں نے ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں نے بڑی موٹر بوٹ کی طرف سے کچھ آوازیں سُنیں اور پھر ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ اُبھری اور اُس کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی دُور تک پھیل گئی ——

میں دبے پاؤں موٹر بوٹ کی طرف بڑھا، لیکن پھر میرے قدم جیسے زمین نے تھام لیے۔ چھوٹی موٹر بوٹ سے ٹیک لگائے ہوئے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا ہیٹ تھا اس کے ہاتھ میں ایک خودکار مشین گن تھی اور وہ عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ میرے ریت میں چلنے اور سمندر کے شور کی وجہ سے وہ میرے قدموں کی آہٹ نہیں سُن سکا تھا ورنہ اس کے لیے مجھے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بڑی بوٹ کی طرف سے ایک بار پھر چیخ کی آواز سنائی دی، مشین گن بردار نے اس طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا، لیکن مجھے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ بوٹ سے آنے والی آواز ایک زنانہ آواز تھی۔ میں نے ایک لمبا چکر کاٹا اور پہریدار کے عقب میں جا پہنچا۔ اس کے کان موٹر بوٹ کی طرف لگے ہوئے تھے اور نگاہیں ساحل کی طرف نگراں تھیں۔ پھر سمندر کی موجیں اور ساحل کی پُرشور ہوائیں بھی میری مددگار تھیں۔ میں اس کے سر پر پہنچ گیا، لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ جب ایک سوکھے ہوئے پتّے کے چرچرانے کی آواز پر وہ برق رفتاری سے مُڑا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا دایاں ہاتھ پوری طاقت سے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگا اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح اوندھے مُنہ ریت پر گر گیا۔ میں نے اس کی مشین گن پر قبضہ جمانے کے بعد پہلے یہ تصدیق کرنے کی کوشش کی کہ وہ تنہا ہی تھا یا اس کا کوئی اور ساتھی بھی اس پاس موجود تھا۔ لیکن وہ درحقیقت تنہا تھا اور شاید اسی وجہ سے اتنی آسانی سے میرا شکار بن گیا تھا۔ اس غیر آباد اور ویران ساحل پر دو پُراسرار موٹر بوٹس کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ یہ لوگ غیر قانونی سرگرمیوں

www.pdfbooksfree.pk

میں ملوث تھے۔ اب میرے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو چُپ چاپ اپنی راہ لیتا یا پھر موٹر بوٹ پر جا کر یہ کھوج لگانے کی کوشش کرتا کہ آخر یہ لوگ کون تھے اور اس جگہ کیا کر رہے تھے؟ پھر شاید مجھے میگی کے بارے میں بھی کوئی اطلاع مل سکتی تھی۔ اگرچہ میگی کی خبرگیری نہ تو میرے فرائض میں شامل تھی اور نہ ہی میں اس کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی ارادہ رکھتا تھا، لیکن پھر کچھ سوچنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے موٹر بوٹ پر جانا ضرور چاہیئے۔ خدا جانے موٹر بوٹ پر کتنے لوگ موجود تھے اور ان کے ارادے کیا تھے؟ ہو سکتا ہے کہ ان کے خطرناک ساتھی اِردگرد بھی موجود ہوں اور میں بے خبری میں ان کا نشانہ بن جاؤں۔ پھر میرے پاس کوئی سواری موجود نہ تھی۔ اگر وہ لوگ مجھے گرفتار کرنے پر تُل جاتے تو میں ان سے بھاگ کر زیادہ دُور نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس مقولے پر عمل کیا کہ بہترین دفاع یہ ہے کہ جارحانہ حملہ کر دیا جائے، لیکن موٹر بوٹ پر جانے سے پہلے میں نے پہریدار کی خاکی بش شرٹ اور بڑا سا ہیٹ اپنے قبضے میں کر لیا اور انہیں زیب تن کرنے کے بعد مجھے یہ احساس ہُوا کہ نیم اندھیرے میں مجھے پہلی نظر میں کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔ بش شرٹ میں نے اپنی قمیص کے اوپر ہی پہن لی اور پہریدار کو مزید بے عمل رکھنے کی غرض سے میں نے اس کی گُدّی پر ایک اور ہلکی سی ضرب لگا دی۔ "سوری بھائی،" میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا، "مگر میں حفاظتِ خود اختیاری کے تحت بے ہوشی کے عالم میں بھی تم پر ہاتھ اٹھا رہا ہوں۔ معاف کر دینا۔"

اس کے ہیٹ اور مشین گن پر قابو پانے کے بعد میں اپنے آپ کو بڑا اعتماد محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کے بے ہوش بھاری بھرکم جسم کو دھکیل کر ایک درخت کی آڑ میں لٹا دیا اور خود اُسی کے انداز میں چھوٹی موٹر بوٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ دُور سے دیکھنے پر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ پہلا پہریدار اس وقت ساتویں آسمان کی سیر کر رہا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور شخص لے چکا ہے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ ساحل پر کوئی سواری موجود نہ تھی۔ سب سے مجھے اس علاقے اور اس جگہ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ نہ میں ان لوگوں کے بارے میں جانتا تھا جن کی صف میں میں دانستہ طور پر شامل ہو گیا تھا۔ اس اُلجھن سے نجات حاصل کرنے کا میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم کی آرام دہ اور پُرآسائش مہمان داری سے مُنہ موڑ کر میں نے کوئی مصیبت گلے لگا لی ہے؟ پھر مجھے یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ شوکت کی غیر موجودگی اور معاہدے پر پُراسرار انداز میں دستخط ہو جانے کے بعد میرا پہلی فرصت میں گھر واپس پہنچنا ضروری تھا جبکہ فی الحال اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میرے خیالوں کے تسلسل کو ایک نہایت طویل اور دل خراش چیخ نے توڑ دیا۔ اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ کسی عورت کی ہی چیخ تھی اور موٹر بوٹ کی طرف سے اس کی آواز آئی تھی۔ میرے قدم بے اختیار اور بے ارادہ مجھے موٹر بوٹ کی طرف لے چلے۔ چند لمبے ڈگ بھر کر میں موٹر بوٹ کی سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے چیخ کی آواز دوبارہ آئی اور میرے قدموں میں اور زیادہ تیزی ہو گئی۔ میں قریب قریب بھاگتا ہُوا موٹر بوٹ کے اوپر پہنچ گیا۔ چوبی سیڑھیاں نیچے کی طرف جاتی تھیں اور اسی طرف سے باتوں اور چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیز تمباکو کی خوشبو کے جھونکوں نے بھی مجھے مطلع کر دیا کہ نیچے ایک سے زائد آدمی موجود ہیں۔ بالائی حصے میں کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ اس لیے میں نے دبے پاؤں سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے جانے کا ارادہ کر لیا۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر دباؤ پڑا تو وہ "چوں چوں" کی آواز دینے لگیں، لیکن میں دل کڑا کر کے چند سیڑھیاں اُتر گیا۔ نیچے ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک چرمی صوفے پر ایک دیو قامت انسان دوسری کرسی پر پیر پھیلائے نیم دراز تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پائپ تھا جس کو وہ مسلسل پی رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول تھا۔ اس کے جسم پر ایک نیکر

کے سوا کوئی اور لباس نہ تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے کھچڑی بال جنگلیوں کے انداز میں بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انسانوں سے مختلف کوئی غیر انسانی مخلوق نظر آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سُرخ آنکھیں ایک کونے میں سمٹی ہوئی میگی پر جمی ہوئی تھیں۔ میگی کا قیمتی گاؤن جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ ایک سہمے ہوئے بے بس شکار کی طرح خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ دیو نما انسان سے کچھ فاصلے پر ایک اور شخص ہاتھ میں ہنٹر تھامے ہوئے کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ بذاتِ خود ایک قد آور آدمی تھا، لیکن اُس دیو کے مقابلے میں وہ بچہ نظر آتا تھا۔ وہ لباس سے ملّاح نظر آتا تھا۔ اس کا لباس میلا کچیلا اور بوسیدہ تھا۔ سر پر ایک اونی ٹوپی رکھی ہوئی تھی جسے وہ اپنے بائیں ہاتھ سے بار بار سر پر جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سامنے لکڑی کے فرش پر ایک شخص بے حس و حرکت پڑا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ خون اس کے آس پاس بکھرا ہوا تھا۔ میگی کبھی کبھی خوف زدہ نظروں سے اس لاش کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ باقی دونوں آدمی اس لاش سے قطعی بے پروا اور بے تعلق نظر آتے تھے۔

"میگی بے بی": جب دیو قامت انسان بولا تو اس کی بھاری بھرکم آواز کمرے میں بادلوں کی گرج کی طرح گونجنے لگی۔ "سچ سچ بتا دو یہ آدمی کون تھا اور تمہیں میڈم نے کس مشن پر ادھر بھیجا تھا۔"

میگی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "یقین کرو داور۔ میں اس آدمی کو نہیں جانتی۔ تم نے ایک بے گناہ شخص کو غلط فہمی میں جان سے مار ڈالا۔ میں نے اُس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی یہ میڈم کا آدمی ہے۔"

"مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اُس چوہیا کو ہمارے یہاں آنے کی خبر کس نے دی۔"

"بائی گاڈ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔" میگی گڑگڑائی۔ "مجھے یہاں کسی نے نہیں بھیجا۔"

"تو پھر تم اتنی رات گئے اس ویران علاقے میں کیوں آئی ہو؟"

میگی خاموش اس کو دیکھتی رہی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "کہہ دو کہ تم ساحل پر ہوا کھانے آئی تھی۔"

"یہ بالکل سچ ہے داور۔" میگی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں یہاں کسی مشن پر نہیں آئی۔ میں تو محض گھومنے کے لیے آئی تھی۔"

"گھومنے کے لیے۔" داور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اتنی رات گئے اور وہ بھی اکیلی۔؟"

"میں اکیلی نہیں تھی۔" وہ گڑگڑائی۔ "میرے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔"

"آدمی؟" داور پھر ہنسنے لگا۔ "کون آدمی؟ تمہارا بوائے فرینڈ؟"

"نہیں۔ وہ میڈم کا خاص مہمان ہے۔"

"اوہو اوہو۔" داور صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پہلی بار مجھے اس کے حیرت انگیز قد و قامت کا اندازہ ہوا۔ اس کا قد پونے سات فٹ سے کسی صورت کم نہ ہو گا۔ قد کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بھی اس کے مطابق ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لحیم شحیم دیو قد نظر آ رہا تھا۔ میگی اور دوسرا شخص اس کے سامنے بونے نظر آنے لگے تھے۔ "میگی۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ وہ چڑیل اپنی خوبصورت ملازماؤں کو بڑی فراخ دلی سے لوگوں کے حوالے کر دیتی ہے، لیکن تمہاری یہ مجال کیسے ہوئی کہ اس کے مہمانِ خاص کے ساتھ رات کے سناٹے میں سیر و تفریح کے لیے نکل جاؤ۔ وہ اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ کسی کی بے تکلفی ہرگز برداشت نہیں کرتی۔"

"میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے داور۔ یہ مہمان کی خواہش تھی، بلکہ اس کا حکم تھا اور تم جانتے ہو کہ میڈم یہ بھی پسند نہیں کرتی کہ اس کے مہمانوں کی حکم عدولی کی جائے۔"

"چلو مان لیتے ہیں۔" داور نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ٹہلنا شروع کر دیا۔ "مان لیا کہ تم میڈم کے خاص آدمی

www.pdfbooksfree.pk

کو سیر کرانے کے لیے نکلی تھیں مگر بابا؟" "بے بی میگی۔ وہ مہمان ہے کہاں؟"

"وہ میرے ساتھ کار ہی میں تھا۔ جب کار کا ایکسیڈنٹ ہوا تو وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہُوا؟ وہ کہاں چلا گیا؟ خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا؟"

"اگر زندہ ہوتا تو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا۔" داور نے پستول اپنی نیکر میں اُڑس لیا اور پائپ سُلگانے لگا۔ "اگر مر گیا ہوتا تو اس کی لاش مل جاتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بھوت کی طرح تمہاری برابر والی سیٹ سے اچانک غائب ہو گیا۔ تم نے فرضی کہانی اچھی سنائی ہے بے بی۔" اُس نے پائپ کے لمبے لمبے کش لگانے شروع کر دیئے اور کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ "سمندر کے کنارے ہمیں صرف یہ شخص ملا تھا جس کی لاش تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔"

"میرا یقین کرو داور....."

"یقین اور تمہارا؟!" داور کے فلک شگاف قہقہوں سے سارا کمرہ لرزنے لگا۔ "بے بی۔ مَیں تمہیں اور تمہاری میڈم کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ زہریلی ناگن پر یقین کیا جا سکتا ہے مگر تم لوگوں پر یقین کرنے والا دُنیا کا سب سے بڑا بیوقوف شخص ہو گا۔" پھر اس نے جُھک کر صوفے کے ہتھے پر رکھا ہُوا پستول اُٹھا لیا۔ یہ ایک بڑے سائز کا بھاری بھرکم پستول تھا، لیکن داور کے لمبے چوڑے ہاتھ میں ایک کھلونا معلوم ہوتا تھا۔

"تمہاری میڈم کو اپنے بارے میں بہت زیادہ غلط فہمی ہو گئی ہے میگی۔ اس نے دوسروں کے معاملات میں بھی ٹانگ اڑانی شروع کر دی ہے۔ شاید وہ اس خیال میں ہے کہ شیرو واپس آ کر اس کے ساتھ دوستی کا ایگریمنٹ کرے گا مگر اس کی یہ حسرت کبھی پوری نہیں ہو گی۔ کبھی پوری نہیں ہو گی۔" اس نے دوبارہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا اور اس کے بھاری بھرکم قدموں کے نیچے لکڑی کا فرش صدائے احتجاج بلند کرنے لگا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ٹہلتا اور سوچتا رہا۔ پھر وہ میگی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُسے گھورنے لگا۔ میگی نے اپنی نظریں جُھکا لیں۔

"بے بی۔ یہ مَیں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے بغیر میڈم زیادہ دن نہیں رہ سکتی اور وہ تم سے زیادہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہماری کھوج لگانے کا فرض بھی تم ہی کو سونپا ہے۔"

"داور!" میگی منت آمیز لہجے میں بولی۔ "تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ مَیں تمہاری کھوج لگانے نہیں آئی تھی۔ مَیں تو میڈم کے مہمان کے ساتھ ساحل کی سیر کے لیے آئی تھی۔"

"تو پھر وہ مہمان کہاں غائب ہو گیا۔" داور نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا۔ کار کا ڈھانچہ موجود ہے مگر اس کا تو ڈھانچہ اور انجر پنجر تک نظر نہیں آتا۔ آخر وہ گیا کہاں۔"

جواب میں میگی پریشانی سے اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"تم سمجھتی ہو کہ میری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو میگی اور چاہتی ہو کہ مَیں تمہارے جھوٹ پر یقین کر لوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ تمہاری میڈم ایک چالاک اور خطرناک عورت ہے۔ وہ ہماری کمزوریاں معلوم کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہماری ہر حرکت سے باخبر ہونا چاہتی ہے تاکہ جب چاہے ہمیں بلیک میل کر سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی رات گئے اس سنسان اور دُور دراز علاقے میں وہ اپنی ہمراز سیکرٹری کو ہرگز نہ بھیجتی اور پھر کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ تم ساحل کی سیر کرنے میں اُس وقت پہنچیں جب ہماری کشتیاں یہاں مال اُٹھانے کے لیے آئی تھیں۔"

"مجھے ان کشتیوں کی خبر نہیں تھی۔ مَیں تو خود حیران ہوں کہ میڈم کا مہمان کہاں غائب ہو گیا۔ ورنہ وہ میرے بیان

کی گواہی دے دیتا۔"

ہنٹر والا ملاح جو اس اثنا میں خاموش کھڑا اپنی ٹوپی سے کھیل رہا تھا، بے صبری سے بولا۔ "باس۔ یہ اس طرح نہیں مانے گی۔ مَیں اس کی زبان سے سچ اُگلوا سکتا ہوں۔ بس آپ کی اجازت کی دیر ہے۔" وہ ہنٹر کو ہوا میں جھٹکتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ گیا۔

داور کی نگاہیں میگی پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک ان میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ معنی خیز انداز میں کہنے لگا۔ "تم بیوقوف ہو جابر ـــــ میگی جیسی خوبصورت اور نرم و نازک عورتیں ضائع کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔ انہیں تو بہت احتیاط سے رکھنا چاہیئے۔ یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے اب ہمیں ایک لمبا سمندری سفر کرنا ہے۔ میڈم نے اپنی مہربانی سے میگی جیسی لڑکی کو ہمارا ہمسفر بننے کے لیے بھیج دیا ہے تو ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ تم جا کر کھانے کا بندوبست کرو۔ ہم لوگ کھانے کے بعد روانہ ہو جائیں گے اور ہاں۔ کھانے سے پہلے کچھ پینے پلانے کا بھی سامان لا دو۔ تم جانتے ہو کہ میگی اس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔"

جابر نے مایوسی سے میگی کو اور پھر داور کو دیکھا اور پھر اپنے ہنٹر کو اپنی ٹانگوں پر مارتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ مَیں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر عرشے پر پہنچ گیا اور برق رفتاری سے اسی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں مَیں نے محافظ کو مستعد کھڑا پایا تھا۔ مَیں نے نیم تاریکی میں جابر کو عرشے پر سے گزر کر ایک کیبن کی طرف جاتے دیکھا۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ داور ایک جرائم پیشہ اور قانون شکن گروہ سے تعلق رکھتا ہے اور ان لوگوں کی میڈم کے ساتھ دُشمنی ہے۔ داور کو یقین تھا کہ میڈم نے میگی کو محض اس کی سرگرمیوں کا کھوج لگانے کے لیے ساحلِ سمندر پر بھیجا تھا۔ میگی کے بیان پر اُسے یقین نہیں آ رہا تھا اور آتا بھی کیسے؟ میگی اپنی سچائی کے ثبوت میں میڈم کے مہمان کو پیش نہیں کر سکتی تھی۔ میری جگہ ساحل پر موجود کوئی اور بدقسمت اجنبی داور کے ہتھے چڑھ کر ہلاکت کا نشانہ بن گیا تھا۔

مَیں اپنی جگہ کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ صاف ظاہر تھا کہ داور میگی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ مجھے اُن کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی ضرورت تھی اور نہ خواہش۔ مجھے میگی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ جس قسم کے ماحول میں کام کر رہی تھی۔ وہاں اس قسم کے واقعات سے دوچار ہو جانا کوئی حیرت انگیز اور خلافِ توقع بات نہیں تھی۔ اس وقت بظاہر معصوم اور بے سہارا نظر آنے والی میگی جرائم کی دنیا میں پروان چڑھی تھی اور میڈم کے سائے سے محروم ہونے کے بعد داور کے قبضے میں چلا جانا اس کے لیے کوئی زیادہ اَن ہونی بات نہ ہوتی، لیکن سوال یہ تھا کہ اُن حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ بلاوجہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا میرے لیے کسی طرح بھی سُودمند نہ تھا۔ یکایک میری توجہ سمندر میں ایک ہیولے کی طرف مبذول ہو گئی جو تیزی سے ہماری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ مجھے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ایک موٹر بوٹ تھی جس کا سائز داور کی بوٹ کے برابر تھا۔ اس بوٹ میں کوئی روشنی نہیں تھی اور وہ خاموشی کے ساتھ خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر کی پُرشور ہواؤں میں مِلی جُلی ایک اور آواز نے بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ آواز ساحل کی طرف سے آ رہی تھی۔ مَیں تیزی سے بوٹ کے پاس سے ہٹ کر درختوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا جنگل کی طرف بڑھا۔ اب میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں اور مَیں دور سے آتی ہوئی دو جیپ گاڑیوں کو بخوبی دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں جیپیں بھی خاصی تیز رفتاری سے اسی طرف بڑھی آ رہی تھیں۔ داور کی موٹر بوٹ پر مکمل خاموشی تھی۔ اس کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ جابر کچن میں کھانے کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا جبکہ داور کی دل بستگی کے لیے میگی جیسا کھلونا موجود تھا۔ اس لیے وہ دونوں اپنے آس پاس رونما ہونے والے

www.pdfbooksfree.pk

واقعات سے قطعی بے خبر تھے۔ میری چھٹی حس نے مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا اور میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا موٹر بوٹ اور ساحل سے مخالف سمت میں بڑھنے لگا۔ جیپ گاڑیوں کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں، جو اس بات کی علامت تھیں کہ وہ لوگ موٹر بوٹ میں موجود لوگوں کو اپنی آمد سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ جیپ گاڑیاں اب واضح نظر آنے لگی تھیں یہاں تک کہ وہ ساحل سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک گئیں ان سے پانچ مسلح افراد کُود کر باہر نکلے اور چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے آس پاس درختوں کے سائے میں پناہ لے لی۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے رُکے رہے پھر اُنہوں نے تیزی سے داور کی بوٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ یہ لوگ مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور داور کی بوٹ پر شب خون مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔

مجھے سکول کے زمانے میں پڑھی ہوئی نظم یاد آگئی کہ ؎

جب کہ دو موذیوں میں ہو کھٹ پٹ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ

چنانچہ میں نے فوری طور پر جیپ گاڑیوں کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اُنہیں اس ویران اور غیر آباد مقام پر قدرت نے میری نجات کے لیے ہی بھیجا تھا اور میں قدرت کی اس مہربانی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

وہ پانچوں مسلح افراد مختلف سمتوں سے موٹر بوٹ کی طرف بڑھ رہے تھے جبکہ سمندر میں نمودار ہونے والی موٹر بوٹ بھی داور کی بوٹ سے کچھ دور پہنچ کر رُک گئی تھی۔ یکایک اس کی تمام لائٹیں روشن ہو گئیں اور سامنے کا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ داور کی موٹر بوٹ اور دوسری چھوٹی کشتی اب روشنی میں نمایاں نظر آنے لگی تھیں۔ وہ تو غنیمت ہے کہ میں بروقت وہاں سے ہٹ گیا تھا ورنہ ان کے نرغے میں آجاتا۔ سمندر میں کھڑی ہوئی موٹر بوٹ سے اور فائر ہوئے جن کی گونج دُور تک پھیل گئی۔ اسی وقت میں نے داور کی موٹر بوٹ میں جابر کو عرشے پر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے فوراً بعد داور کا دیو قامت جسم نظر آیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک سٹین گن تھامے ہوئے تھا۔

لاؤڈ سپیکر پر ایک کرخت آواز بلند ہوئی: "تم ہر طرف سے گھیر لیے گئے ہو۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔" اس کے ساتھ ہی چھوٹی گنوں کے دو اور دھماکے ہوئے اور داور کی موٹر بوٹ کے آس پاس بم گرنے کی وجہ سے پانی اُچھل کر دُور دُور تک پھیل گیا۔ داور لپک کر آڑ میں غائب ہو گیا۔ اب جیپ گاڑیوں سے اُترنے والے لوگ بھی موٹر بوٹ کے نزدیک پہنچ گئے تھے اور درختوں کے سایوں میں پوزیشن لیے آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ان سب کی توجہ موٹر بوٹ پر کھڑے داور اور جابر کی طرف مبذول تھی۔ یہ میرے لیے بہترین موقعہ تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ جیپ گاڑیوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا، لیکن میں پوری طرح چوکنا تھا۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ جیپوں میں کوئی اور بھی موجود ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ دل ہی دل میں یہ دُعا بھی مانگ رہا تھا کہ چابیاں بھی ان میں موجود ہوں ورنہ میری ساری جدّوجہد رائیگاں چلی جائے گی۔ میری تمام تر توجہ جیپوں کی طرف تھی اور جب میں قریب قریب دوڑتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ایک جیپ کے اندر ڈرائیور موجود تھا اور جب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ کھلی جیپ سے کُود کر باہر نکل آیا تھا اگر اس کی نظریں اور توجہ موٹر بوٹ کی طرف نہ ہوتی تو اس سے پہلے ہی وہ مجھے دیکھ چکا ہوتا اور میں نہایت آسانی سے اس کی گولی کا نشانہ بن گیا ہوتا، لیکن قدرت کو مجھے بچانا مقصود تھا اس لیے ہر کام میری خواہش اور ضرورت کے مطابق ہو رہا تھا۔ جیسے ہی وہ جیپ سے باہر نکلا اس نے اپنی کمر میں لٹکے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھا کر پستول نکال لیا۔ اس کا فائر میرے سر کے پاس سے گزر گیا۔ میں فوراً زمین پر گر گیا اور تیزی سے ریت پر قلا بازیاں کھاتا ہوا دوسری جانب پہنچ گیا۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور گولیاں میرے جسم کے نزدیک ریت میں پیوست ہو گئیں۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جواب میں فائر کروں۔ محافظ سے چھینی ہوئی سٹین گن میرے

ہاتھ میں تھی اور اُنگلی کا معمولی سا دباؤ میرے مخالف کا جسم چھلنی کر سکتا تھا مگر میں خواہ مخواہ کسی کی جان لینے کا خواہشمند نہیں تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ میری اس کے ساتھ کوئی ذاتی دُشمنی بھی نہیں تھی، لیکن بعض اوقات صورتِ حال ایسی ہو جاتی ہے کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے اقدامات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک بار پھر مجھے نشانہ بنانے کے لیے پستول تان رہا تھا، لیکن میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔ سٹین گن سے ایک گولی نکلی اور پستول اس کے ہاتھ سے اُچھل کر دُور جا گرا۔ اس نے بے اختیار اپنی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ میں اتنی دیر میں اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا میں نے اس کا بازو موڑ کر اسے بالکل بے بس کر دیا۔ ہم ساحل سے کافی فاصلے پر تھے اور پھر ساحلی ہواؤں کے جھونکوں کے شور کے باعث بھی فائرنگ کی آوازیں دوسرے لوگوں تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ وہ ایک طاقتور اور سخت جان آدمی تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔ میں نے اس کے بازو پر دباؤ ڈالا۔ ایک خفیف سا جھٹکا اس کے بازو کو توڑ سکتا تھا۔ اس کی جدّوجہد ہلکی پڑ گئی۔

"کون ہو تم؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا "یہاں کیوں آئے ہو؟ اور تمہارے ساتھی کون لوگ ہیں؟"

جواب میں وہ خاموش رہا۔ شاید وہ مجھے بھی داور کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا: "کیا تم میڈم کے آدمی ہو اور میگی کی مدد کے لیے آئے ہو؟"

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش کی: "میں میڈم کا مہمان ہوں۔ ان کا دُشمن نہیں ہوں۔ میگی کے ساتھ سمندر کی سیر کے لیے آیا تھا۔ کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ لوگ میگی کو پکڑ کر لے گئے۔"

اس کی جدّوجہد بالکل بند ہو گئی۔ "سوری سر" وہ شائستہ لہجے میں بولا۔ "میں نے آپ پر گولی چلائی۔ مگر میں آپ کو جانتا نہیں تھا۔"

میں نے اس کا بازو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

"کیا تم لوگ میگی کو آزاد کرانے آئے ہو؟" میں نے پُوچھا۔

"ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ مس میگی داور کی بوٹ پر موجود ہیں۔ دراصل ہمارے مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ داور ہمارے علاقے میں مال اُتار رہا ہے ہم لوگ اس کو گھیرنے کے لیے آئے ہیں۔"

"اور سمندر میں وہ بوٹ کس کی ہے؟"

"وہ بھی ہماری ہے سَر۔ ہم نے داور کے بھاگنے کے سارے راستے روک دیئے ہیں۔ میڈم کے علاقے میں کسی کو کارروائی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو ایسی حرکت کرتا ہے وہ اس کی سزا بھی بھگتتا ہے۔"

میڈم کے کارندوں کی ہوشیاری اور مستعدی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس عورت نے اپنے گروہ کو انتہائی منظم اور باعمل بنا دیا تھا جو میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ ساحل کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں اب مسلسل آرہی تھیں۔ ان میں گنوں کی گھن گرج بھی شامل تھی۔

"سَر! مجھے اُن لوگوں کو خبر کر دینی چاہیے کہ داور کی بوٹ پر مس میگی بھی موجود ہیں۔ ایسا نہ ہو وہ موٹر بوٹ کو تباہ کر دیں اور مس میگی کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے۔"

"واقعی۔ میگی کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے۔" میں نے اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کا ساحل کی طرف چلا جانا خود میرے لیے فائدہ مند تھا۔ اس نے بلا تاخیر زمین پر گرا ہوا پستول اُٹھایا اور بھاگتا ہوا موٹر بوٹ کی طرف چلا گیا۔ میرے لیے اب میدان صاف تھا۔ دونوں جیپ گاڑیاں میرے سامنے کھڑی ہوئی تھیں اور مجھے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ میں لپک کر ایک جیپ میں سوار ہو گیا۔ چابی اس میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس دوران

www.pdfbooksfree.pk

میں اپنا لائحہ عمل سوچ لیا تھا۔ جیپ کو سٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے سٹین گن اٹھائی اور دوسری جیپ کے چاروں ٹائر بیکار کر دیئے۔ ان جیپ گاڑیوں کے مسافر اس وقت یہاں سے دُور اپنے دُشمن سے جنگ کرنے میں معروف تھے اُن تک شاید میری فائرنگ کی آواز بھی نہیں پہنچی ہوگی۔ سٹین گن میں نے وہیں ڈال دی اور جیپ کو سٹارٹ کر کے اس طرف کا رُخ کیا جدھر سے میرے اندازے کے مطابق وہ لوگ آئے تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک بار مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا جہاں سے مسلسل فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اب جوابی کارروائی کے طور پر غالباً داور کی بوٹ سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔ مجھے ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کوئی ہمدردی یا دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ میگی پر نہ جانے کیا بیتے گی؟ اس کو ساحل تک لانے کے لیے میں نے ہی اُکسایا تھا۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر میڈم کی قید سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ موقعہ مل گیا تھا لیکن میگی کی زندگی خطرے میں تھی۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ مقابلہ کافی دیر تک جاری رہے گا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میری منزل مقصود ایئر پورٹ تھی۔ میری جیب میں میرا پرس اور کچھ پیسے موجود تھے۔ پہلی فلائیٹ سوا سات بجے کے قریب روانہ ہوتی تھی۔ اَب مسئلہ صرف یہ تھا کہ اگر میں اس ویران ساحلی علاقے سے نکل کر کسی سڑک پر نکل جاؤں اور بروقت ایئر پورٹ پہنچ جاؤں تو پہلی فلائیٹ پکڑ سکتا تھا۔

میں اپنے اندازے کے مطابق تیزی سے جیپ دوڑاتا رہا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ ان لوگوں میں سے کوئی میرا تعاقب نہیں کرے گا۔ ان کے پاس اس مقصد کے لیے کوئی سواری نہیں تھی۔ گویا میں اس لحاظ سے بالکل محفوظ اور مامون تھا۔ ساحلی علاقے کی ریتلی زمین پر کاروں کے نشان بھی باقی نہیں رہتے۔ ورنہ میں ان ہی سے راہنمائی حاصل کر لیتا۔ قریباً بیس منٹ کے بعد مجھے ساحلی علاقہ ختم ہونے کے آثار نظر آئے اور بالآخر میں ایک پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔ سامنے سے گزرنے والے ایک ٹرک کو روک کر میں نے ڈرائیور سے ایئر پورٹ کا راستہ پوچھا اور اسے ذہن نشین کرنے کے بعد آگے روانہ ہو گیا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق میں ایک گھنٹے میں ایئر پورٹ پہنچ سکتا تھا۔ میرے ذہن میں واپسی کے سوا کوئی اور خیال نہیں تھا۔ اس شہر میں وارد ہونے کے بعد مجھے پے در پے جن ڈرامائی اور افسانوی واقعات سے دوچار ہوا پڑا تھا۔ میں نے اس وقت ان کے بارے میں بھی سوچنا مناسب نہیں سمجھا۔ ملک برکت، میڈم، میگی غرضیکہ ہر چہرہ دُھند میں چھپ چکا تھا۔ اَب میں صرف اور صرف اپنی واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ روزی، اس انتظار میں میرے غائب ہو جانے کی وجہ سے کتنی پریشان ہوگی؟ پھر مجھے شوکت کی طرف سے بھی خاصی فکر تھی۔ اس کا بروقت میرے پاس نہ پہنچنا اور اس کی طرف سے کسی اطلاع کا نہ ملنا بھی میرے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ خدا کرے وہ کسی حادثے سے دوچار نہ ہوا ہو۔ روزی غریب کو تو میں فون پر بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ وہ میری طرف سے کس قدر فکرمند اور پریشان ہوگی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ وہ ایک مثالی بیوی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی پہلی محبت کوئی اور تھی اور میں ابھی تک اسے بھلا نہ سکا تھا۔ اس کے باوجود اسے مجھ سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ میں اسے جتنا بھی جذباتی احساس فراہم کر سکا تھا وہ اسی پر بالکل قانع تھی۔ عاشی کو فراموش کر دینا میرے لیے قطعی ممکن نہ تھا لیکن اسے کھونے کے بعد روزی جیسی وفا شعار محبت کرنے والی اور خدمت گزار بیوی کا حاصل ہو جانا بھی میری خوش قسمتی تھی۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا مجھے شاد کام اور تر و تازہ کر رہی تھی۔ اَب ہوا میں نمی کا احساس باقی نہیں رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں سمندر سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی اور سویرا قدم بہ قدم پھیل رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی اس لیے مجھے جیپ کو تیز رفتاری سے چلانے میں کوئی دِقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ اِن چند حیرت انگیز ایام میں مجھ پر جو کچھ بیت چکی تھی میں اس کی طرف سے قطعی بے نیاز تھا۔ میں اِن دِنوں کو ایک ناخوشگوار خواب سمجھ کر بھول جانا

چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے گھر اور دوستوں کی پُرسکون دُنیا میں واپس پہنچ کر میں پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں منہمک ہو جاؤں گا۔ البتہ عاشی کا اچانک سامنا اور اس کے ساتھ مُلاقات کا واقعہ میرے ذہن اور دِل میں ایک ہلچل مچا دینے کا سبب ضرور بن گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے زخم کو بھر دیتا ہے لیکن وقت کا یہ مرہم میرے دِل کے اُس گھاؤ کو بھرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ جو عاشی کی جدائی کا نتیجہ تھا اور اب جب کہ عرصۂ دراز کے بعد عاشی سے ایک حادثاتی مُلاقات نے تمام پرانی یادوں کو تازہ کر دیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مستقبل کی زندگی میرے لیے زیادہ اذیت بخش اور بے چینی سے بھرپور ہوگی یا اس ملاقات سے میرے دِل کو سکون حاصل ہوگا۔ عاشی سے مِلنے کے بعد میں پے در پے حادثات سے دوچار ہوتا رہا تھا اس لیے میں یکسوئی سے اس کے بارے میں غور نہیں کر سکا تھا۔ پھر بھی اس ملاقات نے پُرانی یادوں کو تازہ اور پُرانے زخموں کو ہرا کر دیا تھا۔

اب شہر کا بارونق علاقہ شروع ہو چکا تھا اور سڑکوں پر ٹریفک میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن میں ایئر پورٹ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ مزید دس منٹ بعد میں اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے ایک کار میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میری جیپ کی رفتار بہت تیز تھی اس کے باوجود یہ کار مسلسل میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک سیاہ رنگ کی پُرانے ماڈل کی کار تھی۔ درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ میں اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اس لیے یہ اندازہ لگانا مُشکل تھا کہ اس میں کتنے لوگ سوار تھے۔ میں نے اپنے شُبہ کی تصدیق کرنے کی غرض سے جیپ کو ایک سائیڈ روڈ پر موڑ دیا۔ سیاہ کار بھی میرے پیچھے اس سڑک پر مُڑ گئی۔ اَب تک اس کار نے مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اب اس بات میں شُبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ لوگ میرے تعاقب میں تھے۔ وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ میڈم کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے تو پھر وہ کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؟ میں نے جان بُوجھ کر اپنا راستہ تبدیل کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ خواہ کوئی بھی تھے میں انھیں اپنے پیچھے ایئر پورٹ تک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی وقت کم رہ گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر ایئر پورٹ پہنچ کر پہلی فلائیٹ پر سوار ہونا چاہتا تھا مگر اَب یہ سیاہ کار میری راہ میں رُکاوٹ بنتی نظر آ رہی تھی۔

میں نے بہت تیزی سے جیپ کو دو تین سڑکوں اور گلیوں میں گھمایا۔ میں زیادہ رِسک بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس شہر کی سڑکیں میرے لیے انجان تھیں۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں انھیں گمراہ کرنے کی کوشش میں خود ہی ایئر پورٹ کے راستے سے نہ بھٹک جاؤں۔ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ ورنہ میرے لیے اس تعاقب سے نجات حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔ مگر میری یہ مشکل ایک ریلوے کراسنگ نے آسان کر دی۔ میری جیپ ہوا کی رفتار سے بڑھتی ہوئی ریلوے کراسنگ تک پہنچی تو اس کا آہنی دروازہ بند ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہ نادر موقعہ تھا۔ میں نے ایکسیلیٹر کو دبایا اور جیپ ریلوے کراسنگ کو پار کر گئی۔ میں نے عقبی شیشے میں دیکھا تو ریلوے کراسنگ کا پھاٹک بند ہو چکا تھا اور سیاہ کار کراسنگ کے دوسری طرف پہنچ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے اس بروقت غیبی امداد پر خدا کا شکر ادا کیا اور ایک دو سڑکوں سے گزرنے کے بعد دوبارہ ایئر پورٹ جانے والی سڑک پر پہنچ گیا لیکن اس پر گامزن ہونے سے پہلے میں نے ایک جگہ جیپ روک کر تصدیق کرنی ضروری سمجھی کہ میں صحیح سمت جا رہا ہوں۔

ایئر پورٹ کی عمارت سامنے نظر آ رہی تھی لیکن میں احتیاط کے طور پر اس جیپ گاڑی کو ایئر پورٹ لے جانے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے ایئر پورٹ کے نزدیک ایک وسیع عمارت کے گیٹ میں جیپ داخل کر دی اور درختوں کے

www.pdfbooksfree.pk

نیچے اسے پارک کر دیا۔ تیزی سے چلتا ہوا بلکہ دوڑتا ہوا میں ایئر پورٹ کی طرف لپکا۔ تعاقب کرنے والوں سے نجات حاصل کرنے میں میرا کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ کاؤنٹر کے سامنے مسافروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ جب کہ مجھے ابھی ٹکٹ بھی خریدنا تھا۔ میں ریٹرن ٹکٹ لے کر آیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ ٹکٹ بھی میرے بریف کیس کے ساتھ ہی میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب مجھے نیا ٹکٹ بھی حاصل کرنا تھا۔ کاؤنٹر پر میرا واسطہ ایک خوش مزاج اور خوش شکل لڑکی سے پڑا۔ وہ سورج کی پہلی کرن کی طرح دمک رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔

وہ اس قدر خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے پیش آئی جیسے ہم کافی عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن جب میں نے اپنا مقصد بیان کیا تو اس کے پاس حرفِ معذرت کے سوا میرے لیے کچھ اور نہ تھا۔ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس فلائیٹ پر ایک بھی سیٹ خالی نہیں ہے۔ چانس پر بھی ایک درجن مسافر پہلے ہی قسمت آزمائی کرنے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ اگلی فلائیٹ چار گھنٹے بعد روانہ ہو گی۔ لیکن اس میں بھی کوئی سیٹ خالی نہیں ہے البتہ تیسری فلائیٹ پر قسمت آزمائی کی گنجائش ہے۔ وہ مسکرا رہی تھی اور میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میں کن مراحل سے گزر کر ایئر پورٹ پہنچا ہوں اور اگر میں اس فلائیٹ سے روانہ نہیں ہو سکا تو مجھے کتنے جانے اور انجانے خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا اور اگر بتا بھی دیتا تو اس کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آتا۔ وہ میرا مسئلہ حل نہیں کر سکتی تھی۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ شاید اس نے بھی میرے بدلتے ہوئے تاثرات کو محسوس کر لیا اور پہلی بار اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر؟"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے دراصل اس فلائیٹ سے میرا جانا بے حد ضروری ہے میری والدہ شدید بیمار ہیں۔ ان کی حالت نازک ہے۔"

اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہ تھا اور غالباً پہلی بار اسے احساس ہوا کہ میں بے سروسامان کیوں نظر آ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے سر لیکن میں مجبور ہوں۔ اس فلائیٹ پر سیٹ ملنا ممکن نہیں ہے۔" اس کی آواز ہمدردی سے بھرپور تھی اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ تشویش میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے کاؤنٹر سے چلا آیا۔ لاؤڈ سپیکر پر ہوائی جہاز کے مسافروں سے مسافر لاؤنج میں تشریف لے جانے کی درخواست کی جا رہی تھی لیکن چیک اِن ہونے والے کاؤنٹر پر اب بھی ایک خاصی لمبی قطار موجود تھی۔ میں خالی الذہن ہو کر بلا ارادہ اُس قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ میرے پاس ٹکٹ تک نہیں تھا لیکن وقتی طور پر میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہو گیا تھا۔

کاؤنٹر پر ایک درمیانی عمر کے شخص نے بورڈنگ کارڈ حاصل کیا اور قطار سے نکل کر باہر آ گیا۔ مجھے اس شخص کی خوش قسمتی پر رشک آ رہا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سیاہ رنگ کے بریف کیس کو ہلاتا ہوا مسافروں کی قطار سے دُور جا رہا تھا۔ اس نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور ہال میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے مسافر لاؤنج میں جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی کی گھڑی کو اور پھر بیرونی دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ چند لمحے وہ ایک جگہ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں ٹوائیلٹس بنے ہوئے تھے۔ میں بدستور قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ایک بے معنی حرکت تھی۔ ٹکٹ کے بغیر مسافروں کی قطار میں کھڑے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ پھر بھی میں قطار میں سب سے آخر میں کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ واپس چلا جاؤں یا ایئر پورٹ ہی پر ٹھہر کر اگلی فلائیٹ کے لیے

قسمت آزمائی کروں؟ اچانک میری نگاہ ایئر پورٹ کے بیرونی حصے پر پڑی اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میرا تعاقب کرنے والی سیاہ کار ایئر پورٹ کے پارکنگ لاٹ سے نکل کر آہستہ آہستہ ایک طرف کو جا رہی تھی۔ اب میں کار میں سوار لوگوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ اس میں دو اور تنومند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا دھیان پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ غالباً وہ وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں میری جیپ کو تلاش کر رہے تھے۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے ایک بار پھر میری راہنمائی کی تھی۔ میں نے جیپ کو ایئر پورٹ تک نہ لا کر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ فاصلے پر عمارت میں کھڑی ہوئی جیپ کو دیکھ لیں اور مجھے تلاش کرتے ہوئے اندر آ جائیں۔ میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔ کیا چاہتے تھے اور میرا پیچھا کیوں کر رہے تھے لیکن یہ بات طے تھی کہ وہ میری کھوج میں تھے اور ان کی وجہ سے میں اَن جانی مشکلات کا شکار ہو سکتا تھا۔ اب میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ خطرات سے دوچار ہونے کے بعد میں زیادہ باعمل اور مستعد ہو جاتا ہوں۔ میری یہ عادت ہمیشہ میرے کام آتی ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ میں نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چل پڑا۔ میرا رُخ غسل خانوں کی طرف تھا۔ غسل خانے میں داخل ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دوسرے کنارے پر واقع ایک بُوتھ میں مجھے ایک شخص کے پیر اور جوتے نظر آ رہے تھے اس کے سوا غسل خانے میں کوئی اور موجود نہ تھا اور میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بوتھ کی طرف چلا گیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بوتھ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے وہی مسافر برآمد ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بریف کیس سنبھالے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میری نظروں سے نظریں ملیں تو اس کے چہرے سے ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ عام طور پر دو انجانے لوگ ازراہ اخلاق نگاہیں ملنے پر مسکراتے ضرور ہیں۔ چنانچہ جواب میں مجھے بھی مسکرانا پڑا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میرا ہاتھ بلند ہوا اور میں نے اس کی گردن پر ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتا میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ تیزی سے اس کے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھے اور میں نے اس کا ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ نکال کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں اس کے دونوں بازوؤں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتا ہوا دوبارہ اسی بُوتھ کی طرف لے گیا۔ اس کا بریف کیس میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ بوتھ کا دروازہ کھول کر میں نے اسے اندر گھسیٹا اور اسے کموڈ پر بٹھا کر اس کا سر فلش کی ٹنکی سے ٹکا دیا۔ اس کا بریف کیس میں نے دیوار سے لگا کر کھڑا دیا اور بوتھ سے باہر آ کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ غسل خانے میں میرا سوا کوئی اور موجود نہ تھا اور میرا یہ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ اسی وقت میں نے لاؤڈ سپیکر پر اناؤنسمنٹ کی آواز سُنی جو مسافروں کو ہوائی جہاز پر سوار ہونے کی ہدایت کر رہی تھی۔ برق رفتاری سے چلتا ہوا میں غسل خانے سے باہر نکل کر مسافر لاؤنج کی طرف بڑھا۔ میں نے کنکھیوں سے اپنے پیچھے دیکھا۔ سیاہ کار میں سوار دونوں آدمی مسافر کاؤنٹر کی طرف جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر مجھے دیکھتے میں تلاشی کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے مڑ کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا اور دھڑکتے دل مگر مضبوط قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اُس قطار میں شامل ہو گیا جو ہوائی جہاز پر جانے والے مسافروں پر مشتمل تھی۔ خطرہ قریب قریب ٹل چکا تھا۔ جب اپنا بورڈنگ کارڈ دکھا کر میں ہوائی جہاز میں داخل ہوا تو پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اب ہر فکر و آلام سے محفوظ ہوں اور بخیریت واپس اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں نے بیلٹ باندھی اور نشست کی پُشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ طویل عرصے کے اعصابی کھچاؤ اور کشیدگی کے بعد سکون ملا تو میں اپنے آپ کو تھکا ماندہ محسوس کرنے لگا۔ میں نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

کسی کے مخاطب کرنے سے میری آنکھ کھلی تو نگاہوں کے سامنے ایئر ہوسٹس کا شاداب اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ وہ

www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے ناشتے کی ٹرے لیے کھڑی تھی۔ میں کچھ بھوک بھی محسوس کر رہا تھا لیکن نیند کی خواہش زیادہ شدید تھی۔ مُسکرا کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں ایک بار پھر گہری نیند کی آغوش میں کھو گیا۔ ایک طویل نیند سے بیدار ہونے کے بعد میں نے کافی کی ایک گرم پیالی طلب کی اور خاموشی سے ہوائی جہاز میں سوار لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ خیالات کا ہجوم میرے ذہن میں کھلبلی مچانے کے لیے تیار تھا مگر میں کچھ عرصے کے لیے خود کو بالکل خالی الذہن رکھنا چاہتا تھا تاکہ اعصابی اور ذہنی سکون اور یکسوئی حاصل کر سکوں۔ میں پردیس میں بیتے ہوئے اِن دنوں کو بالکل فراموش کر کے یکسوئی اور سکون کے ساتھ اپنی روزمرہ کی زندگی کا سلسلہ دوبارہ اسی جگہ سے جوڑنا چاہتا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ فضائی سفر کے دوران میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور میں اخبار مُنہ پر رکھ کر سوتا جاگتا رہا۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان ہونے لگا۔

میرے عزیز شہر کا ایئر پورٹ حسبِ معمول زندگی سے بھرپور اور پُررونق تھا۔ میرے پاس کیونکہ کوئی سامان نہ تھا اس لیے انتظار کی زحمت اُٹھائے بغیر میں باہر نکل گیا جہاں ٹیکسی والوں کا ایک ہجوم میری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ان میں سے ہر ایک مجھے کھینچ کر اپنی ٹیکسی میں بٹھانے کا خواہش تھا۔ بمشکل ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد میں نے ٹیلی فون بُوتھ کا رُخ کیا اور اپنے گھر کا فون نمبر گھمایا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف روزی کی میٹھی اور زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ کئی دن کے بعد یہ آواز کان میں پڑی تو میں نے خوشی کی ایک لہر اپنے جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"ہیلو" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"آپ ہی سے۔ آپ ملنا پسند کریں گی؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" یہ کہکر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ بات میں نے غلط کی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میری آواز پہچان جائے گی۔ جس طرح میں اس کی آواز پہچان گیا تھا، مگر شاید وہ میری آواز نہیں پہچان سکی تھی اور ایک اجنبی کی جانب سے یہ بے تکلفی اسے گوارا نہیں تھی۔

میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار میرے بولنے سے پہلے اس کی آواز سُنائی دی۔ "ہیلو؟"

"ہیلو۔ روزی!" میں نے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" اس کی آواز میں اجنبیت تھی۔

"ذرا پہچانو تو۔" میں نے نرمی اور محبت سے کہا۔

"میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔" اس نے برہمی سے کہا۔

"آپ کون بول رہے ہیں اور آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"بھئی کیا بات ہے روزی، تم مجھے پہچانی نہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"پہیلیاں بُجھوانے کی فرصت نہیں ہے۔" وہ بیزاری سے بولی: "میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے، آخر آپ بتلاتے کیوں نہیں کہ آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"روزی۔ میں یوسف بول رہا ہوں۔"

"یوسف؟" اس کی آواز میں حیرت صاف نمایاں تھی: "کون یوسف؟"

اس بار میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے تنگ آکر جھلّائی ہوئی آواز میں کہا "کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں یوسف ہوں ڈارلنگ۔ تمہارا یوسف۔"

"شٹ اَپ" دوسری طرف سے اس کی غصّے بھری آواز آئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ اس بار مجھے واقعی غصّہ آگیا میں اس کی اس حرکت کا مسبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری آواز نہ پہچان سکی ہو۔ میں بھی اس کی آواز واضح طور پر پہچان چکا تھا۔ تو پھر اس کے اس روّیے کا کیا مطلب تھا۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے پریشان کرنا چاہتی ہو لیکن اتنے دن کی غیر حاضری کے بعد میں واپس آیا تھا اور میرے ساتھ اس کا یہ سلوک میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

میں نے ایک بار پھر ٹیلی فون پر اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ دو بار گھنٹی بجی اور اس کے بعد روزی نے فون اُٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"روزی میری بات سنو۔ یہ کیا مذاق ہے۔ میں ایئر پورٹ سے بول رہا ہوں۔"

"ایئر پورٹ سے" اس کی آواز میں حیرت نمایاں تھی۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

معاً مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے وہ مجھ سے ناراض ہو۔ میں نے اتنے دن میں ایک بار بھی اس سے فون پر رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے رُوٹھ گئی تھی۔

"روزی سنو۔ میں مجبور تھا۔ افسوس ہے کہ میں اِن دنوں میں تم کو فون نہیں کر سکا۔ مگر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا تو تمہاری ناراضی ختم ہو جائے گی۔ اب غصّہ تھوک دو اور کار لے کر ایئر پورٹ آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"سُنیے جناب۔" وہ بولی تو اس کی آواز میں برہمی نمایاں تھی: "بہت ہوچکی۔ اب یہ بے ہودگی ختم کیجیے۔ آخر آپ مجھے تنگ کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کون اور کیا چاہتے ہیں۔"

"میں یوسف ہوں، تمہارا شوہر۔ تم اَب بھی مجھے نہیں پہچانیں؟"

"تم جو کوئی بھی ہو تمہیں شریف عورتوں سے بات کرنا بھی نہیں آتا۔"

فون پر مجھے دُور سے کسی کی آواز سنائی دی۔ "روزی کون ہے فون پر؟"

"نہ جانے کون بدتمیز ہے؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "کہتا ہے میں یوسف بول رہا ہوں۔" پھر وہ فون پر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھو۔ میں نے بہت دیر تک تمہاری بدتمیزی برداشت کی ہے۔ اب اس کے بعد مجھے فون مت کرنا، سمجھے۔" اور فون ایک بار پھر بند ہوگیا۔ میں تعجب اور بے یقینی کے ساتھ ریسیور کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنے دن کے بعد میری آواز سُن کر روزی خوشی سے اُچھل پڑے گی اور فوراً کار لے کر ایئر پورٹ آئے گی، لیکن میرے لیے سب سے زیادہ حیران کُن بات یہ تھی کہ وہ مجھے پہچاننے ہی سے مُنکر تھی۔ وہ مجھے اپنا شوہر، یوسف تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں بالکل صاف اور واضح طور پر اس کی آواز سُن رہا تھا تو پھر وہ میری آواز سُن کر مجھے پہچاننے میں کیوں تامل کر رہی تھی؟ اس کی آواز میں جو اجنبیت بلکہ غیریت اور بے تعلقی تھی وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ مجھے یقیناً کوئی اور شخص سمجھ رہی تھی۔ کوئی ایسا آدمی جو بلاوجہ فون پر اسے پریشان کر رہا تھا۔ یہ حرکت میرے لیے ناقابلِ فہم تھی لیکن اس نے فون پر اب تک میرے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس کے بعد اسے ایک بار پھر فون کرنا لاحاصل تھا۔ میں نے بالآخر فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور تنگ آکر ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہجوم کا رُخ کیا۔

گھر تک ٹیکسی کا سفر تکلیف دہ تھا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا کہ روزی میری آواز کو پہچان نہیں سکی تھی۔ تو کیا یہ بھی مجھے ستانے اور سزا دینے کا ایک طریقہ تھا؟ لیکن ستانے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

گھر کے سامنے ٹیکسی سے اُتر کر میں نے اسے منہ مانگا کرایہ ادا کیا اور خود گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد دروازہ کُھلا اور میرے سامنے روزی کا تر و تازہ اور خوبصورت چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ مگر مجھ پر نظر پڑی تو اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی جگہ اس کے چہرے پر پہلے حیرانی اور پھر برہمی کے آثار نمودار ہوگئے۔

وہ مجھے ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر حیرانی کا تاثر تھا۔ شاید وہ

www.pdfbooksfree.pk

میرے اچانک چلے آنے کی وجہ سے حیران رہ گئی تھی۔

"روزی" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری کیا حرکت ہے؟ تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟ اور تم مجھے لینے ایئر پورٹ پر کیوں نہیں آئیں؟"

اس کا چہرہ ایک نقاب کی طرح بے تاثر ہو گیا۔ "اچھا! تو وہ تم تھے۔" اس نے غصّے بھری آواز میں کہا۔ "جو مجھے بار بار فون کر رہے تھے۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "میرے سوا اور کون ایسا کر سکتا تھا۔ یہ بتاؤ کہ تم میری آواز کیوں نہیں پہچانیں اور میری آواز سن کر بار بار فون کیوں بند کر دیتی تھیں؟"

"دیکھو مسٹر۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "میں تو تمہیں اس وقت بھی نہیں پہچانی ہوں۔ آخر تم ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی مگر اس کا یہ عملی مذاق اب میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ "دیکھو روزی۔" مجھے سچ مچ غصّہ آ گیا۔ "مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب یہ ڈرامہ ختم کرو۔"

"ڈرامہ میں کر رہی ہوں یا تم؟"

"اتنے دنوں بعد گھر لوٹا ہوں اور تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہو۔ ٹھیک ہے اگر میرے اطلاع نہ دینے پر ناراض ہو تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ میں مجبور تھا۔ بجائے اس کے کہ اظہارِ ہمدردی کرو تم اُلٹا ناراض ہو رہی ہو۔" اتنا کہہ کر میں نے گھر میں داخل ہونے کے لیے آگے قدم بڑھایا۔ وہ تن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس نے دروازہ یوں تھام لیا جیسے ابھی میرے منہ پر بند کر دے گی۔ اس کی آنکھیں غصّے اور شرارت سے چمک رہی تھیں۔ شاید میرا فون سننے کے بعد اس نے لباس تبدیل کر کے میرے استقبال کے لیے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس کے لباس سے اس کی مخصوص اور پسندیدہ خوشبو کی مہک آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بال کھول کر شانوں پر بکھرائے ہوئے تھے اور اس وقت میرے سامنے دروازے میں کھڑی ہوئی وہ فریم میں لگی ہوئی کسی خوبصورت تصویر کی طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔

"اگر تم نے ایک بھی قدم آگے بڑھایا تو اچھا نہ ہوگا۔" اس کی آواز میں غصّے کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے تمہاری بدتمیزی کو بہت دیر تک برداشت کیا ہے۔ میرے اخلاق سے تم ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یاد رکھو۔ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گی۔ تم جیسے لوگوں کا علاج کرنا میں بخوبی جانتی ہوں۔"

اس بار میرے کانوں نے کوئی دھوکا نہیں کھایا اور میرے احساس نے بھی مجھے پہلی بار جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی اور اس کے چہرے پر بھی مذاق کا کوئی تاثر موجود نہ تھا۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ واقعی غصّے میں ہے اور جو کچھ کہہ رہی ہے اس کا وہی مطلب ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر میرے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے تعلقی اور ناراضی کا تاثر تھا اور وہ بہت شدید غصّے کے عالم میں مجھے گھور رہی تھی۔ آخر اس کے رویّے کا مطلب کیا تھا اور وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ میں اپنی اُلجھن میں پڑ گیا تھا۔ یکبارگی مجھ پر یہ منکشف ہوا تھا کہ یہ روزی وہ روزی نہیں ہے جسے میں رُخصت ہوتے وقت گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی شخصیت لگ رہی تھی۔ میں نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ روزی ہی تھی، مگر میری روزی اور اس روزی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ روزی کبھی اُونچی آواز سے میرے سامنے بات کرنے کا تصوّر نہیں کر سکتی تھی۔ میرے مزاج کو پہچانتی تھی۔ میری خواہش اور مرضی کے مطابق کام کرنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتی تھی۔ مجھے خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے اپنے آرام کو تج دیا کرتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے میرے ساتھ اس قسم کا مذاق کیا تھا اور اگر یہ مذاق نہیں تھا تو اور بھی زیادہ حیران کن تھا۔ روزی میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گی۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری آواز سنتے ہی وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ جذباتی ہو کر رو پڑے گی۔ شکایت کرے گی کہ میں نے اتنے دن تک اپنی خبر کیوں نہیں دی۔ میری خیریت دریافت کرے گی اور فوراً کار لے کر دوڑی دوڑی ایئر پورٹ آ جائے گی۔ اس سے پہلے میں جب کبھی سفر سے واپس آتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی مختصر سفر کیوں نہ ہو۔ روزی میرے سامنے آنکھیں بچھا دیا کرتی تھی۔ مجھ سے لپٹ کر روتی تھی۔ خوشی کے مارے عجیب عجیب حرکتیں کیا کرتی تھی۔ چند دنوں کی جدائی میں اس پر کیا بیتی ہے اس کا حال بیان کرتی تھی۔ کبھی ہنستی تھی، کبھی روتی تھی۔ اس ایک ایک لمحے کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی تھی جو میں نے اس سے دُور رہ کر گزارا ہوتا تھا۔ اپنی محبت، اپنی وفاؤں کا بے تابانہ اظہار کرتی تھی یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتا تھا کہ میں اسے چھوڑ کر کیوں گیا تھا —— لیکن سامنے جو عورت کھڑی تھی اس کا لہجہ اور رویّہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ وہ بظاہر دیکھنے میں روزی ہی نظر آتی تھی، لیکن وہ میری روزی نہیں ہو سکتی تھی۔

اچانک اس کی غصّہ بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ تیز اور بلند آواز میں کہہ رہی تھی: "اب جاتے ہو یا میں بلاؤں کسی کو۔ معلوم ہوتا ہے دھکّے کھائے بغیر تم نہیں جاؤ گے۔"

"خدایا —— میرے کان یہ کیا سُن رہے ہیں؟! روزی مجھ سے اس انداز میں مخاطب ہو سکتی ہے؟!" میں حیرانی سے ساکت کھڑا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں! میں مسلسل ٹکٹکی لگائے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے بعد اس نے اونچی اور تحقیر آمیز آواز میں مجھ سے کچھ اور بھی کہا لیکن میں اس کو سُن نہیں سکا۔ میرے کانوں نے ان الفاظ کو نہیں سُنا۔ نہ ہی میرے ذہن نے ان کا کوئی نوٹس لیا۔ میں بدستور خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا ایک معمول کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید میرے اس رویّے سے تنگ آ گئی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو بند کرنے کا ارادہ کیا۔

یکایک ایک مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ڈارلنگ۔ تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ باہر کون آیا ہے؟"

روزی نے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ میری نظریں بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گئیں۔ اس سے پہلے کہ روزی کوئی جواب دیتی ایک شخص سامنے آ کر روزی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور اب میں اسے تک رہا تھا۔ میری تمام حسّیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ وہ حیرت جو مجھے روزی کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھ کر ہوئی تھی اب غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک نئی حیران کن حقیقت نے مجھے اپنے دائرے میں لے لیا تھا بلکہ اسے حیرانی کی جگہ SHOCK کی کیفیت کہنا زیادہ درست ہوگا۔ میں بے یقینی اور بے اعتمادی کے عالم میں اپنے سامنے آ کر کھڑے ہونے والے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو مَسل کر بھی دیکھ لیا، لیکن یہ میرا وہم یا تصوّر نہیں تھا۔ سچ مچ کا ایک جیتا جاگتا انسان تھا جو میرے سامنے کھڑا ہُوا تعجب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جہاں تک استعجاب اور حیرت کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر اسے بھی اتنی ہی حیرت ہو رہی ہوگی جتنی مجھے اس کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش کھڑے، حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ اس ناقابلِ یقین حیرت کا سبب یہ تھا کہ جو شخص اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا وہ ہُوبہُو میری تصویر تھا۔ اسے میرا ہمشکل اور ہمزاد کہنا زیادہ درست ہوگا۔ ہم دونوں کے قد و قامت اور چہروں میں ذرا بھی فرق نہیں تھا وہ میری تصویر تھا اور میں اس کا عکس۔

چند لمحے جو بے حد طویل محسوس ہوتے تھے، اسی عالم میں گزر گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اور روزی ہم دونوں کو دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی نظریں نہایت تیزی سے کبھی میری جانب اور کبھی اس شخص کی جانب جا رہی تھیں جواب اس

www.pdfbooksfree.pk

کے برابر کھڑا تھا۔ روزی کے چہرے پر بھی حیرت اور بے یقینی کا وہی تاثر تھا جو ہم دونوں کے چہروں پر تھا۔

وہ شخص جو میرا ہم شکل تھا ایک قدم آگے بڑھ کر روزی کے پہلو میں پہنچا۔ اب میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ میرا ہی ایک پسندیدہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کوٹ، پتلون، قمیص، ٹائی، جیبی رومال یہاں تک کہ جوتا بھی میرا ہی تھا۔ میں اپنی ان اشیاء کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے موزے بھی میرے ہی پہن رکھے ہوں گے۔

وہ روزی کی طرف متوجہ ہوا اور جب بولا تو مجھے یوں لگا جیسے میں خود اپنی ہی آواز سن رہا ہوں: "ڈارلنگ یہ کون ہے؟"

روزی نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی: "یہ وہی آدمی ہے جو ٹیلی فون پر مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اب یہ یہاں بھی آگیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ میرا شوہر ہے۔"

وہ شخص یہ سن کر غصے سے مجھ سے مخاطب ہوا: "اے مسٹر پوچھ سکتا ہوں تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میری بیوی کو پریشان کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

"تمہاری بیوی؟" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ "خبردار۔ یہ لفظ دوبارہ اپنی زبان پر نہ لانا۔ یہ میری بیوی ہے۔ میں اس کا شوہر ہوں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں میرا لباس پہننے کی اجازت کس نے دی؟"

پہلے تو اس کی پیشانی پر غصے کی لکیریں نمودار ہوئیں مگر پھر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس کے ہنسنے کا انداز —— بھی بالکل میری ہی طرح تھا۔ "تم جو کوئی بھی ہو خاصے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مگر میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ عملی مذاق مجھے پسند نہیں آیا۔ میرے ہم شکل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میری بیوی کو پریشان کرو اور میرے منہ لگو۔ شاید تم جانتے نہیں کہ یہ جرم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص یہ پسند نہیں کرے گا کہ تم مذاق میں خود کو اسکی بیوی کا شوہر کہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اب یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ تم جو بدتمیزی اب تک کر چکے ہو میں اسے بھول جاؤں گا، لیکن مجھے اس سے زیادہ آزمائش میں ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ سمجھے؟!"

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ روزی سے مخاطب ہوا: "مجھے افسوس ہے ڈارلنگ کہ تمہیں خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑی مگر تم اس مسخرے کی باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ یہ ہے تو سزا کا مستحق لیکن میں اس بات کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ آؤ۔" اتنا کہہ کر اس نے روزی کے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا اور مڑ کر گھر کے اندر جانے لگا۔

میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں غصے سے بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور میں نے زور سے دھکا دے کر اسے روزی سے علیحدہ کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"خبردار۔" میں نے گرجدار آواز میں کہا: "اگر تم نے میری بیوی کے نزدیک جانے کی کوشش کی تو میں تمہارا خون کر دوں گا۔ بہروپیے۔ تم ہو کون اور میرے گھر میں کیا کر رہے ہو۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ فوراً مجھے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ میرے اس غیر متوقع اقدام سے گھبرا گیا اور میرے دھکیلنے کی وجہ سے زور سے جا کر گیلری کی دیوار سے ٹکرایا۔ روزی بھی اس اچانک حملے سے گھبرا کر سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں اس کے پاس پہنچ گیا: "فکر نہ کرو ڈارلنگ۔ میں اس فراڈ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے گھر میں داخل ہو کر اس نے تمہیں دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کب سے یہاں موجود ہے؟"

روزی مجھے جواب دینے کی بجائے سہم کر مجھ سے دور ہو گئی وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی: "مجھ سے نہ ڈرو روزی۔ میں یوسف ہوں۔ تمہارا یوسف۔ فکر نہ کرو۔ اب میں واپس آگیا ہوں۔ اس بہروپیے کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ یہ زندگی بھر

یاد رکھے گا۔"

اتنا کہہ کر میں غضب ناک ہو کر اپنے ہم شکل کی طرف بڑھا اور میں نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا: "بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ فوراً اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو ورنہ بہت برا ہوگا۔"

اس نے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں کے اندر ڈال کر زور سے جھٹکا دیا اور میری گرفت سے آزاد ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ایک زوردار گھونسہ میرے چہرے سے ٹکرایا اور میں چکرا گیا۔ وہ صرف شکل و صورت اور قد و قامت ہی میں میری طرح نہیں تھا۔ قوت اور پھرتی میں بھی وہ میرا ہمسر معلوم ہوتا تھا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے بھوکے درندوں کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ میں نے قدم آگے بڑھایا مگر اچانک سیاہ بجلی سی کوندی اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ دراصل میرا کتا ٹائیگر تھا جو بلا آواز نکالے اچانک بلائے ناگہانی کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ میں اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ پوری قوت سے میرے جسم سے ٹکرایا اور میں لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا ورنہ مجھے کافی چوٹ آتی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کھڑا ہوتا ٹائیگر غراتا ہوا خونخوار انداز میں دانت نکالے میری طرف بڑھا اور میرے سر کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ وہ حد سے زیادہ غضبناک اور برہم تھا اور دانت نکالے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے مجھے پھاڑ کھائے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہی گھر میں میرا اپنا پالتو کتا ٹائیگر مجھ پر حملہ آور ہو جائے گا۔

"ٹائیگر"۔ میں نے اسے پکارا۔ "ٹائیگر۔ یہ میں ہوں۔ تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر ٹائیگر کی برہمی اور وحشت میں کمی نہیں آئی۔ وہ بدستور میرے سرہانے کھڑا خوفناک انداز میں غراتے ہوئے مجھے گھورتا رہا۔ اس کی سانسیں مجھے اپنی —— گردن پر محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک سدھایا ہوا کتا ہے۔ اگر میں نے ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ میرا نرخرہ چبا ڈالے گا۔ دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اس قسم کی تربیت میں نے بذات خود ٹائیگر کو دلائی تھی، لیکن یہ بات میری فہم سے بالاتر تھی کہ ٹائیگر جو میرا ذاتی پالتو کتا تھا مجھے پہچان کیوں نہیں رہا تھا۔ کتا ایک ایسا جانور ہے جو شکلوں اور ظاہری حلیوں سے دھوکا نہیں کھاتا۔ وہ خوشبو پہچانتا ہے اور اپنے مالک کی خوشبو تو وہ ہزاروں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا ہے۔ لیکن میرا اپنا ٹائیگر بھی دھوکا کھا گیا تھا اور میرے ہم شکل بہروپیے کے اشارے پر دانت نکالے مجھے شکار کرنے کے لیے تیار تھا۔

میرا ہم شکل پہلے تو غصے اور نفرت سے مجھے گھورتا رہا مگر پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی: "اب بولو۔ کیا اب بھی تمہیں اس بات پر شک ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ یہ بے زبان کتا تک مجھ سے وفادار ہے اور مجھے پہچانتا ہے۔ تم انسانوں کو تو بہکا سکتے ہو مگر کتے کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ کہو تو ٹائیگر کو ایک اشارہ کروں۔ وہ ایک منٹ میں تمہاری تکا بوٹی کر دے گا!"

ٹائیگر کے بدلے ہوئے رویے اور خونخوار انداز کے پیش نظر اس کی بات بالکل درست تھی۔ موت اس لمحے میری شہ رگ کے بالکل نزدیک تھی۔ میں بے حس و حرکت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی جنبش کی تو ٹائیگر بھوکے شیر کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔ وہ بے مروت اور بے وقوف کتا نہ جانے کیوں دھوکہ کھا گیا تھا اور مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ بدستور میرے سرہانے کھڑا ہوا انتہائی خونخوار طریقے پر غرا رہا تھا۔

ایک مردانہ آواز نے میری نگاہوں کو ٹائیگر کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف متوجہ کر دیا: "بھئی تم لوگوں نے اتنی دیر کیوں لگا دی۔ یہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟"

اور میرے سامنے میرا دوست شوکت نمودار ہو گیا۔ وہ مکان کے اندرونی حصے سے نکل کر آیا تھا اور اس وقت ڈنر سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ روزی اور میرا ہم شکل بھی کہیں باہر جانے کے لیے ڈریس اپ ہو کر

www.pdfbooksfree.pk

تیار نظر آتے تھے۔

"ارے"، شوکت کے مُنہ سے نکلا: "یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کون ہے؟" پھر وہ چند قدم آگے بڑھ کر میرے نزدیک آگیا اور جھک کر مجھے دیکھنے لگا۔ یکایک اس کے چہرے پر حیرت اور پھر شناسائی کے آثار نمودار ہوئے۔ میں خوشی سے بے قابو ہو کر ٹائیگر کی موجودگی کو بھی فراموش کر بیٹھا اور بے اختیار چلّایا: "شوکت۔ یہ میں ہوں۔ تمہارا دوست یوسف۔ اچھا ہُوا تم آ گئے۔ تم یقیناً مجھے پہچان لو گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دھوکے باز نے تمہیں بھی فریب دے دیا ہے"۔

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ٹائیگر کی خوفناک غرّاہٹ نے مجھے پھر ساکت کر دیا، لیکن میری نگاہیں شوکت پر جمی ہوئی تھیں جو بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جگری اور پرانا دوست تھا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی بہروپیے سے دھوکہ کھاتا۔ خاص طور پر اس حالت میں جبکہ میں بھی بذاتِ خود اس کے سامنے موجود تھا۔

"او مائی گاڈ" شوکت کے مُنہ سے نکلا: "ہُو بہُو تمہاری شکل!" پھر وہ میرے ہمشکل سے مخاطب ہوا: "یہ کون ہے؟ کیا تم اسے جانتے ہو یوسف؟"

مگر اس کے بولنے سے پہلے میں چیخ اُٹھا: "شوکت۔ جسے تم یوسف سمجھ رہے ہو وہ فراڈ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی ہے۔ تمہارا دوست میں ہوں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم ذرا ٹائیگر کو میرے پاس سے ہٹاؤ"۔

میرا ہمشکل بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا: "تم جو کوئی بھی ہو آدمی دلچسپ ہو۔ ارے بھئی اگر تم یوسف ہو تو پھر ٹائیگر کو بھی خود ہی سنبھالو۔ شوکت کی مدد کیوں حاصل کرتے ہو۔ ٹائیگر بھی تو تمہارا ہی کُتا ہے"۔

میری توجہ ایک بار پھر ٹائیگر کی طرف مبذول ہو گئی جو ابھی تک میری خوشبو نہیں پہچان سکا تھا اور دُشمنی کے انداز میں مجھ پر کسی بھی لمحہ حملہ آور ہونے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ غصّے سے اس کی کمر کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور اس وقت وہ ایک انتہائی بھیانک اور خونخوار درندے کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ٹائیگر کا یہ روپ میرے لیے قطعی خلافِ توقع اور حیرت انگیز تھا مگر اس نے مجھے بالکل بے بس اور بے عمل بنا کر رکھ دیا تھا۔

شوکت جو جھک کر اور گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر مجھے دیکھ رہا تھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک بار روزی اور میرے ہمشکل کی جانب دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے اب وہ روزی کو بھی میرے بارے میں بتا دے گا اور میرے حق میں گواہی دے گا۔ لیکن میری توقع نقش برآب ثابت ہوئی۔ شوکت نہایت دوستانہ انداز میں میرے ہمشکل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "یار کچھ بھی ہو یہ ہے بالکل تمہارا ہمشکل۔ ہُو بہُو تمہاری تصویر ہے۔ ایک کو چھپاؤ۔ دوسرے کو نکالو۔ کوئی ایک منٹ کے لیے بھی نہیں شناخت کر سکتا۔ اچھا اب ذرا ٹائیگر کو اس کے پاس سے ہٹاؤ۔ ذرا اس سے دو دو باتیں ہو جائیں"۔

میرا ہمشکل فاتحانہ انداز میں ہنسا اور اُس نے چٹکی بجا کر ٹائیگر کو پکارا: "ٹائیگر کم ہیئر"۔

یہ بالکل وہی انداز تھا جس طرح میں ٹائیگر کو بُلایا کرتا تھا۔ اس کی آواز سُنتے ہی ٹائیگر نے میرے پاس سے ہٹنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ وہ لپک کر میرے ہمشکل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور دُم ہلانے لگا۔ اس نے ٹائیگر کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تو ٹائیگر نے اسے چاٹنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی محبت اور وفاداری کا کھُلا مظاہرہ تھا۔ میں ٹائیگر کی اس بے رُخی پر حیران رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کُتے کو اپنے مالک سے بے وفائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

شوکت میرے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: "اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے"۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر فرش سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شوکت کے ہاتھ کے لمس نے میرے اندر ایک نیا یقین اور

ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ شاید اس قسم کے جذبات اس کے دل میں بھی پیدا ہوئے ہوں گے اور مجھے چھُونے کے بعد اس کے لیے مجھے پہچان لینا یقیناً مشکل نہ ہو گا۔ یہ سوچ کر میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے کہا: "شوکت تم اپنے وعدے کے مطابق وہاں کیوں نہیں پہنچے تھے؟ میں نے تمہارا اتنا انتظار کیا مگر نہ تمہارا پیغام ملا اور نہ ہی تم خود آئے۔ کیا بتاؤں میں وہاں کن مشکلات میں پھنس گیا تھا۔ میرا سامان چوری ہو گیا تھا جس میں ایگریمنٹ کا مسوّدہ بھی موجود تھا۔ تمہیں کیا بتاؤں کہ کن حادثات سے بچ کر یہاں آیا ہوں تو اس بہروپیے کو اپنے گھر میں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا ہے"۔

شوکت خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جب میں خاموش ہُوا تو میں نے اس کے چہرے پر اُلجھن اور پریشانی کے تاثرات دیکھے۔ وہ میرے ہمشکل سے مخاطب ہو کر بولا: "یہ آدمی کیا کہہ رہا ہے؟" پھر وہ میرے نزدیک آیا اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھنے لگا: "بھائی۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ تم کسی پاگل خانے سے بھاگ کر تو نہیں آئے ہو؟"

"او شوکت" میں نے اپنا سر تھام لیا: "خدا کے لیے تم تو ایسی باتیں مت کرو۔ میں پہلے ہی کافی پریشانیاں اُٹھا چکا ہوں۔ کم از کم تم تو ایسا نہ کہو دوست۔ جانتے ہو ہوٹل سے میرا سامان اور بریف کیس چوری ہو گیا۔ اسی بریف کیس میں اس ایگریمنٹ کا ڈرافٹ بھی تھا جو ہمیں ملک برکت سے سائن کرانا تھا۔ پھر مجھے ایک پُر اسرار شخص کے آدمیوں نے اغوا کر لیا۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں سے نجات ملی تو میڈم کے جال میں پھنس گیا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ وہ ایک دن گھر پر نہیں تھی تو اس کی سیکرٹری کی وجہ سے میں اس کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ورنہ ابھی تک اسی کی قید میں ہوتا اور خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا"۔

میں شوکت سے مخاطب تھا لیکن اس دوران میں میری نگاہیں روزی کے چہرے سے ایک پل کے لیے بھی نہیں ہٹی تھیں۔ اس کے چہرے پر اُلجھن، حیرانی اور بیزاری کے آثار تھے۔ وہ کسی کشمکش کا شکار نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ غالباً اس کو میری باتوں پر یقین آ رہا تھا۔ میرا ہمشکل روزی کے نزدیک ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ بے پروائی اور بے نیازی سے میری باتیں سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایک تمسخرانہ تاثر تھا جیسے وہ میری باتوں کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ میری بات ختم ہوئی تو شوکت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا: "بھائی۔ تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نجانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ سب چھوڑو۔ اب مجھے سچ سچ اور صاف صاف بتا دو کہ آخر تم ہو کون؟ اس گھر کا پتہ تمہیں کس نے بتایا اور تم نے ہم سب لوگوں کے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے اور کیونکر حاصل کیں؟"

"شوکت۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تمہارا دوست یوسف ہوں۔ میں آخر تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟"

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم یوسف ہو اور اس گھر کے مالک ہو؟" اس نے پوچھا۔

"دعویٰ نہیں یہ حقیقت ہے"۔

"یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے"۔

"تو پھر یہ کُتا ٹائیگر بھی تمہارا ہی کُتا ہے۔ مگر یہ تمہیں پہچانتا کیوں نہیں؟ کُتے تو کسی طرح اپنے مالک کو نہیں بھُولتے۔ اس معاملے میں ہم انسان دھوکہ کھا سکتے ہیں مگر کُتے کسی طرح دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ مگر تمہارا کُتا تمہارا دشمن ہو گیا"۔

"یہی تو میں حیران ہوں"، میں نے کہا: "آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

"سبب یہ ہے کہ تم جھُوٹے ہو۔ فراڈ ہو۔ دھوکے باز ہو"، میرا ہمشکل بالآخر خاموش نہ رہ سکا اور بول پڑا: "اگر تمہاری

www.pdfbooksfree.pk

بات میں صداقت ہوتی تو کم از کم یہ بے زبان تم پر حملہ آور نہ ہوتا۔"

"ٹھہرو۔ خواہ مخواہ باتوں اور بحث میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" شوکت نے درمیان میں مداخلت کی۔ "مجھے ان صاحب سے چند باتیں کر لینے دو۔" اتنا کہہ کر وہ میرے نزدیک آ گیا اور بولا۔ "دیکھو بھائی۔ تم جو کوئی بھی ہو یہ بتاؤ کہ سیدھی طرح یہاں سے جاؤ گے یا پولیس کو بلانا پڑے گا۔"

"ضرور بلاؤ پولیس کو۔" میں نے تنگ آ کر کہا۔ یہ تجویز میرے مطلب کی تھی اور اس طرح میرا مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہو سکتا تھا۔ "میں تو خود یہی چاہتا ہوں کہ تم پولیس کو بلاؤ تاکہ اصلیت کا پتہ چل جائے۔"

"کیوں یوسف۔ کیا خیال ہے؟" شوکت میرے ہم شکل سے مخاطب ہوا۔ "ارے یار چھوڑو۔ کس فضول چکر میں پڑ گئے ہو۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "اس مسخرے کی باتوں میں آ گئے ہو۔ بلاوجہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے پولیس کو بلانے کی۔"

"یہ ٹھیک کہتے ہیں۔" روزی بولی۔ "خواہ مخواہ ساری دنیا کو تماشہ دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر غصے سے بولی۔ "بھئی آخر تم ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تمہیں کس نے ہمارے پیچھے لگایا ہے؟"

میں دو قدم اس کی طرف بڑھا تو وہ بے اختیار پیچھے سمٹ گئی۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ میری شریکِ حیات بھی مجھے پہچاننے سے قاصر تھی، حالانکہ مجھے روزی کے بارے میں یقین تھا کہ وہ تو کم از کم مجھے پہچاننے میں تامل نہیں کرے گی۔

"روزی!" میں نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے پکارا۔ "تم بھی مجھے نہیں پہچان سکیں۔ تمہیں تو دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ تم یہ برداشت کرو گی کہ میرے دھوکے میں کوئی غیر اور اجنبی میری جگہ لے لے۔ تم یقین کیوں نہیں کرتیں میرا؟ آخر میں کیونکر تمہیں بتاؤں کہ میں ہی تمہارا یوسف ہوں۔ ذرا مجھے غور سے دیکھو۔ میرے نزدیک آؤ۔ میری آنکھوں میں جھانک کر میرے دل کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کرو۔ تمہیں میرے پاس سے اپنے شوہر کی مانوس خوشبو آئے گی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم میرے لیے بے تاب ہو گی۔ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ مجھ سے اتنی دیر غیر حاضری کا سبب دریافت کرو گی اور میں تمہیں ان مشکلات کے بارے میں بتاؤں گا جو مجھے وہاں پیش آ چکی ہیں اور جن سے بمشکل نجات حاصل کر کے میں تمہارے پاس آیا ہوں مگر تم ایک فریبی کی باتوں میں آ کر سب کچھ بھول گئیں۔ کیا تمہارا دل گواہی نہیں دے رہا کہ میں ہی تمہارا شوہر ہوں۔ تمہارا یوسف ہوں....." میں جذبات کی رو میں بہہ کر بے اختیار روزی کی طرف بڑھا۔ یکایک میرا ہم شکل آگے بڑھ کر میرے اور روزی کے درمیان حائل ہو گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"خبردار۔ اگر اس کے آگے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ میں تمہاری بدتمیزیاں بہت دیر سے برداشت کر رہا ہوں، لیکن اب میں تمہیں اپنی بیوی سے مخاطب ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔"

اس کو مجھ پر برستے ہوئے دیکھا تو ٹائیگر بھی جو اس کے نزدیک کھڑا ہوا تھا غصے میں غرانے لگا۔

روزی بے اختیار میرے ہم شکل کے کندھے سے سر لگا کر کھڑی ہو گئی اور روہانسی آواز میں بولی۔ "ڈارلنگ۔ خدا کے لیے اس آدمی کا کوئی علاج کرو۔ یہ تو میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے، اگر یہ کچھ دیر اور یہاں موجود رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ اس کو کہو کہ یہاں سے چلا جائے۔ فوراً اسی وقت میری نگاہوں سے دور ہو جائے۔"

"سن لیا تم نے۔" میرا ہم شکل میری طرف گھورتا ہوا چلایا۔ "اب تم ایک لمحہ بھی اس گھر میں نہیں رہ سکتے۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں ٹائیگر کو زیادہ دیر تک نہیں روک سکوں گا۔ وہ میرے ایک اشارے کا منتظر ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹائیگر کی طرف دیکھا اور میری طرف بڑھا۔ اس کا انداز اتنا جارحانہ اور خطرناک تھا کہ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اسے چمکارنے کی کوشش کی۔ "ٹائیگر، ٹائیگر۔ مجھے پہچانو ٹائیگر۔ میں تمہارا

مالک ہوں۔"

جواب میں وہ دانت نکال کر میری طرف لپکا۔ اس وقت وہ ایک خونخوار درندہ بن گیا تھا۔ وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اٹھا دیا اور میرے کوٹ کی آستین اس کے منہ میں آ گئی۔ اس نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور میں نے بمشکل اپنے آپ کو زمین پر گرنے سے بچایا مگر میں لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ ٹائیگر دوبارہ میری طرف لپکا اور اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس بار میں نے قریبی میز پر رکھا ہوا ایک پیتل کا گلدان اٹھا کر اپنا دفاع کیا۔ گلدان سے اس کا منہ ٹکرایا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوبارہ غراتا اور بگڑتا ہوا مجھ پر اچھلا۔ میں نے اس بار پھر گلدان کی مدد سے اپنا دفاع کیا لیکن اس کے دانتوں کی نوکیں میرے کوٹ کی آستین میں پیوست ہو گئیں۔ میں جانتا تھا کہ ٹائیگر ایک انتہائی طاقتور، غصیل اور خونخوار جانور ہے اور میں نہتا زیادہ دیر تک اس سے مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر مجھ پر ٹوٹ پڑتا روزی کی تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ٹائیگر کو پکار رہی تھی۔ "ٹائیگر، رک جاؤ ٹائیگر۔" مگر ٹائیگر نے روزی کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی کمر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ دانت خوفناک انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی گلدان کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔ میری نگاہیں ٹائیگر پر جمی ہوئی تھیں لیکن موقعہ پا کر میں نے کنکھیوں سے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے کسی مناسب ہتھیار کی جستجو میں تھا۔

"پلیز" روزی نے میرے ہم شکل کو ملتجیانہ انداز میں مخاطب کیا۔ "یوسف! یہ کیا تماشہ ہے۔ بند کرو یہ سب۔"

میرے ہم شکل نے ٹائیگر کو آواز دی۔ "ٹائیگر!" اور یوں محسوس ہوا جیسے ایک دم ٹائیگر کو بریک لگ گئے ہوں۔ وہ مجھ پر اچھل کر حملہ کے لیے اپنے جسم کو تول رہا تھا مگر اس کی آواز سنتے ہی ایک دم اسی جگہ رک گیا۔

"ادھر آؤ۔ میرے پاس" اس ہدایت پر ٹائیگر پلٹ کر میرے ہم شکل کے نزدیک چلا گیا اور دم ہلانے لگا لیکن اس کے باوجود وہ میری طرف دیکھ کر غرانے سے باز نہیں آیا۔

میں ٹائیگر کی اس حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تبدیلی کو دیکھ کر خود اپنی آنکھوں اور کانوں پر بھروسہ کرنے سے قاصر تھا۔ میرا اپنا پالتو اور وفادار کتا میری آنکھوں کے سامنے ایک غیر اور اجنبی شخص کے اشارے پر خود مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا!! اس بہروپیے نے نہ صرف انسانوں کو بلکہ کتے کو بھی اپنی سازش کے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ ان سب کی نگاہ میں معتبر بن بیٹھا تھا اور مجھے خود اپنے ہی گھر میں ان سب نے ایک اجنبی اور ناقابلِ برداشت شخصیت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

میرا ہم شکل چند لمحے مجھے غصے اور نفرت سے گھورتا رہا۔ پھر وہ ایک قدم آگے بڑھا تو ٹائیگر بھی اس کا ہم قدم تھا۔

"اگر تم فوراً اس گھر سے باہر نہیں نکلے تو پھر میں اس بار ٹائیگر کو نہیں روکوں گا اور اپنے انجام کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔"

میں نے ان انتہائی ہیجان خیز لمحات میں بھی ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ ٹائیگر میرے لیے کوئی بڑی پرابلم نہیں تھا۔ میں نے اپنی فوجی زندگی میں اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمنوں کا سامنا کیا تھا۔ کمانڈو کے طور پر مجھے خونخوار درندوں سے مقابلہ کرنے کی تربیت بھی دی گئی تھی۔ میں ایک ہی وار میں ٹائیگر کی گردن توڑ سکتا تھا لیکن میں اپنے چہیتے اور پسندیدہ کتے کے ساتھ یہ سلوک کرنے کے لیے کسی طور بھی تیار نہیں تھا۔ نہ جانے اس پر کیا جادو کیا گیا تھا کہ وہ بے زبان اور وفاشعار بھی میرے ہم شکل کے اشاروں پر ناچ رہا تھا لیکن میں خود اپنے ہاتھوں سے اس معصوم اور بے گناہ جانور کو موت کی سزا دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے علاوہ روزی اور شوکت بھی میرے حریف کے

www.pdfbooksfree.pk

سحر کا شکار رہتے۔ اگر میں ٹائیگر کو جان سے مار بھی دیتا پھر بھی میں اُن لوگوں کو اپنی اصلیت کا یقین نہیں دلا سکتا تھا۔ وہ دونوں میرے ہم شکل کے جادو میں گرفتار ہو چکے تھے۔ انھیں اس سحر سے باہر نکالنے کے لیے کوئی اور ترکیب استعمال کرنا ضروری تھی۔ چنانچہ میں نے فی الفور یہ فیصلہ کیا کہ گھر سے باہر چلا جاؤں۔

روزی اور شوکت سے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ اس لیے میں نے ایک غضب آلود نگاہ اپنے ہمشکل پر ڈالی اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے پیچھے نقلی یوسف کے ہنسنے اور ٹائیگر کے غرّانے کی آوازیں سُنیں لیکن پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کم بخت کے ہنسنے کا انداز بھی ہُوبہُو میری طرح تھا۔ وہ ہر لحاظ سے میرا ڈبلی کیٹ تھا۔ ہم دونوں میں بظاہر کوئی امتیاز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اگر روزی اور شوکت اس کے فریب میں آ گئے تھے تو یہ کوئی حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہیں تھی لیکن ٹائیگر کا دھوکا کھا جانا واقعی ایک اَن ہونی بات تھی۔

گھر سے باہر نکل کر میں نے اپنے کوٹ کی آستین کو دیکھا۔ وہ شکستہ ہو گئی تھی لیکن اس کی وجہ سے میرا ہاتھ زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ باہر ہوا میں خُنکی تھی جس نے مجھے فرحت پہنچائی۔ گیٹ سے باہر نکل کر میں کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے کوئی نصب العین، کوئی منزل نہیں تھی۔ میرا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ میں کہاں جاؤں! کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی میرے لیے یہ تصور انتہائی تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا کہ روزی، میری بیوی ایک قطعاً غیر شخص کو اپنا شریکِ حیات سمجھ رہی تھی۔ میرا گھر، میرا کاروبار، میرا سب کچھ ایک اَن جان اجنبی شخص کے قبضے میں تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ میری بیوی کا قرب بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ میری غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ میں روزی کو ایک لمحے کے لیے بھی اس فریب کا شکار رہنے دوں لیکن وہ خود بھی میری بات پر کان دھرنے اور میرا یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس فریب کار نے ایسی چال چلی تھی کہ سبھی کو اپنا حامی بنا لیا تھا۔ میں نے سوچا۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ خود میری آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا آ گیا تھا۔ مجھے اپنی دُنیا تاریک نظر آ رہی تھی۔ کبھی مجھے اس قسم کی صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا، یہ تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

یکایک پولیس کار کے سائرن کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ پولیس کی گشت کرنے والی گاڑی روشنیاں چمکاتی اور سائرن بجاتی ہوئی سامنے سے آ رہی تھی۔ میں بے اختیار بڑھ کر سڑک کے درمیان میں کھڑا ہو گیا اور میں نے کار کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ کار میرے نزدیک آ کر رُک گئی۔ سائرن کی آواز بند ہو گئی لیکن کار کی چھت پر نصب سُرخ روشنی بدستور گول دائرے کی شکل میں چکر کھاتی رہی۔

"کیا بات ہے۔" گاڑی میں سے ایک پولیس والے نے سَر باہر نکالا۔

"پلیز میری مدد کیجیے۔" میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکا۔

"کیا بات ہے؟ چوری ہو گئی یا کسی نے تمھیں لُوٹ لیا؟"

"مجھے ایک شخص نے لُوٹ لیا ہے۔ میرا سب کچھ چھین لیا ہے اور وہ اس وقت بھی میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔"

پولیس والا اَب گاڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ ایک قد آور اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کی کمر میں پستول لٹکا ہوا تھا۔ "کہاں ہے تمھارا گھر؟ یہ واقعہ کب ہوا، کیسے ہوا؟" وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میرا معقول لباس اور معزز شخصیت دیکھ کر اس کے لہجے میں نرمی پیدا ہو گئی: "آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"وہاں" میں نے اپنے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

اتنی دیر میں دوسرا پولیس والا بھی، جو کار چلا رہا تھا گاڑی سے باہر نکل کر، ہمارے پاس آ گیا۔ ان دونوں نے نگاہیں اُٹھا کر میرے گھر کی طرف دیکھا جس کی بیرونی روشنیاں اب روشن ہو چکی تھیں۔

"ابھی تو زیادہ رات بھی نہیں ہوئی ہے۔" پہلا پولیس مین حیرت سے بولا: "آپ کے گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟ میرا مطلب ہے کوئی نوکر یا چوکیدار وغیرہ۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ میرے ساتھ بہت عجیب و غریب واردات ہوئی ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے کیوں کر بتاؤں۔

"پھر بھی۔" دوسرا اپنی مُونچھوں پر اُنگلی پھیرتے ہوئے بولا: "کچھ تو بتائیں جناب۔ آپ کو رپورٹ درج کرانے کے لیے تھانے لے چلیں یا آپ پہلے موقعہ دکھائیں گے۔"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پہلے آپ میری بات سُن لیں اور اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"سُنائیں جناب۔ ہم تو آپ کے خادم ہیں۔" وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ "مگر ذرا جلدی جلدی۔ ہمیں گشت پر بھی جانا ہے۔"

"دیکھیے۔" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں سے آغاز کروں۔ "بات یہ ہے کہ میں ایک کام کے لیے شہر سے باہر گیا تھا۔ اب آج واپس آیا ہوں تو میرے گھر پر کسی اور شخص نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"اچھا۔" مُونچھوں والے نے اپنی مُونچھوں کو تاؤ دیا۔ "وہ اکیلا ہے یا اس کے اور بھی ساتھی ہیں۔"

"آپ سمجھے نہیں۔" میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا: "دراصل گھر میں میری بیوی موجود تھی اور وہ اب بھی گھر ہی میں ہے۔"

"میں سمجھ گیا" وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا: "اس نے آپ کی بیوی کو یرغمال بنا لیا ہے۔ کیا وہ مسلّح ہے؟"

"اُس نے زبردستی نہیں کی۔ دھوکے سے کام لیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بات یہ ہے کہ وہ شخص بالکل میرا ہم شکل ہے۔ جب میں باہر گیا تو وہ میرے گھر میں آ گیا اور میری بیوی یہ سمجھ رہی ہے کہ وہی اس کا اصلی شوہر ہے۔ میرا ایک پُرانا دوست بھی اس وقت گھر کے اندر موجود ہے مگر وہ بھی اس کے دھوکے میں آ گیا ہے۔"

دونوں پولیس والے بڑے غور سے میری بات سُنتے رہے۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں انھیں کوئی فرضی داستان سُنا رہا ہوں۔ بے اعتباری ان کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی اور بہت ممکن ہے کہ وہ میری ذہنی حالت پر بھی شُبہ کر رہے ہوں۔

"بڑی عجیب کہانی سُنائی ہے جناب آپ نے" مُونچھوں والے نے دوسرے پولیس والے کی طرف دیکھ کر کہا: "مگر ایسا ہو تو نہیں سکتا جناب کہ آپ کی بیوی بھی آپ کو نہ پہچانے۔ کوئی کتنا ہی ہم شکل ہو بندے کی ذات تو چھُپی نہیں رہ سکتی۔ اور وہ بھی بیوی سے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید شکوک کا اظہار کرتے میں نے انھیں تجویز پیش کی "دیکھیے۔ وہ سامنے ہی تو میرا گھر ہے۔ شاید میں زبانی آپ کو ساری بات نہ سمجھا سکوں۔ آپ میرے ساتھ چلیے اور اس شخص کو فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر لیجیے۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں